بانی
سہام مرزا

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

مدیراعلیٰ ــــ منزہ سہام
گروپ ایڈیٹر ــــ ناصر رضا
ایڈورٹائزنگ منیجر ــــ زین شمسی
انکم ٹیکس ایڈوائزر ــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

اگست 2017
جلد:45☆شمارہ:08
قیمت:60روپے

خط وکتابت کا پتا
88-C II۔فرسٹ فلور۔خیابانِ
جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7کراچی
فون نمبر:35893122 - 021-35893121
ای میل: pearlpublications@hotmail.com
منیجر سرکولیشن: آفتاب عالم......رابطہ:03343193174

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

ناولٹ

منی ناول

مکمل ناول

افسانے

بازگشت

دوشیزہ میگزین

طویل افسانہ

زرِسالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

زندگی بار بار موقعہ نہیں دیتی

پیلے اسکول میں ٹاٹھ پر بیٹھ کر پڑھنے والا پاکستانی...... گھسی پٹی یونیفارم پہن کر سرکاری بسوں میں لٹک کر اسکول جانے والا پاکستانی...... وظیفے پر کالج میں تعلیم حاصل کرنے والا پاکستانی...... مہینے کے آخر میں چٹنی اور روٹی کھانے والا پاکستانی...... لنڈا سے گرم کپڑے خریدنے والا پاکستانی...... ٹھیلوں سے پرانی کتابیں خریدنے والا پاکستانی...... کہاں ہے یہ پاکستانی؟ کیوں نظر نہیں آتا ایسا پاکستانی ہمارا حکمران کیوں نہیں بن سکتا...... جس کے بینک اکاؤنٹ میں ہر ماہ صرف اس کی حلال کمائی آئے...... جس کو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے قرض لینا پڑے...... اور ایک چھوٹا سا گھر بنانے کے لیے بیوی کا زیور اور زندگی بھر کی جمع پونجی خرچ کرنی پڑے۔ کہاں ہے یہ پاکستانی؟ یہ کون لوگ ہیں جو ہم پر حکومت کرتے ہیں اربوں کھربوں کے مالک یہ لوگ تو کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں۔ یہ ہم میں سے نہیں تو ہمارے درمیان کیوں ہیں...... ہمارے حکمران کیوں ہیں؟ ہم اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کیوں نہیں کرتے ہم کیسے پاکستانی ہیں جو اپنی قدر نہیں کرتے' اپنی اولاد کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں نہیں دیتے ہم سب کچھ دیکھتے ہیں برادری' زبان' مسلک' فرقہ اگر نہیں دیکھتے تو ووٹ لینے والے کا کردار نہیں دیکھتے...... ہم ایسے کیوں ہیں؟ تبدیلی کی ہوا چل پڑی ہے اب یہ ہم پاکستانیوں کا فرض ہے کہ بچھڑے ہوئے پاکستانی کو تلاش کر کے لائیں۔ اس گمشدہ پاکستانی کو ووٹ دیں جو ہمیں دنیا میں ہماری شناخت دے سکے جو ہمیں با اعتماد اور باعزت بنا سکے کہ زندگی بار بار موقعہ نہیں دیتی۔

منزہ سہام

غلام جو سردار بنے

حضرت بلال بن رباح حبشیؓ

أم ایمان

حضرت بلالؓ کے والد رباح نسلاً حبشی تھے اور مکہ میں خاندان بنوجمح کے غلام تھے۔ اسی غلامی کی حالت میں بعثت نبوی ﷺ سے 28 سال پہلے رباح اوران کی اہلیہ حمامہ کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا۔

کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ غلام خاندان میں غلامی کی حالت میں پیدا ہونے والے اس بچے کا مستقبل کیسا تابناک ہے اور آنے والے زمانوں میں کتنے ہی بادشاہ اس کی غلامی کو رشک سے دیکھیں گے۔ ننھے بلال نے جب ہوش سنبھالا تو عرب کفر و شرک کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ کا آقا امیہ بن خلف بھی کٹر کافر تھا۔ غلامی کی حالت میں حضرت بلال نے اٹھائیس سال گزار دیے۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے راز داری کے ساتھ حق کی تبلیغ کے کام کا آغاز کردیا تھا۔ حضرت بلالؓ نے جب توحید کا پیغام سنا تو بلا تامل رسول اللہ ﷺ کے حضور نذرانہ دل پیش کردیا۔

حضرت بلال طبیعتاً نیک، سادہ اور پاکباز تھے۔ ارباب سیر کا بیان ہے کہ وہ ان سات سعید ہستیوں میں شامل تھے جنہوں نے سب سے پہلے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ تھاما۔ چنانچہ ''السابقون الاولون'' کی عظیم الشان جماعت میں آپ ﷺ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

قبول اسلام کے بعد یہ خبر امیہ بن خلف سے زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی چنانچہ اس کو جب آپ کے قبول اسلام کا علم ہوا تو غصہ کے مارے بہت طیش میں آیا۔ حضرت بلال کو تصدیق کے لیے بلایا۔ حضرت بلال نے بے دھڑک جواب دیا کہ ''ہاں میں محمد ﷺ کے رب کی پرستش کرتا ہوں۔''

امیہ بن خلف نے غصہ میں آگ بگولہ ہو کر کہا کہ ''اس طرح تو تو مقدس لات ومنات کا دشمن بن گیا ہے اور یہ میں ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تو فوراً اِس سے باز آ جا۔''

حضرت بلال تو مئے عشق سے سرشار تھے، بے

ساختہ بولے۔ ''میرا جسم تمہارا غلام ہے لیکن روح نہیں...... میں اپنا دل خدا کو پیش کر چکا ہوں۔ اب تمہارے اپنے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش میں ہرگز نہیں کرسکتا۔''

ایک غلام کے منہ سے ایسا بے دھڑک انکار سن کر امیہ بن خلف غصہ میں دیوانہ ہوگیا۔

''اچھا تو پھر تُو دیکھ' اپنے انکار اور میرے خداؤں کی بے عزتی کا بدلہ میں تجھ سے کیسے لیتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ محمد ﷺ اور محمد ﷺ کا خدا تجھے کیسے میرے پنجہ سے چھڑاتا ہے۔''

یوں حضرت بلال پر ظلم وستم کے لامتناہی سلسلہ کا آغاز ہوا۔ مکہ میں حرہ کی زمین اپنی تپش اور گرمی میں مشہور تھی۔ دھوپ سے تانبے کی طرح دھک اٹھتی تھی۔ امیہ عین دوپہر کے وقت حضرت بلال کو نکال کر وہاں لے جاتا اور لٹا کر اوپر بھاری پتھر رکھ دیتا تاکہ جنبش نہ کرسکیں اور پھر کہتا کہ اب محمد ﷺ کے خدا کا انکار کر کے لات ومنات کے معبود برحق ہونے کا اقرار کرلے' ورنہ یوں ہی دھوپ میں جلتا رہے گا۔'' لیکن جام حق سے سرشار بلال کی زبان پر ایک ہی کلمہ ہوتا احد......احد......

حضرت بلالؓ کی زبان سے احد احد کی صدا سن کر امیہ مزید طیش میں آجاتا اور ان کو زدوکوب کرنا شروع کردیتا۔ ایک دن تو اس نے مظالم کی انتہا کردی۔ ایک دن اور ایک رات بھوکا پیاسا رکھ کر تپتی ہوئی ریت پر ان کے تڑپنے کا تماشہ دیکھتا رہا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ میں نے بلال کو اس حالت میں دیکھا تو امیہ نے انہیں سخت دھوپ میں لٹا رکھا تھا' زمین ایسی تپتی تھی کہ اگر گوشت اس پر رکھ دیا جاتا تو گل جاتا مگر اس حالت میں بھی وہ لات وعزیٰ کا انکار کر رہے تھے۔

جب اس قدر ظلم سے بھی امیہ کا مقصد پورا نہیں ہوا تو اس کی آتش غضب مزید بھڑک اٹھی۔ اس نے ایسے غلاموں اور بنوجمح کے لونڈوں کو اکسایا کہ اس لات ومنات کے باغی کو اتنی اذیتیں دو کہ یہ محمد کے خدا کا نام لینا بھول جائے۔

یہ بدبخت امیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حضرت بلال کو اذیتیں دیتے۔ بری طرح مار پیٹ کرتے اور جب سورج اوپر آجاتا تو کپڑے اتروا کر لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیتے۔ شام کو ہاتھ پاؤں باندھ کر کوٹھری میں پھینک دیتے اور رات میں ان پر تازیانے برساتے رہتے لیکن حضرت بلالؓ کی زبان سے احد احد کے سوا کچھ نہ نکلتا۔

امیہ حضرت بلالؓ کے گلے میں رسی باندھ کر ان کو لونڈوں اور بدمعاشوں کے حوالے کردیتا اور وہ انہیں مکہ کی گھاٹیوں میں گھسیٹتے اور پھر تپتی ہوئی ریت پر منہ کے بل گرا کر اوپر سے پتھروں کا ڈھیر لگادیتے لیکن اس عالم میں بھی آپ کے منہ سے یہی کلمے نکلتے کہ ''میں لات وعزیٰ' ہبل' اساف اور نائلہ و بوانہ سب کا انکار کرتا ہوں۔''

تشدد کی ہولناک چکی میں پستے رہنے اور اذیتوں کو سہنے کے باعث آپ کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو شدید زخموں سے بھر نہ گیا ہو لیکن قوت ایمانی میں ذرا برابر کمی نہ آئی تھی۔

حضرت ابوبکر بھی بنوجمح کے محلے میں ہی رہتے تھے' آتے جاتے حضرت بلال کو اذیتوں اور مظالم کا نشانہ بنتے دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔ امیہ کو نصیحت کرتے لیکن وہ ان کی باتوں کو ہنسی میں اڑا دیتا۔

جب مظالم حد سے گزرنے لگے تو ایک دن بے تاب ہوگئے اور امیہ بن خلف کے گھر جا کر اس کو سمجھایا۔ لیکن اس نے حقارت کے ساتھ جواب دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی باتوں کا برا نہ منایا اور بڑی نرمی سے سمجھایا کہ ''تم صاحب قوت ہو ایک غلام پر اس قدر ظلم و تشدد تمہارے شایان شان نہیں۔ تم اس طرح عربوں کی قومی حمیت و روایات کو بھی بٹا رہے ہو۔''

آخر تنگ آ کر امیہ بولا۔ ''اے ابوقحافہ! اگر تم اس غلام کے اس قدر ہی ہمدرد ہو تو اس کو خرید کیوں نہیں لیتے۔'' صدیق اکبر تو اس بات کے انتظار میں تھے انہوں نے جھٹ کہا۔

''بولو کیا لو گے؟''

امیہ نے کہا۔ ''تم اس کے بدلے اپنا غلام ''فسطاس رومی دے دو۔'' فسطاس بڑا ہوشیار اور کارآمد غلام تھا لہٰذا بہت قیمتی تھا۔ امیہ کا خیال تھا کہ حضرت ابوبکر اس کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے۔

لیکن حضرت ابوبکر فوراً بولے۔ ''مجھے منظور ہے۔''

امیہ ان کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ وہ پھر ڈھٹائی سے بولا۔

''میں فسطاس کے ساتھ چالیس اوقیہ چاندی بھی لوں گا۔''

حضرت ابوبکرؓ پھر بھی رضامند تھے۔

امیہ بن خلف اس سودے سے بڑا خوش تھا۔ اپنے لحاظ سے اس نے بڑے ہی نفع کا سودا کیا تھا۔

جب صدیق اکبر بلالؓ کو لے کر چلنے لگے تو امیہ بن خلف ہنس کر کہنے لگا ''کہ اے ابی قحافہ! اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس غلام کو درہم کے چھٹے حصے میں بھی نہ خریدتا۔''

حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا۔ ''امیہ تو اس غلام کی قدر و قیمت نہیں جانتا۔ مجھ سے پوچھو تو یمن کی بادشاہی بھی اس کی قیمت کے مقابلے میں ہیچ ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے حضرت بلالؓ کو آزاد کر دیا اور پھر ساتھ لے کر بارگاہ رسالت میں پہنچے۔ حضور اکرم ﷺ سارا واقعہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا اے ابی بکرؓ! اس کارِ خیر میں مجھے بھی شریک کر لو۔''

صدیق اکبر نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ ﷺ میں نے اسے آزاد کر دیا ہے۔''

حضرت بلال اب آزاد تھے جو چاہتے کر سکتے تھے لیکن آپ نے ہر چیز کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت ہی کو اولیت دی اور اپنے آپ کو رسول ﷺ کے لیے مختص کر دیا۔ سفر ہو یا حضر، دکھ ہو یا سکھ، وعظ و تبلیغ کے کام ہوں یا میدان کارزار...... آپ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت کے لیے دل و جان سے حاضر رہتے۔

رسول ﷺ سے عشق و محبت ان کی زندگی کا حاصل تھی۔ زندگی کے آخری زمانے میں جب شام کے معرکوں سے فارغ ہو کر وہیں کے ایک گاؤں 'غولان' میں سکونت اختیار کی تو ایک رات خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی وہ فرما رہے تھے کہ ''اے بلال! کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم ہماری زیارت کے لیے آؤ۔'' اس خواب نے عاشق صادق کو تڑپا دیا۔ فراق کی رگ بھڑک اٹھی اور حضرت بلال نے بے تابانہ مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ روضہ رسول ﷺ پر حاضر ہو کر اس قدر درد سے روئے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ اب فراق حبیب ﷺ کی بے

چینی دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہیں حضرت حسن اور حضرت حسین بھی موجود تھے‘ اپنے محبوب ﷺ کے جگر گوشوں کو بار بار سینے سے چمٹاتے اور چومتے۔ انہوں نے خواہش کی کہ ”بابا بلال! کل فجر کی اذان روضہ رسول ﷺ پر آپ دیں گے۔“ سارا مدینہ اُن کی اذان سننے کے لیے گوش بر آواز تھا۔ جوں ہی انہوں نے اذان شروع کی‘ ایک حشر برپا ہوگیا۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا عہد مبارک پھرنے لگا۔ فراق رسول ﷺ کا زخم ایک بار پھر ہرا ہوگیا۔ جب حضرت بلال نے ’اشھد ان محمد رسول اللہ‘ کہا تو گھروں کی خواتین بھی روتے روتے باہر نکل آئیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے رسول اللہ ﷺ نے آج ہی وصال فرمایا ہے۔

☆......☆......☆

ہجرت کے بعد جب بلالؓ مدینہ پہنچے تو حضرت سعد خشمیہ انصاریؓ کے مہمان ہوئے سرور کائنات نے جب مدینہ میں مواخات قائم کی تو حضرت رویحہؓ عبداللہ بن عبدالرحمن خشمی انصاری کا اسلامی بھائی بنایا۔ دونوں بھائیوں میں حقیقی بھائیوں ہی طرح محبت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ حضرت بلالؓ کو جب بھی کہیں باہر جانا ہوتا وہ حضرت رویحہؓ کو ہی اپنے تمام معاملات سونپ کر جاتے۔

غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت بلالؓ جنگ بدر سے لے کر جنگ تبوک تک اپنے آقا و محبوب ﷺ کے قدم بہ قدم ساتھ تھے۔ غزوہ بدر میں آپ آٹا گوندھنے میں مصروف تھے دیکھا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف امیہ بن خلف کو گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔ حضرت بلال کو اس کی اسلام دشمنی یاد آ گئی۔ پکار کر کہا۔

”اے انصار اللہ و انصار رسول! یہ امیہ بن خلف مشرکوں کا سرغنہ ہے۔ دیکھنا بچ کر نہ جانے پائے۔“ ان کی آواز سنتے ہی چند صحابہ کرامؓ ادھر دوڑے اور امیہ کو جہنم واصل کیا۔

ایک روایت میں ہے کہ امیہ کے ساتھ اس کا بیٹا علی بن امیہ بھی مارا گیا۔ یہ دونوں اسلام کے بدترین دشمن تھے اور مکہ میں مسلمانوں کو ایذا دینے میں پیش پیش رہتے تھے۔

ہجرت کے بعد جب مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر مکمل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اذان دینے کا فریضہ حضرت بلالؓ کے سپرد کیا یوں ’حضرت بلالؓ اسلام کے سب سے پہلے موذن ہیں۔“

حضرت بلال کی آواز بلند اور انتہائی دلکش تھی۔ حسن صوت اور الفاظ کی ادائیگی ایسی دلوں کو چھو لینے والی تھی کہ جو کوئی سنتا‘ اپنے سارے کام چھوڑ کر مسجد کی طرف لپکتا...... سنہ 8 ہجری میں جب مکہ فتح ہوا تو حضرت بلال آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ کعبہ کو بتوں اور مشرکانہ تصاویر سے صاف کرنے کے بعد آپ ﷺ نے حضرت بلال سے فرمایا...... ”اے بلالؓ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر توحید کی آواز بلند کرو۔“

حضرت بلالؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ جب آپ نے اپنی دلکش آواز میں اشھدان لا الہ الا اللہ اور اشھد ان محمد الرسول اللہ پکارا تو زمین و آزمان پر سناٹا چھا گیا۔

کل تک جہاں مسلمان ایک آزادانہ سجدے کے لیے مجبور تھے‘ آج اسی شہر میں اور اسی محترم گھر کی چھت سے خدائے واحد اور محمد ﷺ کے رسول ہونے کا اقرار کیا جا رہا تھا اور وہ بھی اس غلام کی زبان سے جسے کل تک اسی جرم میں مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا جاتا تھا۔

حضرت بلالؓ کو یہ ایک ایسی فضیلت حاصل

ہوئی جس کے سامنے شاہان عرب وعجم کے تاج بھی کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے۔ قبول اسلام کے بعد حضرت بلالؓ ہر موقع پر اپنے آقا و مولا کے ساتھ ہوتے تھے۔ اگر حضور ﷺ کو فاقہ ہوتا تو وہ بھی فاقہ سے ہوتے۔ اگر حضور ﷺ کو کوئی دکھ پہنچتا تو آپ بھی سخت دکھی ہو جاتے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اللہ کے راستے میں مجھے اتنا ڈرایا اور دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا اور اللہ کی راہ میں مجھے اتنا ستایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ستایا گیا۔ ایک دفعہ تیس دن اور رات اس حال میں گزرے کہ میرے اور بلال کے لیے کھانے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے سوائے اس کے جو بلال نے اپنی بغل کے نیچے چھپا رکھا تھا۔''

11ھ ہجری میں جب سرور کائنات اس دنیا سے تشریف لے گئے تو حضرت بلال پر غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دل کی دنیا ویران ہوگئی۔ آپ ﷺ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد حضرت بلال خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔

''اے خلیفۃ الرسول! میں نے اپنے آقا کو فرماتے سنا ہے کہ مومنین کے لیے سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے' میرا ارادہ ہے کہ اب میں تادم مرگ جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہوں گا۔''

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ''اے بلالؓ! میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں اور اپنی حرمت اور اپنے حقوق کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ میری عمر زیادہ ہوگئی ہے' میرے قویٰ کمزور ہوگئے ہیں اور میری وفات قریب ہے' اس لیے تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔''

حضرت بلالؓ نے صدیق اکبر کی بات مان لی اور مدینہ میں ٹھہر گئے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت بلال رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا کہ اے خلیفۃ الرسول! کیا آپ نے مجھے خدا کے لیے آزاد کیا تھا یا اس لیے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔''

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا...... ''میں نے تمہیں محض اللہ کے لیے آزاد کیا تھا۔'' اس پر حضرت بلالؓ نے درخواست کی کہ ''مجھے جہاد پر جانے کی اجازت دیجیے کیونکہ میں اپنی بقایا زندگی اسی کام میں گزارنا چاہتا ہوں جسے میرے آقا نے افضل ترین کام کہا ہے۔''

لیکن حضرت بلال نے خدا کا واسطہ دے کر ان سے کہا کہ ''مجھے اس عالم پیری میں اپنی رفاقت سے محروم نہ کرو۔''

حضرت بلال ان کی بات مان گئے لیکن ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ میں اب رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لیے اذان نہ دوں گا۔''

صدیق اکبرؓ نے فرمایا ''تمہیں اس بات کا اختیار ہے۔''

صدیق اکبرؓ کے بعد جب عمر فاروقؓ کے دور میں ان کے عہد خلافت کے ابتدائی زمانے میں آپ جہاد کے لیے شام گئے اور رومیوں کے خلاف داد شجاعت دی۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد جب حضرت عمرؓ کو بنفس نفیس شام جانا پڑا اور ان کے بیت المقدس پہنچنے کے بعد عیسائیوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور معاہدہ صلح مرتب ہوگیا تو حضرت عمر نے مسلمانوں کے سامنے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ سامعین میں حضرت بلالؓ بھی موجود تھے۔

حضرت عمرؓ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ’’اے ہمارے سردار بلال! آج اسلام کے قبلہ اول پر توحید کا پرچم لہرایا ہے‘ ایسے عظیم الشان دن اگر آپ اذان دیں تو ہم آپ کے شکر گزار رہوں گے۔‘‘

حضرت بلال نے عرض کی۔ امیر المومنین میں عہد کر چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لیے اذان نہ دوں گا لیکن آج آپ کے ارشاد کی تکمیل میں اذان دیتا ہوں۔‘‘

یہ کہہ کر اذان کے لیے کھڑے ہو گئے جب ان کے منہ سے اللہ اکبر اللہ اکبر کے الفاظ نکلے تو صحابہ کرام کے دلوں پر قیامت گزر گئی۔ عہد مبارک کی یاد میں روتے روتے نڈھال ہو گئے۔ اذان ختم ہوئی تو عاشقان رسول ﷺ کو قرار آیا۔

ہجرت نبوی ﷺ کے کچھ عرصے بعد کا زمانہ ہے جب حضرت بلالؓ نے اپنا گھر بسانا چاہا۔ حالت یہ تھی کہ زمین وزر سے بھی محروم تھے اور پھر ظاہری حسن صورت بھی نہ تھا۔ حبشی النسل تھے۔ غلامی میں عرصہ گزارا تھا۔ مہاجرین وانصار میں کوئی بھی رشتہ دار نہ تھا۔ رشتہ کے سلسلے میں متفکر تھے کہ کون ان کو اپنی بیٹی دے گا لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب آپؓ نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو تمام انصار و مہاجرین نے جو انتہائی شرفائے عرب میں شمار ہوتے تھے‘ ان کے سامنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے اور ہر ایک نے بڑھ کر انتہائی خلوص کے ساتھ کہا کہ آپ کو اپنا خویش بنانے سے بڑھ کر ہمارے لیے عزت کی بات کون سی ہو سکتی ہے یہاں تک کہ آپ کو رشتہ کا انتخاب مشکل ہو گیا۔

شام کے معرکوں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت بلالؓ نے وہیں کے ایک گاؤں (خولان) میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک دن

فرمانِ الٰہی

ان (ایمان والے عقل مند لوگوں) کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے اعلانیہ اور پوشیدہ (ہماری راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں اور بدسلوکی کو حسن سلوک سے ٹال دیتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے۔ (الرعد:22)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

سیدہ صفیہ بنت ابی عبید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج مطہراتؓ سے روایت فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص نجومی کے پاس جائے‘ اس سے کوئی بات پوچھے تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہ ہو گی۔‘‘ (مسلم)

اقوالِ حضرت علیؓ

☆ لوگ جس چیز کو نہیں جانتے‘ اُس کے دشمن ہوتے ہیں۔

☆ وہ تھوڑا سا عمل جس میں ہمیشگی ہو اُس زیادہ سے بہتر ہے جو دل کی تنگی کا باعث ہو۔

☆ فخر و سربلندی کو چھوڑ دو‘ تکبر و غرور کو مٹاؤ اور قبر کو یاد رکھو۔

☆ اللہ جس بندے کو ذلیل کرنا چاہتا ہے‘ اُسے علم و دانش سے محروم کر دیتا ہے۔

☆ صبر کرنے والا ظفر و کامرانی سے محروم نہیں ہوتا۔ چاہے اُسے طویل زمانہ لگ جائے۔

(حضرت علیؓ کی کتاب ’’نہج البلاغہ‘‘ سے اقتباس)

مرسلہ: زاہد علی۔ کراچی

خواب میں رسول اللہ ﷺ کا دیدار کیا۔

''فرما رہے تھے کہ اے بلال! کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ تم ہماری زیارت کے لیے آؤ۔''

فراق حبیب ﷺ میں تڑپ گئے اور بے تابانہ مدینہ کا رخ کیا۔

سنہ بیس 20ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دور حکومت تھا حضرت بلالؓ کی وفات کی اطلاع آپ تک پہنچی تو خوب روئے اور بار بار فرماتے۔

''آہ! آج ہمارے سردار بلال بھی ہم سے رخصت ہو گئے۔''

حضرت بلالؓ نے متعدد نکاح کیے' ان کی بیویاں عرب کے شریف اور معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن کسی سے اولاد نہ ہوئی۔

حضرت بلالؓ سبقت فی الاسلام میں انتہائی سابقون الاولون میں شامل ہیں۔ عہد فاروقیؓ میں ایک دفعہ قریش کے روساء ملاقات کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس گئے۔ اسی دوران حضرت بلالؓ بھی تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے حضرت بلالؓ کو اندر بلایا۔ اکابرین و روؤسا کو یہ بات ناگوار گزری کہ شرفاء قریش تو منتظر رہیں اور بلال حبشی کو ان پر فوقیت دی جائے۔ اس موقع پر حضرت عکرمہ بن ابی جہل اور دوسری روایت میں حضرت سہیل بن عمرو نے کہا۔

''داعی حق نے تو ہم سب کو حق کی طرف دعوت دی تھی لیکن ہم ہی نے تاخیر کی اور بلال جیسے لوگ ہم پر سبقت لے گئے۔ لہٰذا اب بھی وہ ہی شرف اولیت رکھتے ہیں اور ہمیں شکایت کا کوئی حق نہیں۔'' حضرت بلال کے جوش ایمان کی یہ کیفیت تھی کہ ایمان ہی کو تمام اعمال حسنہ کی بنیاد سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے دریافت کیا کہ سب سے بہتر عمل کون سا ہے؟ فرمایا۔

''اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر صدق دل سے ایمان لاؤ۔ پھر جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ ادا کرو اور پھر حج بیت اللہ کا فرض ادا کرو۔''

حق کی راہ میں ہر قسم کی صعوبتوں کو برداشت کرنے' تمام عبادتوں اور فرائض کو ادا کرنے' اخلاص و وفاداری کے ساتھ محبوب ﷺ خدا کا ہر قدم پر ساتھ دینے کے باوجود فکر آخرت سے لرزہ براندام رہتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن فجر کی نماز کے وقت حضور ﷺ نے حضرت بلال کو بلا کر پوچھا۔

''اے بلال! مجھے تم اپنا کوئی ایسا عمل بتاؤ جس پر سب سے زیادہ اجر و ثواب کی امید ہو کیونکہ میں نے اپنے آگے جنت میں تمہارے جوتوں کی چاپ سنی ہے۔'' حضرت بلال نے عرض کیا۔

''میں نے تو کوئی ایسا عمل نہیں کیا البتہ رات دن میں میرا کوئی وضو ایسا نہیں ہے کہ جس کے بعد میں نے نماز نہ پڑھی ہو۔''

حضرت بلالؓ کو دربار نبوی میں جو مقام حاصل تھا' اسی بنا پر تمام صحابہؓ آپ کو محبوب و محترم جانتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ'' حضرت ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار حضرت بلال کو آزاد کرایا۔''

حضرت بلالؓ کی زندگی کے پُرعزم واقعات رہتی دنیا تک تمام مسلمانوں کے لیے تقلید و عمل کی راہیں روشن کرتے رہیں گے۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل پڑھنے والے تمام خواتین وحضرات کو میرا خلوص بھرا سلام...... وعدے کے مطابق دوشیزہ جلدی دیا ہے اس یقین کے ساتھ کہ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور اب جو لوگ دیر سے شمارہ ملنے کا بہانہ کرتے تھے وہ بھی محفل میں شرکت یقینی بنائیں گے۔ پچھلے دنوں کچھ بہت بڑے بڑے فیصلے ہوگئے مگر ان فیصلوں کے بعد امید ضرور بندھی ہے کہ شاید اب ہم اپنی آنے والی نسلوں کو بہتر پاکستان دے سکیں گے اللہ کرے یہ امید یقین میں تبدیل ہو جائے۔ آیئے اسی خوش فہمی کے ساتھ پہلے خط کی طرف بڑھتے ہیں۔

⋈: لاہور سے تشریف لائی ہیں زمر نعیم لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری منزہ سہام! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اللہ کا فضل وکرم ہے کہ وہ ہمیں دن کے اجالوں کے ذریعے مایوسی کے اندھیروں سے نکال لیتا ہے۔ شکر ہے اللہ کا جس نے مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا...... منزہ جی! ابھی ابھی مجھے T.C.S کی طرف سے پارسل واپس مل گیا ہے۔ اور میں فوری آپ کو ارسال کرنے کے لیے مسودہ دوبارہ سے پیک کرنے لگی ہوں۔ انتہائی دکھ واذیت کے ساتھ میں نے اپنا پارسل وصول کیا ہے۔ نہایت خستہ حالت تھی اور بخدا اُس پر کوئی اسٹیمپ کوئی مہر کوئی اسٹیکر نہیں تھا۔ سوائے ڈلیوری ڈیٹ کے...... میں نے دوشیزہ کا پتہ بھی اُسی طرح درج کیا تھا۔ جس طرح رسالے پر لکھا ہوا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے 300 روپے خرچنے کے بعد (TCS والوں نے وصول کیے تھے) اتنی خواری' مغز ماری اور ذلت کے بعد بھی' کام' نہیں ہوا۔ اداروں کا نظام اس قدر خراب ہے۔ سوچ سوچ کر ذہن ماؤف ہو رہا ہے۔ غریبوں کے لیے نہ نظام درست ہیں۔ نہ آسانیاں...... آخر ہم جیسے لوگ زندگی کی ڈگر پر کس طرح گامزن ہوں۔ جن کے پاس مسائل زیادہ وسائل کم ہیں۔ کیا کہوں' کیا کروں' اس جلن کڑھن سے اپنی صحت ہی خراب ہوتی ہے کسی کا کچھ نہیں جاتا۔ جیسے ہی آپ کو پارسل ملے گا مجھے مطلع ضرور کیجیے گا۔ اگست کے لیے قسط ابھی لکھ رہی ہوں۔ مکمل کرتے ہی ارسال کردوں گی۔ پلیز منزہ میری کوئی بات بری لگے تو درگزر کیجیے گا۔ آپ سے درخواست ہے اگر جولائی کا شمارہ تیار ہے تو بے شک کوئی عذر دے کر یہ قسط اگلے مہینے لگادیں۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں مجھے ضرور بتا دیجیے گا۔ اللہ آپ کو خوش وآباد رکھے انشاء اللہ رابطہ رہے گا' دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

✍: اچھی زمر! اپنی آنکھوں کی نظر اتار لیا کرو۔ اور یہ کیوں سوچا کہ مجھے تمہاری کوئی بات بری لگے گی ہرگز نہیں...... مجھے بھی یہاں کے سسٹم کا اندازہ ہے اسی لیے بس یہی کہتی ہوں کہ ایڈوانس میں قسط ارسال کیا کرو بہرحال جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا...... اس بار کی قسط شاندار ہے مزہ آیا پڑھ کر۔

⌧: وہ شاہکار جس کا تھا انتظار جی ہاں کراچی سے تشریف لائی ہیں عقیلہ حق لکھتی ہیں۔ امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے آپ سے افسانہ کا وعدہ تھا مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے' سو افسانہ تحریر کرتے کرتے آنکھیں دُکھنے آ گئیں' تحریر نامکمل چھوڑی اور آنکھوں پر رومال رکھے لیٹی رہی پھر کچھ کام تھا تو ملک سے باہر جانا پڑ گیا لیکن دل اُس وعدے میں اٹکا رہا جو آپ سے کیا تھا۔ واپس آ کر سب سے پہلے تحریر مکمل کی سوچا دوشیزہ پڑھ لوں تا کہ ہاتھ کے ہاتھ تبصرہ بھی ہو جائے...... بک اسٹال پر پہنچی اور لڑکے سے کہا دوشیزہ ہے......لڑکے نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا اور کہنے لگا معاف کیجیے گا باجی ہم یہ دھندہ نہیں کرتے۔ دھندہ نہیں کرتے ہم 'دوشیزہ' نہیں بیچتے میں حیرت سے چلائی۔ کہنے لگا۔ باجی آپ شریف خاتون ہو اور دوشیزہ بیچنے اور خریدنے کی بات کر رہی ہو...... یقین نہیں آ رہا...... اُف میرے اللہ' میرے دماغ کے تار جیسے جھنجھلا گئے' بھائی میں دوشیزہ ڈائجسٹ کی بات کر رہی ہوں تب جا کر اُس کی سمجھ میں آیا اور اُس کی نگاہوں کی مشکوکیت ختم ہوئی گھر جا کر آئینہ غور سے دیکھنا ہے کیا میں دوشیزگی کا کاروبار کرنے والی لگتی ہوں میں نے دل ہی دل میں عہد کیا۔ اگر اے حسین دوشیزہ آپ مجھے دوشیزہ بھیج دیتیں تو کم از کم خود میں اپنے بارے میں مشکوک نہیں ہوتی۔ خیر عید نمبر میرے ہاتھوں میں ہے یقیناً سب تحریریں زبردست ہوں گی کیونکہ میری تحریر شامل نہیں ہے تو رسالہ شاندار ہی ہوگا۔ اب عید نمبر تو آ گیا آپ باسی عید نمبر نکال کر میرا افسانہ بھی لگا دیجیے یہ افسانہ اُن لوگوں کے لیے ہے جن کی عید والے دن لائٹ نہیں تھی۔ یا عید سے دو دن پہلے سسرال والے رہنے آ گئے تھے یا جن کی میکے میں بھائیوں نے دعوت نہیں کی تھی۔ میری تحریر پڑھ کر وہ اب عید منا لیں...... آپ سب کے ووٹ کی شدید ضرورت ہے۔ رضوانہ پرنس نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا رضوانہ آپ کا ڈرامہ دیکھا پسند آیا بہت بہت مبارک ہو۔ میں سارا رسالہ نہیں پڑھ سکی ہوں لیکن ہاں طیبہ عنصر مغل کا ٹھنڈا چولہا پڑھا طیبہ ایک اچھا اضافہ ہیں۔ مختصر لکھتی ہیں لیکن حساس موضوعات پر لکھتی ہیں۔ ماشاء اللہ طیبہ خوش رہیے انشاء اللہ اگلے ماہ تمام رسالے پر میرا تبصرہ تفصیلی ہوگا۔ بس یہ کہنا ہے کہ گو کہ میں دوشیزہ شاید نہیں ہوں لیکن ایڈیٹر تو ایک پیاری سی دوشیزہ ہیں اگر رسالہ مل جائے تو کم از کم تحریر اور تبصرہ کی تحریک جاری رہے اور منزہ صاحبہ وہ مشہور عالم ردی کی ٹوکری یا وہ الماری جس میں سالہا سال کے لیے تحریریں رکھ دی جاتی ہیں اُس سے میری طرح میری معصوم سی تحریر کو بچا کر رکھنا پلیز...... اچھا میری آنکھیں دُکھنے آئی ہوئی ہیں اس لیے بہنوں کی محفل بھی نہیں پڑھ پائی لیکن میری طرف سے سنبل کو ایوارڈ کی بہت بہت مبارکباد...... اللہ سب کو خوش رکھے۔

ھ: بہت ہی پیاری عقیلہ زیادتی کرتی ہو ایک ادھ افسانہ بھیج کر ردی کی ٹوکری اور قفل بند الماریوں پر الزام لگا دیتی ہو...... اب تو وہ بھی تم سے ناراض ہیں اور لوگوں کو آنکھیں دکھانا کم کر دو ٹھیک ہو جائیں گی۔ ویسے عقیلہ دوشیزہ پابندی سے پوسٹ ہو رہا ہے تمہارے ایڈریس پر چیک کرو۔

⌧: دھیمی دھیمی پھوار میں بھیگتا ہوا یہ نامہ لکھا ہے خولہ عرفان نے کہتی ہیں۔ السلام علیکم! آپ کی آسودہ و کامیاب زندگی کی نیک خواہشات کے ساتھ حاضر محفل ہوں یہ بھی دعا ہے کہ خط آپ کو بروقت مل جائے پرچہ یقین کریں ایسے پڑھا ہے جیسے کئی دن کے پیاسے کو پانی مل جائے اور اس وقت تک دوشیزہ کی جان نہ چھوڑی جب تک کہ تل اور آلو کے بالز کی ترکیب سے وہ بنا نہ لیے۔ آپ کا محاوروں سے نالاں اداریہ بھی پڑھا اور اپنی ہنسی دانتوں کے پیچھے چھپاتے رہے۔ جو کہ پہلے ہونٹوں کے پیچھے چھپتی تھی۔ منزہ دراصل اب تو محاورے بھی سرکار کی ہی پیروی کریں گے الٹی گنگا بہہ رہی ہے تو آڑے ٹیڑھے محاورے بھی دوڑیں گے۔ خیر یہ ایک نا ختم ہونے والی بحث ہے لہٰذا آگے بڑھتی ہوں غلاموں کے سردار کے بارے میں ایم ایمان کی ایمان افروز باتوں نے نہ صرف دل کو طمانیت دی بلکہ بہت ساری مفید معلومات میں اضافہ کا باعث بھی بنی۔ دوشیزہ محفل

خوبصورت' برسات کے موسم کے باوجود کچھ پھیکی لگی اس حوالے سے کسی سینئر مصنفہ کا تبصرہ پڑھنے میں نہیں آیا اور جن قابلِ احترام مصنفین ومبصرین نے تبصرے کیے بھی تو وہ ذاتی وانفرادی نوعیت کے تھے۔ ایک بلال فیاض صاحب نے حق ادا کیا اس لیے نہیں کہ مجھے ایوارڈ کی مبارک باد دی بلکہ سب ہی افسانوں کا ذکر کیا جس پر مجھے یاد آیا کہ واقعی سنبل کا نسوانیت بہت عمدہ ناولٹ تھا۔ ان کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ ہر تحریر میں انوکھا پن آجاتا ہے اور موضوع بھی منفرد ہوتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ خود بلال فیاض کو ان کے ناولٹ زینی اور زینب پر مبارکباد دوں گی کہ موضوع اگرچہ پرانا تھا لیکن منفرد اندازِ تحریر اور الفاظ و واقعات کے انتخاب نے نہ صرف اسے انوکھا پن عطا کیا بلکہ دلچسپی بھی برقرار رکھی۔ تیر نیم کش حبیبہ عمر کا پورے ذوق وشوق سے شروع کیا اور آخر میں 'جاری ہے' پڑھ کر صرف صفحہ کو ہی گھور کر رہ گئے۔ ویسی ہی کوفت ہوئی جو شادی میں تاخیر سے پہنچنے کے باوجود یہ سننے پر ہوتی ہے کہ بارات ابھی تک نہیں آئی لیکن حبیبہ بہت اچھے حنا بشریٰ کا بانہوں میں چاندی طرزِ تحریر کے حوالے سے خوبصورت تحریر تھی لیکن حالات و واقعات بشمول ہیروئن نے ہمیں حسینہ معین کے ڈراموں کی یاد تازہ کرادی۔ اتنے خوفناک حالات سے گزری ہوئی لڑکی اور اتنی شوخ وشریر مگر ان تمام غیر یقینی باتوں کے باوجود پڑھنے میں مزہ آیا کہ یہی تو افسانہ نگاری ہے۔ مریم شیراز کا سچی خوشی اور طیبہ عنصر کا ٹھنڈا چولہا دونوں ہمارے بیمار معاشرے کے خدوخال کو واضح کرتے اچھے افسانے تھے۔ حنا اصغر کا افسانہ یہ عید ملن کی بھی مزہ دے گیا۔ واقعہ نگاری اور اسلوب نگاری دونوں بہت عمدہ تھے اور اس بات کی وضاحت ہو رہی تھی کہ جو اللہ کی رضا میں راضی ہوتا ہے اللہ اس کو اپنی رضا کے ساتھ وہ ضرور دیتا ہے جس کا وہ خواہشمند ہوتا ہے۔ منی ناول میرے چارہ گر تحسین انجم انصاری کے ناول کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ اگر ایک دو قسطیں رہ بھی جائیں پڑھنے سے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پچھلی اقساط میں کیا ہوا تھا۔ دو قسطیں دراصل پڑھنے سے رہ گئیں ہیں تاخیر سے رسالہ ملنے کے سبب لیکن ہم بچوں کی طرح محنت کرلیں گے ہاہاہا...... رضوانہ پرنس کا عید کا تحفہ بھی خوبصورت تحریر تھی اور سب سے حساس موضوع کی نشاندہی بھی کر رہی تھی کہ دو روحوں کو ذہنی طور پر ہم آہنگ کرنے سے پہلے جسمانی طور پر ایک کردیا جاتا ہے جس تعلق کی بنیاد رب کریم نے خود رکھی حضرت آدم کے ساتھ حضرت حوا کو تخلیق کر کے اس کو ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ نظر انداز اور ایک وقتی جذبے کے طور پر کیا اور لیا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے بحیثیت بیوی اور شوہر کے ایک دوسرے کے حقوق وفرائض دین کی روشنی میں نہ لڑکی کو سمجھائے جاتے ہیں نہ لڑکے کو اور صبر و برداشت کا سہرا بھی ہمارے معاشرے کو لڑکی کے سر پر سجا ہوا ہی زیادہ اچھا لگتا ہے حالانکہ میں سمجھتی ہوں کہ ایک سمجھدار انسان ہی اس رشتے کو سمجھداری سے نبھا سکتا ہے خیر یہ ایک بہت طویل اور غور طلب موضوع ہے۔ پھر جناب آپ کا افسانہ منزہ بغیر بناوٹ کے یقین کریں بہت بہت...... پیارا بہت عمدگی سے افسانے کے جزئیات کو آپ نے سمویا ہے منظر نگاری اور جذبات نگاری ہی تحریر صحیح عکاس تھی۔ آپ کی بحیثیت افسانہ نگار پہلی تحریر میں نے پڑھی ہے۔ بہت اچھے منزہ! سکینہ فرخ کا مثلث خوبصورتی سے کیے گیے۔ اس افسانے کا آغاز کمال ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور جذبات کا اظہار دونوں لاجواب' لیکن قسط وار کیوں؟ پھر رفعت سراج کا دام دل کا آخری حصہ بہت بہت بہت...... عمدگی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ ساری قسطوں کی جان یہ قسط ثابت ہوئی ثمر کو اپنے کیے کا ایسا ہی ثمر ملنا چاہیے تھا۔ اور پھر دوشیزہ کی دوشیزاؤں کی گیٹ ٹو گیدر جس نے چار چاند لگا دیے۔ البتہ تصاویر کے ساتھ مصنفین کے نام بھی شائع ہوتے تو فرداً فرداً شناخت کرنے میں آسانی ہوتی لیکن آپ تو سب سے منفرد اور الگ نظر آ ہی جاتی ہیں۔ نئے لہجے نئی آوازیں کا سلسلہ غائب تھا البتہ دوشیزہ گلستان کو اسماء اعوان کی جگہ ارم حمید نے بھی خوب سجایا لیکن اسماء اعوان ہیں کہاں؟ فرح' سنبل' فصیحہ' رضوانہ کوثر اور زمر بھی جانے کہاں مصروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم سب

ایک ٹائم مشین میں اپنی اپنی مصروفیات وترجیحات کی سوئیوں سے منسلک ہیں جس میں سیکنڈ کی سوئی کی طرح محبت کہیں غائب ہوگئی ہے۔ زندگی کا جزولازم ہے رنگ ہے حسن ہے محبت' روشنی ہے ہوا ہے خوشبو ہے اچھے لوگوں کی رفاقت اللہ ہم سب کو عطا کرے آمین۔ منزہ ایک دو نظمیں آپ کو ارسال کی ہیں بلکہ پچھلی نظم بھی موجود ہوگی اگر نئے لہجے نئی آوازیں میں جگہ بن جائے تو دے دیجیے گا' ایک افسانہ لکھا ہے فیئر کرتے ہی اس تبصرے کے پیچھے پیچھے روانہ کرتی ہوں۔ دعا کرتی کہ یہ کل تک پوسٹ ہوجائے آمین۔ کراچی کا موسم غضب کا ہورہا ہے آج کل' دن میں کبھی رات میں' بارش اہلیان کراچی کو اپنی آغوش میں لیے رہتی ہے۔ اللہ اپنی رحمتوں کا سایہ تمام امت مسلمہ پر سدا قائم ودائم رکھے آمین۔ منزہ اپنا بہت بہت بہت خیال رکھیں۔ دوشیزہ وارا کین و مصنفین ومبصرین وقارئین دوشیزہ اور مدیرہ دوشیزہ کی ترقی وکامیابیوں کے لیے ہر پل دعا گو۔

✍ : اچھی سی خولہ! بھرپور تبصرے کی روایت برقرار رکھنے کا شکریہ...... میری تحریر پسند کرنے کا بھی شکریہ۔ اللہ کرے تمہارا شکوہ سینئر لکھاریوں تک پہنچ جائے اور وہ اپنی شرکت محفل میں یقینی بنائیں افسانہ مل گیا ہے اور نظمیں شمارے میں شامل ہیں۔

⋈ : تمثیلہ زاہد کراچی سے لکھتی ہیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ دوشیزہ کی محفل میں شامل سب ہی دوستوں کو سلام' آج کل کراچی والوں پر خاص ابر رحمت چھائی ہوئی ہے اور ہم...... اس موسم کو خوب انجوائے کررہے ہیں۔ پکوڑوں اور سموسوں کا حقیقی منزہ اسی موسم میں آتا ہے منزہ جی' کھودا پہاڑ نکلا...... چوہا' نے تو پیٹ میں بل ہی ڈال دیے (ہاہاہا) بہت خوب۔ حضرت زید بن حارثہؓ جیسی تحریر نہ صرف ایمان کو تازہ کردیتی ہے بلکہ ہمارے علم میں اضافے کس سبب بنتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ سنبل آپ کو دوشیزہ ایوارڈ بہت مبارک ہو۔ محفل دوستاں پڑھ کر تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس شام کا حصہ ہم بھی تو تھے۔ دوستوں پر مشتمل پررونق اس محفل میں موجود سب ہی آپ سہیلیوں کی محبتوں کو اللہ ہمیشہ یوں ہی قائم ودائم رکھے آمین۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ افسانوں کی دنیا میں پہنچ کر دیکھا یہاں تو منزہ جی کا افسانہ بھی جگمگا رہا ہے سو پہلی تحریر میں نے آپ کی ہی پڑھی اور افسانہ پڑھ کر اپنی دیرینہ دوست وجیہہ یاد آگئی جو امریکا پچھلے بارہ برس سے شفٹ ہے۔ شادی کے بعد صرف دو بار ہی پاکستان آئی اور جتنی جلدی اسے پاکستان آنے کی ہوتی ہے یہاں آکر بچے ایسے گرمی کھا کر بیمار پڑجاتے ہیں کہ وہ چار دن میں واپس لوٹ جاتی ہے۔ آپ کے افسانے کی وردہ ہو بہو میری دوست وجیہہ کا حقیقی روپ ہے جسے میں نے پڑھ کر خوب انجوائے کیا اور اُسے دوشیزہ میں یہ افسانہ پڑھنے کا مشورہ بھی فیس بک پر ان باکس کرکے کیا تھا۔ طیبہ عنصر مغل اور رضوانہ پرنس کے افسانے بھی اچھے تھے۔ آج 19 جولائی ہے آج ہی کی تاریخ میں مجھے دوشیزہ موصول ہوا ہے عموماً پندرہ تاریخ تک دوشیزہ مل جاتا ہے تاخیر کے بناء ڈائجسٹ کا مطالعہ مکمل نہ کرسکی ہوں۔ انشاء اللہ اگلا تبصرہ بھرپور ہوگا۔ اب اجازت دیں۔

✍ : سوئٹ تمثیلہ! شمارہ اس بار لیٹ تھا وجہ بارشیں پھر عید کی چھٹیاں مگر اب انشاء اللہ وقت پر ملے گا لہٰذا وعدے کے مطابق بھرپور تبصرہ بھیجنا ادار یہ اور افسانہ اچھا لگا شکریہ...... دیگر تحریریں پسند کرنے کا بھی بہت شکریہ۔

⋈ : ملتان سے تشریف لائی ہیں مریم شیراز...... لکھتی ہیں۔ جب ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا تو دوشیزہ ہی سے اسٹارٹ لیا امی' خالہ' مامی سب ہی دوشیزہ کی قاری تھی۔ میرا خیال ہے میں آٹھویں کلاس میں تھی جب سے پڑھنا شروع کیا۔ امی اور خالہ کیونکہ خود ڈرائیو کرتی تھیں تو ایک دو دفعہ دوشیزہ کے آفس بھی ہو کر آئیں۔ اس کے بعد خواتین' شعاع' افکار' شمع اور نہ جانے جو بھی رسالہ مل جاتا پڑھتے ہی چلے جاتے' لکھنا بھی انٹر میں ہی شروع کردیا تھا۔ مگر افسانے کہانیاں اب شروع کی ہیں۔ ایک کہانی یا افسانہ یا کچھ بھی کہہ لیں ایک کوشش کی ہے امید ہے حوصلہ افزائی کریں گی۔ جسارت' بتول' سوداگر' اور بچوں کے رسالے نور اور ایکسپریس کرنیں میں

نقشِ قدم

ماہنامہ ’دوشیزہ‘ بہت جلد اپنے صفحات پر ایک نئے سلسلے ’نقشِ قدم‘ کا آغاز کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اُن خواتین کے انٹرویوز شامل ہوں گے‘ جو زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں منتظم کے فرائض انجام دے رہی ہیں...... ’نقشِ قدم سلسلہ ہے اُن خواتین کی صلاحیتوں کے اعتراف اور تشہیر کا‘ جو مردوں کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے صرف معاشرے کی فلاح و بہبود میں ہی اپنا کردار بہت مثبت انداز میں ادا کر رہی ہیں‘ ساتھ ہی زندگی اور بندگی کا حق بھی ادا کر رہی ہیں۔

ان سب میں گزشتہ تین سالوں سے لکھ رہی ہوں۔ اور سب کو پسند بھی آ رہا ہے۔ یہ مجھے خود الگ سی چیز لگی تھی تو آپ کا خیال آیا۔ اب آپ کا کیا خیال ہے یہ آپ بتائیں۔

✍ اچھی مریم! تم سے تو بڑا پرانا تعلق نکلا اور یہ جان کر تو بہت خوشی ہوئی کہ تم آفس بھی آ چکی ہو۔ تمہاری تحریر مل گئی ہے پڑھ کر ضرور بتاؤں گی۔ دوشیزہ پوسٹ کروا دیا تھا امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

✉: گجرات سے عائشہ نے شکوہ بھرا خط لکھا ہے۔ امید کرتی ہوں آپ اور تمام اسٹاف خیر خیریت سے ہوں گے اور اللہ ہمیشہ ہمارے دوشیزہ کو قائم و دائم رکھے آمین۔ مگر میں خیریت سے نہیں ہوں آج 21 تاریخ ہے مگر مجھے ابھی تک دوشیزہ نہیں ملا۔ تو اس بات کا اندازہ ہوا کہ میں آپ کے لیے کتنی غیر اہم ہوں۔ اور ستم یہ کہ میں آپ اور دوشیزہ سے خفا بھی نہیں ہو سکتی۔ پلیز میرا خط ملتے ہی دوشیزہ بھی روانہ کر دیں۔ اور منزہ جی میرے آپ کے پاس تین افسانے ہیں مگر ابھی تک کوئی بھی شائع نہیں ہوا جبکہ آپ نے ایک خط میں افسانہ شائع کرنے کی نوید سنائی تھی اور یہ اسی بات کی دلیل ہے کہ آپ مجھے بھول گئی ہیں پلیز میرے افسانوں کے بارے میں کچھ بتا دیں۔ آپ کے نام ایک گانا...... پہلی بار لکھ رہی ہوں دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے۔

بھول نا جانا
ننھی سی قاری
دوشیزہ کی بچاری
اور نئی لکھاری

(ہاہاہاہا) آپ کو شاعری تو پسند نہیں ہے مگر یقیناً یہ پڑھ کر آپ مسکرائیں گی۔ اُف بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ منزہ جی پلیز میرے افسانوں پر نظر ڈالیں اور دوشیزہ بھی بھیج دیں اب اجازت چاہوں گی۔

✍ پیاری سی عائشہ! تم میرے لیے بہت اہم ہو اس لیے تمہارا خط ملتے ہی تمہیں فون کیا بتانے کے لیے کہ تم کتنی اہم ہو مگر...... چلو جلدی سے پتہ بھیجو دونوں بہنوں کو دوشیزہ بھیجوں گی ٹھیک ہے اور تمہیں یہ کیسے پتہ کہ مجھے شاعری سے دلچسپی نہیں...... یہ ضرور مجھے بتانا تمہاری تحریر جلد شائع کروں گی اب ہنس دو ذرا ننھی سی بے چاری سی قاری......

✉: ژوب سے تشریف لائے ہیں عمران مظہر لکھتے ہیں۔ امید واثق ہے کہ آپ بمع تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہوں گی آپ سب کے لیے سلامتی کی ڈھیروں دعائیں جولائی کا شمارہ ملا سرورق بہترین رہا اشتہارات پھلانگ کر کھودا پہاڑ نکلا...... تک پہنچتے تو BMW اور 125 کے تعلق نے مسکرانے پر مجبور کیا۔ واقعی پاکستان زندہ باد ایم ایمان کے قلم سے حضرت زید بن حارثہؓ کے بارے میں پڑھ کر ایمان آسودہ ہوا۔ دوشیزہ کی محفل میں اس بار کافی خطوط دیکھنے کو ملے...... سکینہ فرخ صاحبہ کا خیال بہترین لگا۔ محفل دوستاں دلچسپ رہی۔ آپی یہ کیا کہ محفل دوستاں ہو یا آم پارٹی...... صرف معزز خواتین ہی کیوں؟ عمران مظہر کیوں نہیں؟ روایات بدلیں تو دل بھی خوش ہو کہ فی زمانہ ہر چیز بدل گئی ہے۔ نہیں بدلا تو ڈائجسٹوں کی پالیسی...... دیکھیں تو سوائے آپ کے ادارے کے رسالوں یا چند ایک دو اور رسالوں کے مرد حضرات کا رسالوں میں لکھنا شجر ممنوعہ ہے۔ بے چارے لڑکے آخر کہاں اپنے قلم کا حق ادا کریں۔ افسانوں میں سب سے پہلے دیس میں پردیس پڑھا۔ بہترین اسلوب میں ملک کے حالات کا موازنہ بیرون سے کیا گیا۔ نسرین اختر نینا صاحبہ کا عید ہو تو ایسی بھی اچھا رہا۔ رضوانہ پرنس صاحبہ نے علینا کو تو عید کا تحفہ دے دیا مگر ردا کی عید پھیکی کر دی۔ طیبہ عنصر مغل صاحبہ کا ٹھنڈا چولہا معاشرے کی بے حسی اجاگر کرتا نظر آیا۔ مریم شیراز صاحبہ کی سچی خوشی بہترین پیغام دے رہا ہے کہ عید کا اصل مقصد کیا ہے۔ دوشیزہ گلستان ہمیشہ کی طرح سجا رہا۔ مجموعی طور پر مجھے جولائی کا شمارہ پسند آیا ہے۔ آپی!

ایک افسانہ بھجوا رہا ہوں چوزن ون کے نام سے...... امید ہے معیار پر پورا اترے گا۔ زندگی رہی تو پھر آدھی ملاقات رہے گی۔ آپ سب اور تمام قارئین اپنا بہت سارا خیال رکھیے گا۔

ھ: مظہر! خوش رہو۔ مجھے تمہارا پابندی سے محفل میں شریک ہونا بہت اچھا لگتا ہے اور یہ درست ہے کہ دوشیزہ وہ واحد رسالہ ہے جو مرد لکھاریوں کو بھی ویلکم کرتا ہے ورنہ بیشتر رسائل نے تو ان کو شناخت ہی نہیں دی۔ بے چارے خواتین کے قلمی ناموں سے لکھتے رہے اور دنیا سے بھی چلے گئے۔ بہر حال تمہاری تجویز قابل غور ہے۔ تبصرے کا شکریہ تحریر پڑھ کر تمہیں مطلع کروں گی۔

✉: فصیحہ آصف تشریف لائی ہیں اولیا کی سرزمین ملتان سے، لکھتی ہیں۔ آج کئی عرصے بعد قلم اٹھایا ہے۔ گرمی اس کی اجازت نہیں دے رہی، اس وقت بھی بجلی ندارد، خیر آپ سے باتیں کرنے کا جی چاہ رہا ہے سو حالات کیسے بھی ہوں۔ ساتھ ہمارا چھوٹے ناں کے مصداق حاضر ہوں۔ آپ کی طرف سے ہر ماہ محبت بھرا تحفہ وصول کرتے وقت یہ احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ رابطہ قرض ہے۔ پچھلے کئی ماہ سے آپ کو میرے خطوط نہ ملے۔ اس بار پھر ہمت کر کے پوسٹ کر رہی ہوں۔ اللہ کرے یہ ملے اور بروقت ملے۔ بروقت اس لیے کہ 20 جولائی کو دوشیزہ ملا۔ تیزی سے نگاہوں کو گھمایا سطور پر...... اور کسی قدر لکھنے کے قابل ہوگئی۔ اگر ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں مل جایا کرے تو تفصیلی تبصرہ ممکن ہو پائے گا۔ جتنا مطالعہ کرسکی اس پر تبصرہ حاضر ہے اداریہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا زبردست لگا۔ حقیقت پر مبنی الفاظ سے مزین تھا۔ اور مصیبت یہ ہے کہ حقیقت لوگوں (حکمرانوں) سے برداشت نہیں ہوتی۔ ام ایمان کا تفصیلی مضمون جو کہ حضرت زیدؓ کے بارے میں تھا بہت کارآمد و مفید لگا۔ ایسے ہی ہر ماہ اسلامیات کے بصیرت افروز مضامین ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گے، بہت ہی اچھا کیا کہ لائف بوائے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اسماء اعوان اب افسانے وغیرہ لکھ کر اپنی تشفی کریں۔ اب قدم رکھتے ہیں بہنوں کی پر بہار محفل میں...... جہاں ست رنگ نہیں بلکہ صدرنگ بکھرے ہیں۔ غزالہ رشید اور سکینہ فرخ کے تبصرے پسند آئے۔ ہر دل عزیز خولہ عرفان اپنے جامع تبصرے کے ساتھ حاضر رہیں۔ باجی نگہت غفار کا احوال افسردہ کر گیا۔ فریدہ فری صاحبہ مختصر مگر تبصرہ کر کے حاضری لگوا جاتی ہیں اللہ انہیں کل صحت عطا فرمائے آمین۔ بلال فیاض، عمران مظہر اور نوشابہ کے خطوط بھی اپنی مثال آپ تھے۔ نقش قدم کا جو سلسلہ شروع ہونے والا ہے اس میں لکھاری بہن بھائیوں کو بھی جگہ دیں۔ یہ بھی بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ غزالہ جلیل راؤ کی والدہ صاحبہ کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے آمین۔ محفل دوستاں صبیحہ شاہ نے خوب محفل جمائی۔ اگر شروع کے صفحات میں تصاویر رنگین ہو جاتیں تو مزا دوبالا ہو جاتا...... اور تصاویر کے نیچے نام ضرور دیا کریں تاکہ پہچاننے میں آسانی ہو۔ کبریٰ خانم سے ملاقات گزارے لائق تھی۔ دام دل کی آخری قسط حسب توقع رہی۔ یہ اچھا کیا کہ ثمر کو بھی اپنے بارے میں پتہ چلا، ورنہ یہ معاشرہ تو عورت کو ہی قصوروار گردانتا ہے۔ یہ بھی سزا خوب رہی کہ کسی اور کے بچے پال کر ساری زندگی کرب میں مبتلا رہے گا۔ چمن کو ستایا بھی تو بہت تھا اس نے، جبھی تو کہتے ہیں خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اپنے زعم میں مبتلا ظلم کرنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ انصاف کا دروازہ بھی کھلا ہے۔ بہر حال رفعت سراج صاحبہ نے ایک عام موضوع کو اپنی خاص تحریر بیان کا انداز دے کر اسے امر کر دیا رضوانہ پرنس کا عید کا تحفہ، خوب رہا۔ طیبہ عنصر مغل کی تحریر نے حالات کے ستائے ایک نوجوان کی داستانِ الم کیا سنائی دکھ سے دل بھر گیا۔ زرق برق کپڑے، مہنگی گاڑیاں، اونچے محلات میں رہنے والے حکمران کیا جانیں کہ دو وقت کی روٹی کے لیے کیا بھیس بدلنا پڑتے ہیں۔ چٹ پٹی خبریں میں مرحوم جنید جمشید کی یاد نے دل پر برچھی سی ماری۔ رہتی دنیا تک انہیں بھلانا واقعی ناممکن ہے۔ ایک مشورہ ہے کہ اشعار کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ ایک صفحہ اس کے لیے مختص کر دیں۔ تاکہ معیاری اشعار پڑھنے کو ملیں۔ جتنا پڑھا جاسکا تبصرہ حاضر ہے تاکہ محفل میں میری جگہ بن جائے باقی سب

خیریت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرے اور دوشیزہ کو مزید ترقی دے آمین۔

ڈیئر فصیحہ! تم نے تفصیلی خط لکھا شکریہ امید ہے تمہاری شکایت دور ہوگئی ہوگی۔ باقی تمہاری تعریف اور تنقید لکھاریوں تک پہنچادی ہے۔

لاہور سے تشریف لائی ہیں نٹ کھٹ فریدہ فری لکھتی ہیں۔ جولائی کا دوشیزہ نشیلی آنکھوں والی دوشیزہ اچھی لگ رہی تھی۔ لاہور میں اتنی کڑا کے دار گرمی پڑ رہی ہے کہ ہم پھر سے نیم پاگل ہوگئے ہیں دعا کریں کہ پاگل نہ ہوجائیں یعنی بالکل پاگل محفل دوستاں پڑھ کر رشک آنے لگا کہ کاش ہم کراچی میں ہوتے تو شاید صبیحہ جی ہمیں بھی انوائٹ کرلیتیں اور ہم بھی بن ٹھن کر ان کے گھر جاتے اور خوب مزے لے کر چیزیں کھاتے مگر صرف ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔ اس مرتبہ بھی سب افسانے بے حد پسند آئے ہم پڑھتے بھی اے سی میں ہیں اور لکھتے بھی اے سی میں ہیں ویسے تو بے حد برا حال ہے۔ منزہ جی سریلی تو میں ایسی ہوں آئندہ نظم سناؤں گی آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔ رضوانہ پرنس کا تو نام ہی کافی ہے واہ کیا افسانہ لے کر آئیں۔ عید کا تحفہ' نوید سحر' فری نعیم' سچی خوشی' طیبہ عنصر بھئی کیا جادوگرنی ہو مطلب ایسے ایسے افسانے ہر میگزین میں لکھے ہیں۔ پڑھ کر مزا آجاتا ہے کیسے لکھ لیتی ہو تم کو فری کی طرف سے ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے ٹھنڈا چولہا کیا بات ہے۔ مثلث سکینہ فرخ چھا گئیں اسی لیے تو گرمی ہو یا سردی دوشیزہ کی تو بات ہی اور ہے ایسی معیاری تحریریں تبھی تو سالوں سے اس کو پڑھ رہی ہوں کچن کارنر میں چکن چنا پلاؤ خوب کھایا اپنی شاعری پڑھ کر خوش ہوئے مگر یہ کیا نئی آوازیں نئے لہجے کیا ہوئے کیا سچی کہانیوں کی طرح یہ بھی غائب' بھئی ہمیں افسانے تو لکھنے نہیں آتے شاعری ہی کرسکتے ہیں کیا اب ہمارا داخلہ بند مگر شکریہ شاعری پھر بھی لگادی بس بھئی اتنا ہی کافی ہے سب کو دعا سلام۔

سوئٹ فریدہ! آپ کی محبتوں کا بہت شکریہ' شاعری تو لازمی جزو ہے اس کے بغیر تو مزہ نہیں آتا بے فکر رہیں دوشیزہ کے صفحات حاضر ہیں۔ میں بھی منتظر ہوں کہ آپ سے جلد ملاقات ہوتا کہ ذرا آپ کی تیاری تو دیکھیں۔

نگین افضل وڑائچ گجرات سے تشریف لائی ہیں' لکھتی ہیں۔ رمضان کی مصروفیت کی وجہ سے خط میں تاخیر ہوگئی اس لیے معذرت چاہتی ہوں۔ آپ سے اس بات کا شکوہ ضرور کروں گی کہ مسلسل پچھلے تین ماہ کے شماروں کا ٹائٹل وہی چلا آرہا ہے۔ خصوصاً عید کے موقع پر ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں اپنا شمارہ 'دوشیزہ' نام کی طرح دیکھنے میں بھی خوبصورت چاہیے۔ اور ہاں شکوہ اس لیے کر رہی ہوں کہ شکوے اپنوں سے ہی کیے جاتے ہیں۔ اب آتے ہی تھوڑی نارمل گفتگو کی جانب مئی اور جون کا شمارہ اپنے تمام تر رنگوں رعنائیوں کے ساتھ میرے پاس رکھا ہے۔ سلسلہ وار ناول' افسانے' شاعری اور باقی تمام سلسلے بھی بہترین ہیں۔ لیکن اپنی شاعری نہ دیکھ کر دل ناتواں تھوڑا بوجھل ہوگیا۔ لیکن اس بات کا یقین ہے کہ میرا پارسل ہی کراچی جاتے جاتے محکمہ ڈاک کے ہاتھوں مر مرا گیا ہوگا ......ہاہاہا...... اس خط کے ساتھ پیارے پاکستان کے لیے نظم جو کہ خصوصی طور پر اگست کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور دیگر نظمیں غزلیں بھیج رہی ہوں۔ شائع کرکے شکریہ کا موقع ضرور دیجیے گا۔ اس سے پہلے دو عدد کہانیاں بھی ارسال کرچکی ہوں ان کے بارے میں بھی کافی مضطرب ہوں کہ آپ کو پسند آئیں یا نہیں۔ منزہ جی آپ سے اور تمام قارئین سے گزارش ہے کہ عائشہ نور عاشا جو کہ میری بڑی بہن ہیں آج کل امتحان کی وجہ سے ان کی حالت کافی غیر ہے ان کے لیے بھی دعائے خیر کیجیے گا۔ اجازت چاہتی ہوں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر اپنی رحمت کا سایہ ہمیشہ برقرار رکھے آمین۔

پیاری نگین! تمہارا یہ جملہ دیر تک ہنساتا رہا کہ عائشہ کی حالت امتحانات کی وجہ سے غیر ہے مجھے اپنا وقت یاد آگیا...... تمہاری تحریر اور شاعری میرے پاس محفوظ ہے جلد شمارے کی زینت بناؤں گی مگر ایک شرط پر کہ پابندی سے محفل میں شرکت کیا کرو اور زبردست سے تبصرے کے ساتھ آیا کرو۔

✉ : نگین افضل وڑائچ اپنے دوسرے خط میں لکھتی ہیں۔ منزہ سہام صاحبہ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ رائٹرز ریڈرز اور پورا اسٹاف اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی رحمت کا سایہ ہم سب پر قائم و دائم رکھے آمین۔ اس خط سے قبل بھی میں نے ایک خط لکھا تھا۔ مگر پوسٹ نہیں کرسکی تھی۔ اب کررہی ہوں۔ یہ خط خاص طور پر اس لیے لکھ رہی ہوں کہ اس خط کے ساتھ ایک عدد افسانہ بھی بھیج رہی ہوں۔ یہ افسانہ امید کرتی ہوں کہ زیادہ نہیں تو چند لڑکیوں کے لیے ہی مشعل راہ ثابت ہوگا۔ یہ افسانہ تقریباً حقیقت پر مبنی ہے۔ امید کرتی ہوں کہ دوشیزہ ڈائجسٹ یہ افسانہ شائع کرکے مجھے شکریہ کا موقع دے گا افسانے کا نام 'چاچو' ہے میں چاہتی ہوں کہ آپ جلد از جلد اسے پڑھ کر مجھے اپنی آراء سے آگاہ کریں۔ میری رائٹنگ کچھ زیادہ ہی بڑی ہے اس لیے لکھنے میں کنجوسی کرتی ہوں ہاہاہا۔ خدا کرے میری رائٹنگ میری طرح خوبصورت ہوجائے۔ ہاہاہا۔ تو میں ہر مہینے لکھنے کے خوب ارمان نکالوں۔ جانتی ہوں آپ کو پڑھنے میں بھی یقیناً زیادہ نہیں تو تھوری مشکل ضرور ہوتی ہوگی۔ اب کچھ کوشش کررہی ہوں کہ بہتر ہوجائے ہاں ایک اور شکایت ہے مجھے وہ یہ ہے کہ دوشیزہ ہر مہینے دیر سے ملتا ہے۔ انتظار کرتے کرتے منہ سوکھ جاتا ہے۔ خیر یہ بھی ہمارے ملک کے حالات کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ خدا ہمارے ملک کو اپنی پناہ میں رکھے آمین۔

✍ : نگین! اب جلدی سے اپنا ایڈریس کنفرم کردو میں دوشیزہ پابندی سے بھیجوں گی۔ اور تمہاری تحریر مل گئی ایک تحریر اس شمارے میں شائع بھی کردی اب تو خوش......

✉ : یہ خط آیا ہے ڈسکہ سے اور لکھتی ہیں نسیم سکینہ صدف...... پیاری منزہ اسلام علیکم! سیاہ گھٹائیں چھائی تھیں مست ہواوں نے پورے ڈسکہ کو حصار میں لے رکھا تھا۔ ایسے میں دوشیزہ ملا تو مانو ساون کی رونق دوبالا ہوگئی۔ میں کچن میں پکوڑے تل رہی تھی اور ساتھ میری لاہور سے آئی بہن کلثوم سوجی دودھ اور انڈے چینی ملا کر میٹھے پوڑے بنا رہی تھی۔ اسی رونق میں دوشیزہ کے ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی دل خوش ہوگیا خوبصورت ماڈل گرل کو توصیفی نظروں سے دیکھ کر صفحہ پلٹا تو منزہ جی کا... کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا... بہت خوبصورت اور جامع تحریر تھی. غلام جو سردار بنے...... ایک ایمان روشن تحریر تھی.. پھر دوشیزہ کہ محفل میں اترے تو رنگ رنگ کے ڈریسز میں میری بہت پیاری سہلیاں محو گفتگو تھیں. پڑھ کے مزہ آیا۔ اور جناب پھر محفل دوستاں میں خوبصورت پریاں اپنے رنگ بکھیر رہی تھیں. دل میں آیا کاش کبھی میں بھی اس محفل کا حصہ بنوں۔ افسانوں میں سب سے پہلے منزہ جی کا افسانہ...... دیس میں پردیس...... پڑھا ویل ڈن. منزہ جی...... اتنا خوبصورت افسانہ...... رضوانہ پرنس نے بھی عید پر یہ افسانہ لکھ کے چار چاند لگادیے۔ طیبہ عنصر مغل کا افسانہ پڑھ کے ایک دکھ کی لہر پورے بدن میں پھیل گئی کہ بے روزگاری انسان کو کیا کیا کرواتی ہے اب تک اتنا ہی پڑھا ہے۔

✍ : اچھی سی نسیم! تمہارے خط سے مجھے ایک بہت اچھی ریسپی تو مل گئی اب ضرور بناؤں گی۔ میرا افسانہ اور اداریہ پسند کرنے کا شکریہ۔ رضوانہ پرنس اور طیبہ عنصر تک آپ کی تعریف پہنچا دی ہے۔

اور اس آخری خط کے ساتھ اب اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے دوشیزہ کے حصول میں اگر کوئی بھی دشواری ہے تو مجھے ضرور آگاہ کیجیے...... خوش رہیے خوش رکھیے۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

اپنی ایڈیٹر سے رابطہ کیجیے اور اپنی رائے کا اظہار کریں۔

0304-3168708 / 021-35893121-22 / اوقات صبح 11:30 سے شام 04:30

شیف محبوب خان

جن کے ہاتھ کا بنا کھانا انگلیاں چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے

مونی خان

کھانا پکانا عام طور سے دنیا بھر میں خواتین کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے لڑکی کتنا پڑھ لکھ لے اگر اس کو اچھا کھانا پکانا نہیں آتا تو اُس کو پھوہڑ تصور کیا جاتا ہے۔ برصغیر میں تو خاندانی ہونے کا معیار ہی لڑکی کو کھانا پکانے میں طاق ہونا مانا جاتا ہے۔ جو کام لڑکیاں ہوش سنبھالتے ہی سیکھنا شروع

کر دیتی ہیں اور وہ ان کے فرائض میں شامل ہوتے ہیں مرد سیکھنے کے لیے بڑی جدوجہد کرتے ہیں اور اس فن میں ماہر کو شیف کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی بہترین شیف موجود ہیں وہ سب مرد ہیں لیکن پاکستان میں معاملہ مختلف ہے۔ آج ہم آپ کی ملاقات پاکستان کے مشہور شیف جن کا

شمار پاکستان کے دس بہترین شیف میں ہوتا ہے کررواہے ہیں۔ جی ہاں ہم آپ کو ملوا رہے ہیں شیف محبوب خان سے جن کا پورا نام محبوب مندوخیل ہے تعلق پٹھان فیملی سے ہے لیکن کراچی

میں ہی پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ شیف

محبوب جنوری 1969 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ ARY ذوق سے اپنا شو پیش کرتے ہیں جو خواتین میں بے حد مقبول ہے۔ شیف محبوب پاکستانی چائنیز اور ایشیائی کھانوں کے استاد مانے جاتے ہیں۔ ان کے کھانوں میں مزے کے ساتھ صحت کے تمام اصولوں کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ کھانوں میں ذائقہ بھی ہو اور غذائیت بھی یہ شیف محبوب کا ہی کمال ہے۔ انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ 'فوڈ فار لائف' جس میں موجود تراکیب پر عمل کرنے والا کبھی بھی صحت پر سمجھوتہ نہیں کرتا...... وزن بڑھنے کا بھی کوئی ڈر نہیں ...... ہم سب نے شیف محبوب کی بیگم کو بھی ان کے ساتھ ایک اشتہار میں دیکھا ہے۔ دونوں ساتھ بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور اس اچھے سے کپل کی ایک پیاری سی بیٹی بھی ہے۔ تو جو خواتین چاہتی ہیں کہ ان کے کھانے مزے دار بھی ہوں اور غذائیت سے بھی بھرپور ہوں وہ شیف محبوب خان کی تراکیب کو ضرور آزمائیں۔

☆☆......☆☆
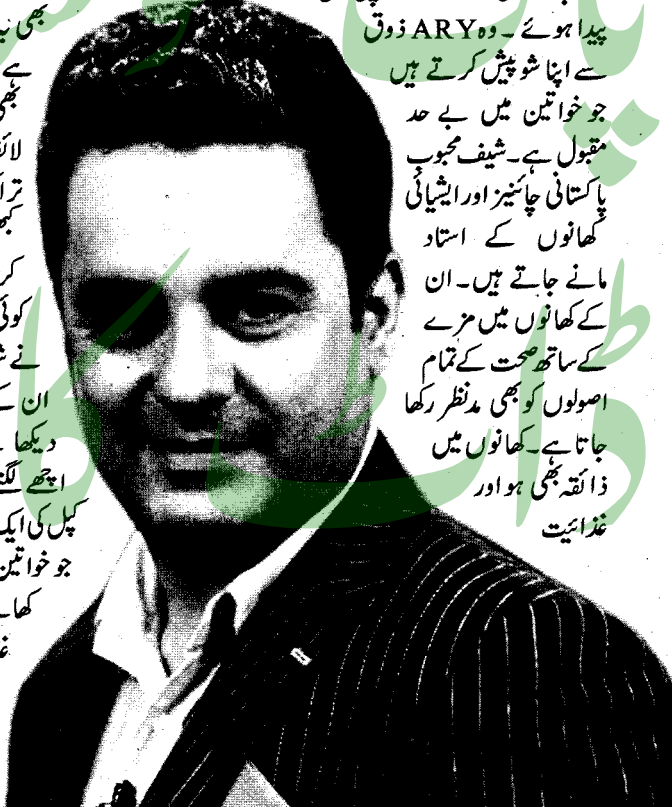
ماہرہ خان

دلنشین ماڈل واداکارہ جن سے ملاقات یقیناً آپ کی خواہش ہوگی

دوشیزہ کے دیرینہ ساتھی اور قلم کار (م۔ش۔خ) کے قلم سے

معروف ماڈل اور اداکارہ ماہرہ خان کا نام اس میں کوئی شک نہیں سپر اسٹار فنکاروں میں آتا ہے وہ بھی انڈو پاک میں اس وقت پاکستان میں اگر نمبر ون ہیروئن کا اعزاز کسی کے پاس ہے تو وہ ماہرہ جی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ رخ کے ساتھ فلم ''رئیس'' میں انہوں نے بہت محتاط ہوکر کام کیا اور ہمارے معاشرے کی روایات کی پاسداری کا خاص خیال رکھا۔ مزے کی بات دیکھیں ٹی وی کی منی اسکرین ہو یا فلم کی بڑی اسکرین وہ دونوں جگہ قدآور نظر آتی ہیں کچھ عرصے قبل کی بات ہے وہ الحمرا ہال میں منعقد فیض انٹرنیشنل فیسٹیول میں آئیں تھیں۔

وہیں اُن سے ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے بہت جامع گفتگو کرکے ثابت کیا کہ وہ ایک سلجھی ہوئی آرٹسٹ ہیں ٹی وی شو کی میزبانی سے فنی زندگی کا آغاز کرنے والی ماہرہ خان نے بتایا کہ

ہدایت کار شعیب منصور کی فلم 'بول' نے مجھے حوصلے کی ایک نئی روشنی دی ان کے ٹی وی ڈراموں میں ہمسفر' شہر زاد' صدقے تمہارے اور بن روئے قابل ذکر ہیں۔ جبکہ فلموں میں بن روئے' منٹو اور ہومن جہاں نے

تاریخی کامیابی حاصل کی جبکہ بول فلم ان کی پہچان تھی ان فلموں کی ملک گیر کامیابی کی وجہ سے پڑوسی ملک نے اُن کا پرجوش استقبال کیا اور یوں ماہرہ خان کا خوبصورت فن سرحد کی دہلیز پار کر گیا۔ اداکارہ بننے کے حوالے سے وہ کہتی ہیں کہ مجھے بہت کم عرصے میں عزت اور شہرت ملی مگر میں ایک ماں بھی ہوں اور یہ کردار میرے لیے بہت اہم ہے میں نے بول کے ہدایت کار شعیب منصور کو بتا دیا تھا کہ میں ایک بچے کی ماں ہوں اور ویسے بھی بالغ نظری کا تقاضا یہ ہی ہے کہ آپ کچھ باتیں راز میں رکھ کر اپنے لیے مشکلات نہ پیدا کریں۔ کیونکہ میں اپنے بیٹے اذلان کو ممتا بھرا پیار بھرپور دینا چاہتی ہوں۔ ایک بات کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہیرو کو تو شائقین فلم بچوں سمیت برداشت کرتے ہیں مگر ہیروئن کے لیے اُن کے دل میں بس ایک ہی بات ہوتی ہے کہ وہ سنگل ہو' اب یہ بات تو زیادتی کے زمرے میں آتی ہے ڈرامے کے حوالے سے وہ کہتی ہیں ڈرامہ 'ہمسفر' میرا پسندیدہ ڈرامہ ہے جہد و جہد کے حوالے سے ماہرہ خان کہتی ہیں کہ اسٹار ایسے ہی نہیں بن جاتا بندہ بڑی محنت اور برداشت کرنا پڑتا ہے جب میں 15 سال کی تھی تو امریکہ گئی وہاں تعلیم حاصل کی اور اس دوران پارٹ ٹائم جاب بھی کرنا پڑی۔ شوبز میں آنا کیسا لگا کا جواب دیتے ہوئے اُن کا کہنا تھا میرے گھر والے شوبزنس کی دنیا کو اچھا نہیں سمجھتے تھے مگر میری سلیقہ مندی اور سسٹم کی وجہ سے وہ اب خوش ہیں بلکہ میں والدین سے کہتی ہوں خدارا آپ بچوں کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش کریں اگر کوئی انجینئر بنا

چاہتا ہے تو اُسے ڈاکٹر بنانے کی ضد نہ کریں۔
اپنے پسندیدہ ڈرامے 'صدقے تمہارے' کے حوالے سے انہیں ڈرامہ کا یہ ڈائیلاگ بہت

پسند آیا تھا۔
''محبت میں الہام نہ ہو تو فٹے منہ محبت کا......'' ڈرامہ 'شہرزاد' کے حوالے سے وہ کہتی ہیں اس میں مجھے بہت زیادہ محنت کرنا پڑی تھی اور اس میں میرا کردار بہت مشکل تھا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس مشکل کردار کو کر گئی کیونکہ جو

اسکرپٹ آپ کو بولنا ہے اس کے لیے آپ میں ہمت حوصلے کو یکجا کرنا پڑتا ہے اور ڈرامہ 'شہرزاد' کو شائقین شوبزنس نے بہت سراہا کامیڈی کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ مجھے بہت پسند ہے مگر اچھا کردار ملا تو سوچا جا سکتا ہے۔ ماہرہ خان کے ڈرامے 'ہمسفر' نے ماہرہ کی تقدیر بدل دی اس ڈرامے کی وجہ سے ماہرہ کو انڈیا میں شاہ رخ کے ساتھ فلم 'رئیس' کرنے کا موقع ملا کہ یہ ڈرامہ انڈیا میں آن ایئر ہوا تھا۔ اس میں سچائی کا سودا تو یہ کہتا ہے کہ ماہرہ انڈین اداکاروں سے کسی مقام پر بھی کم نہیں۔ انہوں نے فلم 'رئیس' میں اپنے آپ کو بڑی فنکارہ ثابت کیا اس میں کوئی شک نہیں کہ ماہرہ کمال کی اداکارہ ہے ماہرہ کہتی ہیں کہ میں اندازہ نہیں لگا پارہی تھی کہ شاہ رخ کو کیسے پہلی مرتبہ مخاطب کروں کہ یہ لوگ بہت ایڈوانس ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ سلام کروں یا ہیلو کہہ کر بات کا آغاز کروں مگر جب شاہ رخ سے سامنا ہوا تو انہوں نے بہت جما کر مجھے السلام علیکم کہا جبکہ میں حیرت زدہ تھی کہ مجھے سلام کرنا چاہیے تھا جبکہ پہل شاہ رخ نے کر دی شاہ رخ بہت بڑے اداکار ہیں اور وہ اداکاری کی درس گاہ ہیں۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا' پسند کے حوالے سے انہیں مادھوری بہت پسند ہیں جبکہ اُن کی فلم 'رئیس' نے سپرہٹ کامیابی حاصل کی اور انڈین ہیروئنز سوچ بچار میں ہیں کہ یہ کیسی تبدیلی پاکستان سے آئی ہے۔ ماہرہ خان کی صلاحیتوں کو شاہ رخ خان نے بھی نظر انداز نہیں کیا کیونکہ شاہ رخ جس مقام پر ہیں وہ کبھی بھی کسی نئی آرٹسٹ کے ساتھ کام نہیں کرتے مگر ماہرہ کے آڈیشن نے شاہ رخ کو سوچنے پر یقیناً مجبور کیا ہوگا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ سیاسی کشیدگی کی وجہ سے ہمارے پاکستانی فنکار

انڈیا میں بہت پریشان رہے اور ماہرہ خان کو بھی 'رئیس' کی شوٹنگ پر بہت محتاط رہنا پڑا ویسے ماہرہ کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے فلم 'رئیس' میں بہت سلیقے سے کام کیا اور پاکستانیوں کو کسی مقام پر شرمندہ نہیں کیا۔ خاص طور پر عریانیت کے حوالے سے ماہرہ نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا جبکہ ماضی میں ہماری کچھ ایکٹریس نے بہت عریاں اور گھٹیا کام کیے اور فلمیں بھی گھٹیا اور ناکام دیں جبکہ ماہرہ نے تعلیم یافتہ ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور 25 سال قبل زیبا بختیار نے انڈیا کی فلم 'حنا' کی تھی جو اپنے وقت کی سپرہٹ فلم تھی۔ اس کے بعد اب تک کسی ہیروئن نے انڈیا میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ہاں ماضی کی ہیروئنوں نے خود ساختہ بیان ضرور دیے مگر اُن کے کریڈٹ پر کوئی سپرہٹ فلم نہیں ہے۔

زیبا بختیار کے بعد انڈیا میں سپرہٹ کامیابی حاصل کرنے والی اب ماہرہ خان ہیں اور انہیں زیبا بختیار کے بعد یہ اعزاز ملا ہے۔

بولی وڈ والوں نے اُڑی حملے کے بعد پاکستانی فنکاروں پر اپنے دروازے بند کر دیے ہیں اور یہ بات تو شائقین فلم بھی محسوس کر رہے ہیں کہ ماہرہ خان کی 'رئیس' نے جو کامیابی حاصل کی اس سے انڈین ہیروئنیں کچھ خوفزدہ سی لگتی ہیں اور ان کے کیریئر خطرناک حد تک ڈوبتے نظر آتے ہیں۔ مگر اُڑی حملے کے بعد جو پابندی لگی ہے پاکستانی فنکاروں پر تو یقیناً وہاں کی ہیروئنوں نے طویل ٹھنڈا اور سکھ بھرا سانس لیا ہوگا۔ ماہرہ خان بہت باصلاحیت اداکارہ ہے اُس کی پاکستان میں بھی فلموں نے زبردست کامیابی حاصل کی ہیں۔

فواد خان' عاطف اسلم اور ماہرہ خان انڈیا والوں کے لیے ہارٹ کیک کی شکل اختیار کر گئے تھے مگر اُڑی حملے کی وجہ سے ناچاقی نے گھیرا تنگ کر کے باصلاحیت فنکاروں کے راستے روکے ضرور ہیں مگر ماہرہ خان آج بھی پاکستان میں ہارٹ کیک ہیں کہ اُن کے چاہنے والے ہر دم اُن کے گیت گاتے ہیں اور اُن کی سحر انگیز اداکاری کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ پرانی دعوے کرنے والی ہیروئنوں کا زمانہ اب اختتام کی منزل کو پہنچا۔

تنہائی کا زہر

قسط نمبر 1

ایک ایسی مضبوط لڑکی کی داستان جو زندگی سے لڑ کر جیتنا
چاہتی تھی' الجھنوں کو سلجھنوں سے تبدیل کرتی خوش رنگ تحریر

''زاریہ بیٹی تمہارے پیپرز تو ختم ہو گئے ہیں۔ اب کیا کرنا چاہتی ہو تم؟'' امی نے اپنے کمرے میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھنے میں منہمک زاریہ سے پوچھا۔

''اوہ امی آپ...... مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ آپ کب کمرے میں داخل ہوئیں۔ دراصل اس قدر دلچسپ کتاب ہے کہ ارد گرد کا ہوش ہی نہیں رہتا۔'' زاریہ نے جلدی سے کتاب کا صفحہ موڑ کر اُس کو بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور پھر فوراً سیدھی ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' امی نے زاریہ کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر پوچھا۔

''فی الحال تو ریسٹ کرنے' کتابیں پڑھنے' گھومنے پھرنے اور خوب ڈھیر سارا سونے کا ارادہ ہے، میرا خیال ہے کہ رزلٹ تک تو یہی ایکٹوٹیز رہیں گی۔'' زاریہ نے نہایت اطمینان سے کہا۔

''میری جان' میری چندا تم نے ایم ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ کوئی میٹرک کے امتحان سے فارغ نہیں ہوئی ہو۔ جو اتنی بے فکری اور لاپرواہی سے وقت گزارنے کے منصوبے بنا رہی ہو۔ اب تم ٹین ایج نہیں بلکہ خیر سے 23 سال کی ہو چکی ہو اور یہی عمر ہوتی ہے لڑکیوں کی شادی کی۔ بلکہ میری شادی تو بیس سال کی عمر ہی میں ہو گئی تھی۔ تم بس کچھ دن ریسٹ کر کے گھر داری سیکھو۔ کیونکہ سسرال والے ہی ہوتے ہیں لڑکی خواہ کتنا ہی پڑھی لکھی کیوں نا ہو۔ وہ اُس سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ گھر کے کام کاج اور کھانا کھانے میں بھی ماہر ہو اور صاحبزادی ہیں کہ چائے تک بنانی نہیں آتی۔'' امی نے زاریہ کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''اوہ ہوں امی آپ کا بس چلتا نا تو آپ مجھے میٹرک کے فوراً بعد ہی گھر داری کے جھنجٹ میں ڈال کر مزید پڑھنے ہی کے قابل نا چھوڑتیں وہ تو ابو نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ اور

جس کی وجہ سے آج میں فزکس جیسے ٹف سبجیکٹ میں ایم ایس سی کرسکی۔''

''ہاں ٹھیک ہے تمہارے ابو نے تمہارا ساتھ دے دیا نہ اب میری بات مانو سسرال والوں کو اپنا بنانے کے گُر سیکھنا بہت ضروری ہوتے ہیں۔''

''آپ تو بچپن ہی سے مجھے سسرال والوں کے ہونے سے ایسے ڈرا رہی ہیں۔ جیسے وہ کوئی بہت ہی خوفناک مخلوق ہو۔ سچ پوچھیے تو مجھے تو اب شادی کے نام سے ہی ڈر لگنے لگا ہے کہ شادی کے بعد بقول آپ کے بے رحم سسرال والوں سے واسطہ پڑے گا جو ہم جیسے گوشت پوست کے انسان نہیں بلکہ کسی اور ہی سیارے کی مخلوق ہوتے ہیں اور وہ اُسی انتظار میں ہوتے ہیں کہ کوئی بے چاری بہو آئے تو اُسے چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔ یا پھر اُسے اذیتوں کی سوئی پر لٹکا دیں ہیں نا امی؟'' زاریہ نے شرارت سے مسکرا کر امی سے پوچھا۔

''ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ تمہارا بچپنا کب جائے گا۔'' امی نے زچ ہو کر کہا۔

''مگر امی لوگ کہتے ہیں کہ بچے خواہ بوڑھے ہو جائیں وہ والدین کے لیے بچے ہی رہتے ہیں۔ اس لیے میرے بچپنے کے ختم ہونے کا تو بھول ہی جائیں۔ اور وہاں فی الحال میری شادی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیجیے کیونکہ فی الحال میرا شادی وادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں رزلٹ آنے کے فوراً بعد کسی کالج میں ملازمت کرنی چاہوں گی۔ پھر ایم فل اور اس کے بعد پی ایچ ڈی آپ جانتی ہیں نا کہ ڈاکٹر بننا اور ڈاکٹر کہلانا میرا بچپن کا خواب ہے۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تو نا بن سکی۔ البتہ اب پی ایچ ڈی ڈاکٹر تو ضرور بنوں گی۔ اور اس سارے پراسس میں بہت زیادہ نہیں تو سات آٹھ سال تو لگ ہی جائیں گے۔ سو تب تک شادی کو گڈ بائے۔'' زاریہ نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں...... ہاں ضرور بنو پی ایچ ڈی ڈاکٹر' شوق سے نوکری کرو اور ایم فل تیم فل کرو اور اس عرصے میں تمہاری عمر کہاں پہنچ جائے گی۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں تیس سال سے اوپر ہو جاؤ گی۔ تب کون تم سے شادی کرے گا۔ ابھی پچھلے دنوں ہی وہ رشتے کروانے والی سعیدہ آپا کہہ رہی تھیں کہ ہم نے تمہیں سولہ جماعتیں پڑھا کر بہت غلطی کی ہے۔ اب بھلا تمہارے لیے وہ رشتہ کہاں سے ڈھونڈے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ لڑکی پڑھ پڑھ کر بوڑھی ہوگئی ہے۔'' امی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''اُف امی یہ آپ چھچھور قسم کی رشتے کروانے والی عورتوں سے تو جان چھڑائیں۔ بڑے ہوئے جاہل گنوار لوگوں کے رشتے لے کر آتی ہیں۔ اور ان کی پوری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اُلٹے سیدھے جھوٹ سچ کی آمیزش سے لوگوں کی بیٹیوں اور بیٹوں کو کہیں نا کہیں پھنسا کر اپنے پیسے کھرے کر کے چلتی بنیں۔ پھر خواہ لوگ رو کر زندگی گزاریں یا ہنس کر اُن کی بلا سے۔'' زاریہ نے قدرے غصے سے کہا۔

''کیا کروں بیٹی مجبوری ہے۔ رشتے داروں میں جو لوگ اچھے اور مخلص ہیں اُن کے ہاں کوئی لڑکا تمہارے مطابق نہیں ہے۔ دور پرے کے کچھ عزیزوں میں جو لڑکے قابل اور پڑھے لکھے ہیں اُن کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ اُن کو اپنی اہمیت کا احساس ہے۔ اس لیے وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہیں۔ ہم جیسوں کو کون پوچھتا ہے۔ شہر کے پسماندہ علاقے میں چھوٹا سا پانچ مرلے کا مکان ہے۔ باپ ایک گیارہ اسکیل کا کلرک ہے۔ بھائی چھوٹا ہے۔ اور ابھی پڑھ رہا ہے۔

لوگ تو بیٹی نہیں لیتے اُس کے ساتھ ڈھیروں جہیز بھی وصول کرتے ہیں۔ شرافت، سادگی، سیرت، اچھی شکل وصورت اور تعلیم وتربیت کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ لڑکیوں کو تعلیم دلاؤ تب مصیبت نہ دلاؤ تب مصیبت...... ان حالات میں ان رشتے کروانے والی عورتوں کا دم ہی غنیمت ہے۔ شادی دفتر والوں کی طرح جھوٹ بولتی ہیں نا دھوکا دیتی ہیں کیونکہ انہوں نے ہم لوگوں کے ساتھ اسی علاقے میں رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے جو بھی صورت حال ہو صاف طور پر بیان کردیتی ہیں۔'' امی نے قدرے بوجھل لہجے میں کہا۔

'' امی پلیز میری اچھی سی امی آپ پریشان نا ہوں۔ میں نے اتنی محنت سے تعلیم حاصل کی ہے۔ میں اپنی تعلیم سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گی۔ بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گی۔ ابھی تو وہ بی اے میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ ایم بی اے کرے تاکہ اُسے بینک میں یا کسی غیر ملکی ادارے میں اچھی سی ملازمت مل سکے۔ پھر ابا بھی بیمار رہتے ہیں۔ اُن کا علاج بھی کروانا ہے۔ ابا کی تنخواہ سے تو بمشکل گھر کے اخراجات ہی پورے ہوتے ہیں۔ وہ بھی آئے روز دفتر سے ایڈوانس لے کر گزارا ہوتا ہے۔ ابا اپنی طرف تو دھیان ہی نہیں دیتے۔ دفتر سے آکر شام کو غفور چاچا کے اسٹور پر رات گئے تک کام کرتے ہیں۔ تاکہ ہم دونوں بہن بھائی کی پڑھائی کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ انہیں آرام کرنے کا وقت ہی کب ملتا ہے۔ بھی تو ہر وقت کھانستے رہتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر کو نہیں دکھاتے کہ ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ شکر ہے کہ خدا خدا کرکے میری تعلیم مکمل ہوئی ہے۔ میں ابا کی بیٹی نہیں بلکہ بیٹا ہوں۔ جب بیٹے تعلیم حاصل کرکے ملازمت کرکے اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں تو بیٹیاں کیوں نہیں۔ پلیز امی جب تک بھائی اپنی تعلیم مکمل کرکے کمانے نہیں لگ جاتا تب تک میری شادی کے بارے میں سوچیے گا بھی نہیں۔''

زاریہ نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

'' میں نے کیا سوچا ہے...... تمہارے ابا ہی ہر وقت فکرمند رہتے ہیں وہ اپنی بیماری کی وجہ سے بہت مایوس اور متفکر ہیں چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی میں تمہیں اپنے گھر میں آباد دیکھ لیں۔ وہ تو ہر وقت ایسی ہی ڈرانے والی باتیں کرکر کے مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں۔''

'' امی آپ ابا کو سمجھایا کریں کہ وہ اس قدر فکر نا کیا کریں۔ میری قسمت میں ہوگا تو ہوجائے گی میری شادی بھی ...... میں نے شادی سے انکار کب کیا ہے۔ بس چند سال کے لیے میں اپنے گھر کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ پھر آپ جس مرضی گامے ماجھے سے میری شادی کروادیجیے گا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ابا کو کوئی سیریس بیماری نہیں ویسے ہی موسم کے تغیر کی وجہ سے فلو وغیرہ ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کھانسی آتی ہے چائے بھی تو بہت پیتے ہیں نا۔ میں کسی دن انہیں اسپتال لے جاکر اُن کا مکمل معائنہ کرواؤں گی تاکہ اُن کی تسلی ہوجائے۔ ابھی اُن کی عمر ہی کیا ہے۔ پچپن چھپن سال تو اتنی زیادہ عمر نہیں کہ وہ خود کو بوڑھا اور بیمار سمجھنے لگیں۔''

'' تم ٹھیک کہتی ہو زاریہ بیٹی، لیکن باپ ہیں نا بیٹی اور وہ بھی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کے مستقبل کی فکریں تو ستاتی ہی ہیں نا۔ لڑکیاں جتنا مرضی پڑھ لکھ جائیں کتنی ہی ذہین کیوں نا ہوں، جب تک اپنے گھر کی نا ہوجائیں ماں باپ کا سکھ چین اور اُن کی نیندیں حرام ہی رہتی ہیں۔'' امی نے اذان

کی آواز سن کر دوپٹا سر پر اوڑھتے ہوئے کہا۔ اور پھر وضو کرنے کی غرض سے باتھ روم کی جانب چل پڑیں۔ جبکہ زاریہ اذان کا جواب دینے کے بعد دونوں ہاتھ اُٹھا کر رب کریم سے اپنے والدین کی سلامتی، خوشیوں اور اپنے بھائی کی صحت و کامیابی کے لیے دعا کرنے لگی۔

''آپی کہاں ہیں آپ یہ دیکھیے میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں؟'' ذیشان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ک...... کیا...... کیا لائے ہو؟'' زاریہ نے ذیشان کو دیکھ کر پوچھا اور پھر بولی۔

''یہ تم اتنی دیر سے کالج سے کیوں آئے ہو اوپر سے عصر کی اذانیں شروع ہوگئی ہیں۔''

''وہ دراصل میں اپنے دوست فہیم کے ساتھ اردو بازار چلا گیا تھا۔ اُس نے کچھ کتابیں خریدنی تھیں اور پھر وہیں ایک بک شاپ پر Fyodor Dostoyevsky کے ناول کرائم اینڈ پنشمنٹ پر نظر پڑی تو میں نے فوراً خرید لیا کیونکہ آپ کافی دنوں سے اس ناول کو پڑھنے کی خواہش ظاہر کر رہی تھیں۔'' ذیشان نے سفید شاپر میں سے ناول نکال کر زاریہ کی جانب بڑھایا۔

''او شکریہ میرے پیارے بھائی...... یہ تم نے بہت اچھا کیا..... آج کل میں فارغ ہونے کی وجہ سے خاصی بوریت محسوس کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کسی دن نورین کو فون کروں گی کہ وہ آجائے تاکہ انارکلی کا چکر لگا کر وہاں موجود اولڈ بکس شاپ سے کچھ کتابیں خرید سکوں۔ مگر اب کافی دن تو میرے اس ناول کے مطالعہ میں گزر جائیں گے۔ ویسے بھی آج کل امی مجھے گھر کے کام بھی کرنے کے لیے کہتی رہتی ہیں۔ سوچتی ہوں اُن کا ہاتھ بھی بٹا دیا کروں۔ بے چاری اکیلی ہی سارے کام کرتی ہیں۔ ہاں مگر کیا کروں کہ یہ مشکل گھریلو کام کرتے ہوئے میری جان جاتی ہے۔ امی کی ہمت ہی ہے کہ یہ سارے کام کر کے بھی ہشاش بشاش رہتی ہیں۔ میرے لیے تو کچن میں چند منٹ کھڑے ہو کر چائے بنانا بھی عذاب ہوتا ہے۔'' زاریہ نے ذیشان کے ہاتھ سے ناول لے کر کہا۔

''آپی امی کہتی ہیں پہلے زیادہ رواج نہیں تھا لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا بس واجبی سی تعلیم کے بعد شادی کر دی جاتی تھی پھر وہ لڑکی ساری زندگی گھرداری میں ہی گزارتی تھی۔''

''ہاں وہ دور ہی اچھا تھا۔ سیدھے سادھے سادگی پسند لوگ تھے۔ نا اس قدر مہنگائی تھی نا ہی ایسی آپا دھاپی...... اب تو سارا معاشرہ ہی مادہ پرست ہوگیا ہے۔ صرف اُن کی عزت ہے، جن کے پاس روپے پیسے کی فراوانی ہے۔ ہم جیسے نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کی تو کوئی اہمیت ہے نا ضرورت سبھی پیسے والوں اور اونچے عہدوں والوں کو عزت اور احترام دیتے ہیں۔'' زاریہ نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں آپی...... انشاء اللہ ہم بھی اونچے طبقے میں شامل ہوجائیں گے بس میری تعلیم مکمل ہوجانے دیں۔ میں سعودی عرب یا انگلینڈ چلا جاؤں گا۔ اور وہاں سے ڈھیر سارا پیسہ کما کر بھیجا کروں گا۔ پھر ہمارا بھی گلبرگ یا ماڈل ٹاؤن میں بڑا سا گھر ہوگا۔ گاڑیاں اور نوکر چاکر ہوں گے۔ پھر میں کسی امیر ترین گھر میں آپ کی شادی کروں گا۔ اور اپنی شادی بھی کسی بے حد دولت مند خاندان کی لڑکی سے کروں گا۔ جو ڈھیروں ڈھیر جہیز لے کر آئے۔'' ذیشان نے جوش سے کہا۔

''مگر یہ شہروز کہاں غائب ہے نظر ہی نہیں آیا۔'' زاریہ نے فکرمندی سے کہا۔

''آپی آج ایک بات بتا ہی دیں جب میں آپ کا بھائی موجود تھا تو آپ نے خالہ سے شہروز کو کیوں مانگ لیا؟'' ذیشان نے زاریہ کو تولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرے پیارے بھائی تم تو میری جان ہو مگر شہروز مجھے اتنا پیارا لگتا تھا کہ میں اس کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی وہ بھی میرا عادی ہو گیا تھا اپنے گھر جا کر بس روتا ہی رہتا تھا تب خالہ نے کچھ اس وجہ سے کہ وہ ہم سے زیادہ مانوس ہے اور کچھ اپنی بیماری کی وجہ سے اُسے مکمل طور پر میرے ہی حوالے کر دیا۔ ذیشان تم نے مجھے کن باتوں میں اُلجھا دیا جاؤ دیکھو کہاں ہے وہ؟'' زاریہ نے کتاب میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آپی بتا کر گیا ہے مجھے..... دوستوں کے ساتھ باغ جناح کی سیر کو نکل گئے ہوں گے۔ کل اتوار کی چھٹی ہے نا اس لیے ہفتے کی شام تو وہ ہر صورت میں جناح گارڈن میں گزارتے ہیں۔'' ذیشان نے شہروز کے متعلق بتایا۔

''ایک تو اس لڑکے نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ نا پڑھنے لکھنے کی جانب دھیان دیتا ہے۔ نا ہی اپنے اوٹ پٹانگ دوستوں کو چھوڑتا ہے۔ آٹھویں کلاس میں آچکا ہے۔ مگر پڑھائی کے لیے ابھی بھی سنجیدہ نہیں ہو رہا۔'' زاریہ نے متفکر لہجے میں کہا۔

''پلیز آپی مجھے ایک کپ چائے بنا دیں۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ صبح آنکھ بھی جلدی کھل گئی تھی۔ پھر اردو بازار میں اتنے رش اور شور و غل میں گھنٹوں پھرتے رہے۔'' ذیشان نے اپنی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے کہا۔

''تم ایسا کرو..... پیراسیٹامول لے کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔ میں عصر کی نماز ادا کر کے تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ چائے پی کر تم سو جانا کچھ دیر کے لیے۔'' زاریہ نے کہا۔

''جی بہتر.....'' یہ کہہ کر ذیشان اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اور زاریہ نماز ادا کرنے لگی۔

زاریہ بے چینی سے اپنے رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی جبکہ اُس کی امی عامرہ بیگم اُس کے لیے رشتے تلاش کر رہی تھیں۔ آئے روز نت نئے لوگ زاریہ کو دیکھنے کے لیے آتے رہتے اور پھر دوبارہ پلٹ کر نا آتے..... اب تو رشتے والی عورتیں بھی رشتے لاتے لاتے تنگ آچکی تھیں۔ عامرہ بیگم سے صاف صاف کہتیں۔

''اے عامرہ بی بی میں تو تمہاری بچی کو اپنی بیٹی سمجھ کر رشتے لاتی ہوں۔ اب لوگوں کے دماغ ہی بہت اونچے ہیں۔ پڑھے لکھے برسرروزگار لڑکے والوں کی ایک ہی ڈیمانڈ ہوتی ہے کہ لڑکی کا والد اور بھائی اونچے عہدوں پر ہوں۔ یا بڑے کاروباری لوگ ہوں بڑا سا وہ موا کیا کہتے ہیں گل برگ یا ڈی فینانس میں گھر ہو نوکر چاکر ہوں گاڑیاں ہوں پیسے کی ریل پیل ہو اب ان پرانے علاقوں کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں پانچ مرلے کے ڈربے نما گھروں میں کون آنا پسند کرتا ہے اور بی بی برا نا ماننا۔'' وہ ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی آواز کو قدرے دبا کر کہتی۔

''تمہاری بیٹی شکل و صورت کی بھی بس ایسی ہی ہے۔ رنگ بھی زیادہ صاف نہیں۔ لوگ تو اونچی لمبی گوری چٹی، تیکھے نین نقشوں والی حسین و جمیل لڑکیاں مانگتے ہیں۔ اسی لیے جو بھی لوگ

آتے ہیں منہ بنا کر اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو علاقے کا نام سن کر اور یہ جان کر کہ لڑکی کا باپ کیا ہے وہ ہاں کلرک ہے تو یہاں آنے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ لڑکی کی پڑھائی کی وجہ سے آجاتے ہیں تو انہیں نا لڑکی پسند آتی ہے۔ نا تمہارا گھر بار...... اب بتاؤ میں کیا کروں۔''

''مگر بوا یہ تو دیکھو کہ آخر ان علاقوں میں رہنے والی لڑکیوں کی بھی تو شادیاں ہوتی ہیں نا...... اگر لوگ روپیہ پیسہ شکل و صورت ہی دیکھنے لگیں اور لڑکی کی تعلیم، سیرت اور اخلاق و کردار کو مدنظر نا رکھیں تو پھر تو بہت سی لڑکیاں یونہی بیٹھی رہیں جبکہ میں تو آئے روز دیکھتی ہوں کہ لوگوں کی بیٹیوں کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ کوئی بیاہ کر امریکہ جا رہی ہے تو کوئی انگلینڈ اور کوئی سعودی عرب...... وہ لوگ تو یہ سب کچھ نہیں دیکھتے جو تم بتا رہی ہو۔'' عامرہ بیگم قدرے تلخ لہجے میں بولیں۔

''تم صحیح کہتی ہو بی بی ...... مگر اُن سب لڑکیوں میں کوئی نا کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے۔ کسی کی شکل و صورت اتنی اچھی ہوتی ہے کہ لوگ باقی سب کچھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے کاروبار اچھے ہوتے ہیں روپیہ پیسہ بھی بہت ہوتا ہے۔ اور یوں ہی شروع سے اس علاقے میں رہنے کی وجہ سے اپنا علاقہ نہیں چھوڑتے...... کچھ لڑکیوں کے باپ بھائی باہر گئے ہوئے ہیں۔ یا پھر بڑی بڑی سرکاری نوکریاں کرتے ہیں یا پھر اپنے عزیز رشتے دار ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنوں ہی میں رشتے کرنا پسند کرتے ہیں۔ پھر لڑکیاں اکثر زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوتیں۔ اگر ہوں بھی تو اُن لوگوں کی یہ شرط نہیں ہوتی کہ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، اچھے عہدے پر ہو، اپنا گھر بار ہو یا پھر اپنا کاروبار ہو۔ تو جب لوگ صرف یہ سوچتے ہیں کہ جو بھی لڑکا ہو جیسا بھی ہو، بس بروقت بیٹی کے بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں تو ایسے لوگوں کو رشتوں کا کوئی کال نہیں ہوتا۔ لوگ نا تو لڑکے کی عمر دیکھتے ہیں نا شکل و صورت اور نا ہی قد کاٹھ...... جب تم چاہتی ہو کہ لڑکا بہت زیادہ پڑھا لکھا بھی ہو رہتا بھی اچھے علاقے میں، شکل و صورت کا بھی اچھا ہو، روپیہ پیسہ بھی کھلا ہو تو پھر ایسے لوگ کہاں اِدھر کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ اپنا معیار کم کرو، ورنہ میں یہ کہے دیتی ہوں کہ کچھ اور وقت گزر گیا اور لڑکی کی عمر بڑھ گئی تو پھر تو کوئی بھی اسے قبول نا کرے گا۔''

''بوا اس طرح تو بات نا کرو۔ آخر تم بھی بیٹیوں والی ہو۔ میری بیٹی میں ہزار گن ہیں۔ وہ نا تمہیں نظر آتے ہیں نا ان رشتے دیکھنے کے لیے آنے والوں کو...... اور اوپر سے تم ایسی اُلٹی سیدھی باتیں کرتی ہو، میں نے تمہیں اس لیے یہ کام سونپا تھا کہ تم ایک سمجھدار اور تجربے کار عورت ہو۔ بے شمار رشتے کروا چکی ہو، مگر تم نے بھی مجھے مایوس ہی کیا ہے۔'' عامرہ بیگم دلگرفتہ لہجے میں بولیں۔

''دیکھو عامرہ میری بہن تم جانتی ہو کہ میں نا خود جھوٹ بولتی ہوں۔ نا ہی جھوٹے لوگوں کو پسند کرتی ہوں۔ بغیر لگی لپٹی کے کھری کھری بات کرتی ہوں۔ کسی کو برا لگتا ہے تو لگتا رہے، میری بلا سے...... میں اتنے مہینوں سے تمہاری بیٹی کے رشتے کے لیے کوشش کر رہی ہوں۔ جو بھی اچھا رشتہ مجھے ملتا ہے۔ پہلے میں تمہارے گھر لاتی ہوں۔ اب اگر لوگ ہی یہاں رشتہ نا کرنا چاہیں تو میرا کیا قصور...... ہمارا کام تو دو خاندانوں کو ملوانا ہوتا ہے۔ باقی معاملات تو لوگوں نے خود ہی طے کرنے ہوتے ہیں۔ نا مجھے کسی سے کچھ لینے کا

لالچ ہے نا ہی کوئی اُلٹا سیدھا مطالبہ کرتی ہوں جو کوئی اپنی خوشی سے دے دے لے لیتی ہوں۔ اور لوگ بھی میرا حق نہیں رکھتے۔ میں اُن پیشہ ور عورتوں کی طرح نہیں جو ہر پھیرے پر چائے پانی اور کرائے کے نام پر ہزاروں روپے اینٹھ لیتی ہیں۔ اور رشتہ لانے کے نام پر آئیں بائیں شائیں کرنے لگتی ہیں۔'' آمنہ بوا بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

''میں جانتی ہوں بوا تم ایک اچھی اور مخلص انسان ہو۔ اسی لیے تمہارے علاوہ میں نے باقی سب رشتے کروانے والیوں کو جواب دے دیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تم کافی رشتے لا چکی ہو۔ اب میری بیٹی کی قسمت کی بات ہے۔ جب اللہ کی مرضی ہوگی تو وہ اُس کے لیے کوئی نا کوئی ایسا رشتہ ضرور بھیج دے گا۔ جو اُسے ہنسی خوشی قبول کرلے...... بس تم اپنی کوشش کرتی رہو جب تک بیٹا پڑھ رہا ہے ہم نا کسی اچھے علاقے میں گھر لے سکتے ہیں نا ہی ہماری آمدنی کا کوئی اور وسیلہ ہے۔ ایک باپ کمانے والا ہے۔ بس کسی طرح اللہ کا شکر ہے دال روٹی چل رہی ہے۔ بیٹا پڑھ لکھ کر کمانے لگے گا تو گھر کے حالات بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بہتر ہو جائیں گے۔ مگر تب تک میں بیٹی کو تو گھر میں نہیں بٹھا سکتی نا۔ پہلے ہی اُس کی عمر نکلتی جا رہی ہے۔ اور کچھ سال یونہی گزر گئے تو پھر پانی بالکل ہی سر سے اونچا ہو جائے گا۔ اور بوا میں تمہاری کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ اور تمہارا حق نہیں رکھوں گی تم فکر نا کرو۔ اور ہاں بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بنا کر لے آؤں۔ دراصل زاریہ بیٹی آج یونیورسٹی گئی ہے۔ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اپنے رزلٹ کا پتہ کرنے...... آج کل میں اُس کا رزلٹ بھی آنے والا ہے۔'' یہ کہہ کر عامرہ بیگم کچن میں چلی گئیں۔ چائے بنائی ایک پلیٹ میں بسکٹ ڈالے' رات کو زاریہ نے بیسن کا حلوہ بنایا تھا۔ وہ ایک پلیٹ میں ڈالا۔ ساتھ میں 4 کیلے اور دو سیب الگ شاپر میں ڈال لیے۔ کمرے میں جا کر پرس سے دو سو روپے نکالے اور پھر صحن میں چارپائی پر نیم دراز آمنہ بوا کے پاس آ گئی۔ ایک تپائی پر چائے اور دوسرے لوازمات رکھے۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے بہن عامرہ...... چائے کی سخت طلب محسوس ہو رہی تھی۔ صبح سے گھر سے نکلی ہوئی ہوں۔ کیا کروں روزی روٹی کے لیے بھاگ دوڑ کرنی ہی پڑتی ہے۔ اور تم تو جانتی ہو کہ میں خود تو منہ پھاڑ کر کسی سے کوئی چیز مانگتی نہیں ہوں۔ تمہاری طرح کی کوئی نیک بی بی اپنی مرضی سے چائے پانی کا پوچھ لے تو انکار نہیں کرتی۔ مگر ایسے لوگ کم کم ہی ہوتے ہیں۔'' آمنہ بوا نے دو سو روپے لے کر اپنے بڑے سے پرس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ سیب اور کیلے کا شاپر بھی پرس کے ایک خانے میں سمایا اور پھر چائے کا کپ پکڑ کر سڑک سڑک کر چائے پینے لگی اور ساتھ ساتھ بسکٹوں اور حلوے پر بھی ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیے۔

شام کو زاریہ یونیورسٹی سے واپس آئی تو وہ بہت خوش تھی۔ اُس نے فرسٹ ڈویژن میں ایم ایس سی کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ عامرہ بیگم' والد سعید احمد دونوں بھائیوں ذیشان اور شہروز نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ اور پھر شہروز کی فرمائش پر ذیشان اُسے ساتھ لے کر مٹھائی لینے چلا گیا۔ ذیشان چونکہ کالج کے بعد ایک دو گھروں میں بچوں کو ہوم ٹیوشن بھی پڑھانے جاتا تھا۔ اس لیے اُس کے پاس اپنے ضروری اخراجات کے بعد کافی پیسے ہوتے تھے۔ جو وہ اکثر شہروز اور زاریہ

کر دیتا رہتا تھا۔ آج اُس نے اُن پیسوں سے بہت سی مٹھائی خریدی۔ پھر زاریہ کا پسندیدہ آلمنڈ کیک، نمکو، سموسے، جلیبیاں، چرغہ، روغنی نان، بچھے کے پائے اور دوسری بہت سی چیزیں خریدیں، جب ذیشان اور شہروز لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے تو عامرہ بیگم نے حیران ہو کر کہا۔

''ارے بیٹا تم تو پورا بازار ہی خرید لائے۔ اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس......''

''بس اماں اپنی بہنا کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی نا کوئی سبب بنا ہی دیا۔ آپ آم کھائیں، پیڑ نا گنیں......کبھی کبھی تو زندگی میں خوشی کا موقع آتا ہے تو اس کو خوب انجوائے کرنا چاہیے، حساب کتاب کے چکر میں نا ہر وقت پڑی رہا کریں۔'' ذیشان نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''امی میں تو پہلے سارے محلے میں مٹھائی بانٹوں گا۔ تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ میری بہنا نے کتنے شاندار طریقے سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا ہے۔'' شہروز چہک کر بولا۔

''ضرور بیٹا محلے والوں کو تو اپنی خوشی میں شریک کرنا لازم ہے ہم پر......زاریہ بیٹی کچن سے پلیٹیں نکال کر لاؤ۔'' اور پھر زاریہ اور عامرہ بیگم نے مٹھائی کی ٹوکری کھول کر پلیٹوں میں مٹھائی ڈالی۔ ایک بڑی ٹرے میں جتنی پلیٹیں آسکتی تھیں وہ رکھیں اور ٹرے پر خوبصورت کڑھائی والا لیس لگا سفید رنگ کا دسترخوان ڈالا اور شہروز خوشی سے گلنار چہرے کے ساتھ آس پاس کے گھروں میں مٹھائی بانٹنے کے لیے چلا گیا۔ محلے میں مٹھائی بانٹنے کے بعد زاریہ نے چائے بنائی اور سب نے ذیشان کی لائی ہوئی چیزیں کھائیں۔ رات کے کھانے میں پائے اور نان سے دعوت اڑائی۔ اور یوں آج کا دن سعید منزل میں خوشی سے بھرپور گزرا۔

دوسرے دن محلے کی عورتیں مبارک باد دینے آئیں کوئی اپنے ساتھ مٹھائی لائی۔ کسی نے زاریہ کو حسب توفیق پیسے دیے۔ کسی نے سوٹ اور کسی نے کوئی اور تحفہ...... یہ پرانے محلوں اور علاقوں کے رواج بہت اچھے تھے۔ لوگ مل جل کر رہتے تھے ایک دوسرے کے دکھ اور خوشی میں شامل ہوتے تھے۔ اور یوں اپنائیت اور بھائی چارے کی فضا پروان چڑھتی تھی۔

مگر پھر رفتہ رفتہ شہر پھیلتے گئے۔ جدید بستیاں بنتی گئیں لوگ پیسے کی دوڑ میں شامل ہو کر مادہ پرست ہوتے گئے۔ اور اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ ان جدید آبادیوں میں ہمسائے کو ہمسائے کی خبر نہیں ہوتی۔ کوئی خوش ہے یا دکھی کسی کو پرواہ نہیں آج کل ہر کوئی اپنی چار دیواری میں اپنے گھر میں مگن ہے۔ ہر کوئی اپنے جیسے محدود حلقے میں موو کرتا ہے۔ ہمسائے اور ہمسائے کے حقوق سے کوئی بھی سروکار نہیں رکھتا۔ کیونکہ مذہب سے دوری کے ساتھ ساتھ لوگ اخلاقیات کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں انہیں بس ایک ہی فکر ہوتی ہے کہ ڈھیروں ڈھیر دولت کے انبار جائز و ناجائز طریقے سے اکٹھے کرلیں۔ بڑے بڑے محل نما گھر بنالیں جن میں دنیا کی ہر آسائش میسر ہو۔

بچوں کو اچھے سے اچھے انگریزی میڈیم اسکولوں میں داخلہ کروایا جائے جہاں وہ منہ ٹیڑھا کر کے انگلش بولنا تو سیکھ لیں۔ مگر اُن کی مذہبی تعلیم و تربیت اور اخلاقی حالت کو سدھارنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

لیکن شہروں کے پرانے حصوں میں اب بھی کافی حد تک پرانی روایات اور رسم و رواج موجود ہیں اور لوگ زیادہ نہیں تو کسی حد تک آپس میں

میل جول کا سلسلہ بھی رکھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بھی شریک ہو کر اپنے خلوص اور اپنائیت کا اظہار کرتے ہیں البتہ ماڈل اور نئی نسل کے کھاتے پیتے گھروں کے افراد کو یہ تو خواہش ہے کہ ٹوئٹر اور فیس بک پر زیادہ سے زیادہ لوگوں سے دوستیاں کی جائیں۔ گھنٹوں اجنبی لوگوں سے چیٹ کی جائے۔ مگر اپنے گھر کے افراد یا پھر آس پاس کے لوگوں سے علیک سلیک کی حد تک ہی تعلقات رکھے جائیں۔ میڈیا نے انسانوں کو قریب لانے کی بجائے دوریاں بڑھا دی ہیں۔ دیر تک رات کو جاگ کر فلمیں اور دوسرے تفریحی پروگرام تو بخوشی اور ذوق وشوق سے دیکھے جاتے ہیں مگر گھر یا محلے کے کسی بزرگ یا بیمار سے چند لمحوں کے لیے بیٹھ کر بات چیت کرنا بہت کم لوگ گوارا کرتے ہیں۔ حالانکہ بیمار کی عیادت کرنا ہمارے پیارے نبی ﷺ کی سُنت ہے۔ آپ ﷺ باقاعدہ بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی خبر گیری فرماتے تھے۔ مگر بات پھر وہی آجاتی ہے کہ جب والدین خود مذہبی تعلیمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنائیں گے اور بچوں کی تربیت مذہبی اصولوں کے مطابق نہیں کریں گے تو وہ اسلامی تعلیمات اور قوائد وضوابط سے نابلد ہی رہیں گے۔ بچپن ہی سے کسی بات کی عادت ڈالی جائے تو وہ پختہ ہو جاتی ہے مگر ایسا اکثر گھرانوں میں نہیں ہو رہا۔

ایم ایس سی کا امتحان پاس کرتے ہی زاریہ نے مختلف اداروں میں ملاقات کے لیے درخواستیں دینی شروع کر دیں۔ بالآخر ایک گورنمنٹ کے کالج میں اُسے ایڈہاک بنیادوں پر اس شرط پر ملازمت مل گئی کہ وہ پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرے گی تو اُن کی ملازمت مستقل ہو جائے گی۔ اگرچہ ملازمت اُسے گجرات میں ملی تھی۔ اور وہاں اُسے ہاسپٹل میں رہنا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ دوسرے شہر میں گھر والوں سے دور رہنے کا تصور ہی اُس کے لیے سوہان روح تھا۔ مگر پھر بھی وہ خوش تھی کہ اتنی جلدی اُسے گورنمنٹ کی ملازمت مل گئی۔ ورنہ تو لوگ ڈگریاں لے کر عرصے تک جوتیاں چٹخاتے رہتے ہیں۔ مگر انہیں کوئی بھی ڈھنگ کی ملازمت نہیں ملتی اور وہ معمولی تنخواہوں پر پرائیویٹ اداروں میں ملازمتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا پھر ہر جائز و ناجائز طریقے سے ملک سے باہر جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں فراڈیے ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ کر مال و جال دونوں ہی اکثر گنوا بیٹھتے ہیں۔ چند خوش قسمت ہی ہوتے ہیں جو جائز طریقے سے تمام قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد بیرون ملک جانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اور اُن کی یہ کامیابی دوسروں کے لیے باعث رشک ہوتی ہے۔ اور اُن کی تقلید کے چکر میں دھوکے بازوں کے ذریعے اپنا استحصال کرواتے رہتے ہیں۔

زاریہ کی بہترین تعلیمی پوزیشن کی وجہ سے اُسے کنز ایڈہاک ہی سہی مگر سرکاری ملازمت مل تو گئی نا...... پھر تعلیم کے شعبے میں اتنا ورک لوڈ بھی نہیں ہوتا۔ سال میں آدھے سے زیادہ وقت تو چھٹیاں رہتی ہیں۔ گرمیوں کی تین ماہ کی چھٹیاں تو مسلسل ہوتی ہیں اور تنخواہ بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کالج میں پڑھانے والوں کو تو اور بھی بہت سی مراعات ملتی ہیں۔ یہی سوچ کر زاریہ نے گجرات جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اتنی محنت سے تعلیم حاصل کی تھی تو اب اُس کا صلہ ملنے کا موقع مل رہا

تھا تو وہ کیوں ضائع کرتی۔ اگرچہ عامرہ بیگم اور ابا بہت جز بز تھے کہ وہ اتنی دور اکیلی جا کر رہے گی۔ اکیلی آیا جایا کرے گی۔ عزیز رشتے دار باتیں بنائیں گے کہ لڑکی کو اتنی دور کمانے کے لیے بھیج دیا۔ اس پر زاریہ نے کہا۔

''امی لوگ اپنی بیٹیوں کو پڑھنے کے لیے یورپ' امریکہ بھیج دیتے ہیں میں تو پھر اپنے ہی ملک کے ایک شہر میں جا رہی ہوں۔ اور گجرات ایسا دور بھی نہیں..... امی بات اکیلے آنے جانے کی تو پبلک ٹرانسپورٹ میں کیا اکیلا ہونا یہاں بھی تو میں بسوں ویگنوں میں یونیورسٹی جاتی ہی ہوں نا۔ اور عزیزوں رشتے داروں کا کیا ہے وہ تو کسی بھی حال میں جینے نہیں دیتے۔ اُن کی اُلٹی سیدھی باتیں سننے لگیں تو پھر بندہ کچھ کر ہی نہیں سکے۔ آپ تو جانتے ہیں نا کہ جب میں نے کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا تو تب بھی سبھی نے کتنی باتیں بنائی تھیں کہ لڑکی کو اتنا پڑھانے لکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میٹرک کرلیا ہے کافی ہے دو ایک سال گھر بٹھا کر گھر داری سکھاؤ اور پھر اس کے ہاتھ پیلے کردو یہی عمر ہوتی ہے لڑکی کی شادی کی' ورنہ پڑھ پڑھ کر بوڑھی ہوگئی تو کوئی رشتہ بھی نہیں ملے گا۔ شکر ہے کہ تب آپ لوگوں نے ان فضول باتوں پر دھیان نہیں دیا ورنہ میں آج محض میٹرک کر کے گھر بیٹھی برتن مانجھ رہی ہوتی۔ رہا شادی بیاہ کا مسئلہ تو یہ سب قسمت کے کھیل ہیں جب مقدر میں ہوا تو شادی بھی ہو ہی جائے گی۔ میں نے اس سے کب انکار کیا ہے۔ مگر اس وقت جو ہمارے گھر کے حالات ہیں اس میں ضروری ہے کہ بھائی کے تعلیم مکمل کرنے اور اسے پیروں پر کھڑے ہونے تک میں ابا کا ہاتھ بٹاؤں۔ آخر وہ اپنی کمزور صحت کے ساتھ کب تک اکیلے محنت مشقت کی چکی میں پستے رہیں گے۔

پھر اُن کی ملازمت بھی کوئی زیادہ معاوضے اور سہولتوں والی نہیں ہے' پہلے سستا زمانہ تھا۔ اس قدر ہوشربا مہنگائی نہیں تھی اس لیے کم آمدنی میں بھی بخوبی گزارا ہو جاتا تھا۔ مگر اب بہت مشکل ہے۔''

''میری بیٹی کو تو سیاست دان ہونا چاہیے ہمیشہ ہی اپنے مضبوط دلائل کے بل بوتے پر ہم کم پڑھے لکھے بلکہ اس کے مقابلے میں تقریباً اَن پڑھ پرانے زمانے کے بوڑھوں کو قائل کر ہی لیتی ہے۔'' ابا نے مسکرا کر زاریہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

''ابا پلیز آپ ایسی باتیں نا کریں نا آپ لوگ اَن پڑھ نا بوڑھے...... آج میں اور ذیشان جو کچھ بھی ہیں آپ جیسے والدین کی محنت' کوشش اور اچھی تربیت کی وجہ سے ہی ہیں ورنہ اگر آپ لوگ دوسرے لوگوں کی طرح ہمیں نا اعلیٰ تعلیم دلواتے نا ہی ہماری دوسری ضروریات کے لیے اپنے آپ کو مشقت کی چکی میں پیستے تو آج ہم کہاں ہوتے آپ اور اماں نے خود کو مٹا کر ہمیں بنایا ہے۔ اور یہ آپ کا ہم پر احسان عظیم ہے۔ جس کا صلہ ہم اپنی جان دے کر بھی نہیں دے سکتے۔'' زاریہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو میری بچی...... یہ تو ہر والدین کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی اچھی طرح پرورش کریں۔ انہیں اپنی بساط بھر تعلیم دلائیں۔ اُن کی تربیت کریں یہ کوئی احسان کی بات نہیں...... ہاں بیٹا تم پھر گجرات جانے کی تیاری شروع کردو۔ جتنے پیسوں کی ضرورت ہو۔ بتا دینا میں غفور بھائی سے ایڈوانس لے لوں گا۔'' ابا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ ابا جی...... مگر آپ نے مجھ سے پہلے ایک وعدہ کرنا ہے۔'' زاریہ نے لاڈ سے کہا۔

''اب اور کون سا وعدہ لینا چاہتی ہو بیٹی اپنی ساری باتیں تو منوالی ہیں۔'' ابا نے ہنس کر پوچھا۔

''وہ یہ کہ کل شام کو غفور چاچا کی دوکان پر جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جائیں گے اور اپنا تفصیلی معائنہ کروائیں گے۔ کیونکہ آپ کی کھانسی زیادہ ہی شدید ہوتی جارہی ہے۔'' زاریہ نے کہا۔

''اوہو...... بیٹی ایسا کچھ بھی نہیں ہے...... وہ بس میں ٹھنڈا گرم کھاتے پیتے ذرا احتیاط نہیں کرتا ہوں اس لیے تھوڑا گلہ خراب ہو جاتا ہے۔ اور کوئی مسئلہ نہیں مجھے...... تم فکر نا کرو...... اتنی زندگی گزاری ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل رکھا ہے۔ تو آئندہ بھی کچھ نہیں ہوگا۔'' ابا نے اطمینان سے کہا۔

''اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو...... اللہ تعالیٰ آپ کو اور اماں کو یونہی صحت مند اور ایکٹو رکھے۔ مگر چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ تاکہ بعد میں مزید پیچیدگیاں پیدا نا ہوں۔'' زاریہ نے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح کہا۔

''شکر ہے ہماری بیٹی ڈاکٹر نہیں بنی۔ ورنہ اس نے تو ہر وقت ہی ہمیں مختلف بیماریوں سے ڈرا کے رہنا تھا۔ اور یہی نصیحتیں کرنی تھیں یہ کرو وہ نا کرو وغیرہ وغیرہ......'' اماں نے بھی گفتگو میں حصہ لے کر کہا۔

''اور زاریہ باجی نے تو مجھ پر بازار کی ہر چیز کھانے کی پابندی لگادینی تھی۔ سوائے گھر کے روکھے پھیکے کھانوں کے۔'' شہروز نے بھی شریر لہجے میں کہا۔

''ہاں بس تمہاری ہی کسر رہ گئی تھی۔ تم بھی دل کی بھڑاس نکال لو...... شکایتی بندر کہیں کے...... میرے جانے کے بعد تمہاری تو عیش ہو جائے گی۔ ذیشان بھائی اپنی پڑھائی میں مصروف ہوں گے۔ ابا اپنے کام پر چلے جایا کریں گے اور اماں کو گھر کے کاموں سے فرصت نہیں ہوا کرے گی۔ اور شہروز صاحب جی کھول کر کھیل کود میں مصروف رہا کریں گے۔ اور ڈٹ کر اسکول سے چھٹیاں کیا کریں گے ہیں نا؟'' زاریہ نے شہروز کو مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''خیر باجی یہ آپ زیادتی کررہی ہیں۔ اب میں اتنا بھی برا نہیں ہوں۔'' شہروز نے منہ بسورا۔

''تو میرے بھائی میں کب تمہیں برا کہہ رہی ہوں۔ بس ذرا پڑھائی کے معاملے میں ڈنڈی مار جاتے ہو، خیر میں چھٹیوں میں تو آیا ہی کروں گی اور تمہاری کمی پوری کروادیا کروں گی۔ فکر نا کرو، تمہاری آزادی کے دن زیادہ طویل نہیں ہوا کریں گے۔'' زاریہ نے اطمینان سے کہا۔

ساری تیاری وقت پر مکمل کر کے کالج میں جوائننگ دینے سے ایک روز قبل زاریہ ذیشان کے ہمراہ گجرات چلی گئی اُس نے کالج کے ہاسٹل میں وارڈن کو رپورٹ کیا اور اُسے ہاسٹل میں ٹیچرز کے پورشن میں ایک دوسری لیکچرار کے ساتھ کمرہ مل گیا۔ اور پھر ذیشان اُسے ہاسٹل میں چھوڑ کر گھر واپس چلا گیا۔

☆......☆......☆

یہ ایک بڑا اور پرانا کالج تھا۔ جس میں بی اے، بی ایس سی تک کلاسز تھیں۔ کالج سے کچھ فاصلے پر ہاسٹل تھا، نیچے کی منزل پر لڑکیوں کی

رہائش تھی جبکہ اوپر ٹیچرز کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہاسٹل کی عمارت بہت پرانی مگر مضبوط اور خوبصورت بنی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں کئی پُراسرار باتیں مشہور تھیں کہ یہاں جنوں بھوتوں کا ڈیرہ ہے، یہ ہے...... وہ ہے...... شروع شروع میں جب نئی لڑکیاں اور ٹیچرز آتی تھیں تو انہیں اس کے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ ڈرپوک قسم کی لڑکیاں ڈر بھی جاتی تھیں۔ بعض تو محض ہاسٹل میں رہنے کے ڈر سے کالج ہی چھوڑ جاتی تھیں۔ اگرچہ کسی کے ساتھ بھی براہِ راست کوئی واقعہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ البتہ پرانے قصے ہاسٹل میں کام کرنے والے ملازمین یوں وثوق سے سناتے تھے جیسے وہ اُن کے چشم دید ہوں۔ یہ ان پُراسرار واقعات کے بارے میں ایک بات طے شدہ ہے کہ اکثر لوگوں کو نسل در نسل سنے ہوئے قصے سنانے کا شوق ہوتا ہے۔ اور یہی کہتے ہیں کہ اُن کے دادا یا دادی یا ماں یا باپ کا بیان ہے کہ اُن کے کسی قریبی عزیز کے ساتھ یہ ہوا وہ ہوا......

مختلف اخبارات اور رسائل میں بھی ایسے پُراسرار واقعات دیے جاتے ہیں وہ بھی سب تقریباً ماضی بعید ہی میں پیش آئے ہوئے ہیں۔ حالیہ دور میں پیش آنے والے بہت کم واقعات میں حقائق کم اور مبالغہ آرائی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی اپنے ساتھ پیش آنے والے کسی واقعہ کا ذکر کرے گا تو اُس کی تصدیق کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ اس لیے لوگ بہتر سمجھتے ہیں کہ یہ واقعات اپنے مرحوم بزرگوں کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں۔ یوں سنسنی خیزی کے لوازمات بھی پورے ہو جائیں گے اور قصہ کہانیاں سننے سنانے کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔

زار یہ فزکس کی ٹیچر تھی۔ اُس کے ڈیپارٹمنٹ میں چار اور ٹیچرز تھیں۔ زیادہ تر سینئر ہی تھیں۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ میں فیروزہ جلیل خاص تجربہ کار ذہین، مگر سخت مزاج اور اصولوں اور قوائد کی سخت پابند خاتون تھیں۔ باقی تین بھی اپنے مضمون کی ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ شادی شدہ اور بچوں والی تھیں۔ البتہ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ غیر شادی شدہ تھیں اور ہاسٹل ہی میں رہتی تھیں۔ وہ بنیادی طور پر راولپنڈی کی رہنے والی تھیں۔ اُن کی پہلی اپارٹمنٹ اسی کالج ہی میں ہوئی تھی اور پھر وہ یہیں رہ گئیں۔ انہوں نے ٹرانسفر کی کوشش ہی نہیں کی۔ دراصل گھر میں دونوں بھائیوں اور بھابیوں کا راج تھا۔ والدین انتقال کر چکے تھے۔ بڑی دونوں بہنیں شادی شدہ اور بیرون ملک مقیم تھیں یہ وہاں کس کے پاس جاتیں۔

شادی بھی نا ہو سکی ایک تو شکل وصورت بھی واجبی سی تھی۔ پھر مزاج بھی ایسا تھا کہ کسی کے ساتھ رہنا اور نبھاہ کرنا اُن کے لیے ناممکن سا تھا۔ اس لیے انہوں نے شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیا اور دلجمعی سے اپنی ملازمت میں مصروف ہو گئیں۔ کوئی خاص ذمہ داری تو تھی نہیں...... آدھے سے زیادہ دن کالج میں گزار کر ہاسٹل آجاتیں۔ یہاں زیادہ تر پڑھنے اور اسٹوڈنٹس کے پیپرز وغیرہ چیک کرتی رہتیں۔ انہیں گھومنے پھرنے یا دوستیاں کرنے کا شوق ہی نا تھا۔ اپنی ذات ہی میں مگن رہنے والی خاتون تھیں۔ کبھی کبھار دو تین مہینے کے بعد پنڈی چلی جاتیں۔ اور جو پیسے تنخواہ سے بچائے ہوتے وہ وہیں خرچ ہو جاتے کیونکہ بھائیوں کے گھر میں خواہ چند دن ہی کے لیے رہنا ہوتا تو نا صرف اپنے کھانے پینے

کے اخراجات دینے پڑتے بلکہ بھائیوں' بھابیوں اور اُن کے بچوں کو بھی تحفے تحائف دینے پڑتے خیر سے کماتی جو تھیں۔ حالانکہ بھائیوں کی اچھی خاصی آمدنی تھی۔ اپنا دو منزلہ گھر تھا۔ نیچے بڑا بھائی جبکہ اوپر چھوٹا بھائی رہتا تھا۔ والد کی راجہ بازار میں کپڑے کی دوکان تھی۔ جواب دونوں بھائی سنبھالتے تھے۔ اور اس سے خاصی خاصی خوشحالی تھی۔ مگر پھر بھی ہر وقت بیویوں سمیت اخراجات کا رونا ہی روتے رہتے تھے۔ تاکہ اس بہانے بہن کی کمائی اُس سے اینٹھ سکیں اور فیروزہ جلیل بھی یہ سوچ کر اُن کی مدد کر دیتیں کہ انہوں نے اور کس پر خرچ کرنا ہے۔

پھر اس طرح چار دن تک اُن کے ہاں رہ سکتی تھی۔ ورنہ تو شاید بھابیوں کو انہیں پانی بھی دینا گوارا نا ہوتا۔ معمولی پڑھی لکھی خالص گھریلو عورتیں تھیں دونوں' کیونکہ بھائی بھی تو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ بچپن ہی سے والد کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے تھے۔ اس لیے پڑھائی کی جانب اُن کا رجحان ہی نا تھا اور اُن کے نزدیک پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ انہوں نے کونسی نوکریاں کرنی تھیں۔ بڑی دونوں بہنوں کی بھی میٹرک اور ایف اے کے بعد اپنے پلمبر اور الیکٹریشن کزنز سے شادیاں ہوگئی تھیں۔ اور وہ کویت میں اُن کے ساتھ خوشحال زندگیاں بسر کر رہی تھیں اور فیروزہ کو اُس کی تعلیم حاصل کرنے اور شادی نا ہونے پر طعنے دیتی تھیں کہ نا وہ زیادہ پڑھ پڑھ کر اپنی عمر ضائع کرتی نا آج اکیلی ہوتی اور نا ہی اُسے نوکری کر کے اپنا گزارا کرنا پڑتا۔ کسی بھی میٹرک انڈر میٹرک کزن سے شادی کر کے عیش ہوتی اور فیروزہ جواب میں اپنی بہنوں کی باتوں پر ہنس کر خاموش ہو جاتی۔

مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب عمر بڑھتی گئی اور لوگوں کو اپنے بارے میں اُلٹی سیدھی چہ مگوئیاں کرتے سنا تو انہیں اپنی بہنوں کی کہی ہوئی باتیں سچ لگنے لگی تھیں اور اب انہیں بھی افسوس تھا کہ کاش وہ کسی سے بھی شادی کر لیتی تو کم از آج اُن کا اپنا گھر ہوتا اُن کے بچے ہوتے اور وہ بھی معاشرے میں سر اٹھا کر جی سکتیں۔

یوں ہاسٹل کے تنہا کمرے میں اپنے شب و روز گزارنے پر مجبور نا ہوتیں نا ہی لوگوں کے عجیب و غریب رویوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ انہیں یہ بڑا برا محسوس ہوتا تھا جب کوئی بھی نیا ملنے والا شخص پہلے یہی پوچھتا۔

''اچھا آپ کی شادی ہوئی ہے؟''

''نہیں ہوئی؟''

''کیوں نہیں ہوئی...... شادی ضرور کرنی چاہیے یہ تو اللہ' رسول ﷺ کا حکم ہے۔ اکیلی عورت کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں ہوتا۔ لوگ جینے نہیں دیتے وغیرہ وغیرہ۔'' وہ لوگوں کی ایسی باتیں سن سن کر تنگ آجاتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا بے حد کم کر دیا تھا۔ اب وہ پنڈی بھی کم کم جاتی تھیں۔ بلکہ گرمیوں کی طویل چھٹیاں بھی ہاسٹل میں ہی گزارتی تھیں۔ انہوں نے لیے دیے رہنا شروع کر دیا تھا۔ مزاج کی درشتی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کالج میں بھی اسٹاف روم میں جا کر بیٹھنے کے بجائے عموماً فزکس لیب میں ہی رہتی تھیں یا پھر کچھ دیر کے لیے لائبریری چلی جاتی تھیں۔ تاکہ اخبار وغیرہ پڑھ لیں' یا پھر کوئی میگزین دیکھ لیں لائبریرین عابدہ چوہدری اچھی خاتون تھیں۔ اُن کی شادی ہوئی تھی مگر پھر شوہر کے انتقال کے بعد پانچ بچوں کو پال رہی تھیں۔ اپنے ساتھ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی

کو رکھا ہوا تھا۔ وہ اکثر فیروزہ جلیل کے ساتھ اپنے مسائل شیئر کرتی رہتی تھیں۔

انہوں نے کبھی بھی انہیں غیر شادی شدہ ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا۔ بلکہ اکثر کہتی تھیں کہ اچھا ہے۔ انہوں نے شادی کا طوق گلے میں نہیں ڈالا۔ مزے سے آزاد اور پُرسکون زندگی گزار رہی ہیں کم از کم اُن پر کوئی بڑی ذمہ داری تو نہیں ہے نا...... اصل میں اُن خاتون کو بچوں کی طرف سے پریشانی تھی۔ کیونکہ ایک تو اُن کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ پھر گھر کے سو بکھیڑے تھے۔

بھائی بھی بے روزگار تھا۔ اُس کے بھی تین بچے تھے۔ سارے گھر کا بوجھ عابدہ چوہدری پر تھا۔ جس سے وہ بہت چڑچڑی اور پریشان رہتی تھیں۔ سوائے تنخواہ کے اور کوئی آمدنی کا ذریعہ بھی نا تھا۔ بھائی کوئی کام ٹک کر کرتا ہی نا تھا۔ انہی پریشانیوں کی وجہ سے عابدہ چوہدری ہر وقت جلتی کڑھتی رہتی تھیں اور فیروزہ جلیل سے اپنا دکھ سکھ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی تھیں۔ پھر جب فیروزہ جلیل نے کسی طرح اپنی بڑی بہن کو کہہ کر عابدہ چوہدری کے بھائی وسیم چوہدری کو کویت بھیج دیا تو عابدہ چوہدری نے سکون کی سانس لی اور وہ فیروزہ کے اس احسان کے نیچے دب سی گئی تھیں اب اُن کے گھر کے حالات خاصے بہتر ہوگئے تھے۔

اس لیے وہ فیروزہ جلیل کی بہت عزت کرنے لگتی تھیں اور ہر وقت ہر ایک کے سامنے اُن کی تعریفوں کے پل باندھتی رہتی تھیں اور اکثر انہیں اپنے گھر کھانے پر بلاتی رہتی ہیں۔ ویک اینڈ تو وہ عابدہ ہی کے ہاں گزارتی تھیں۔ اس طرح فیروزہ کا بھی دل بہل جاتا اور عابدہ کو بھی اُن کے احسان کا بدلہ چکانے کا موقع مل جاتا۔ عابدہ کا ایک اور بھائی تھا۔ اُس نے ایک ٹیکنیکل کالج سے الیکٹرک انجینئرنگ کا ڈپلومہ کیا تھا اور وہ بھی باہر جانا چاہتا تھا۔ مگر اُس کے پاس اس مقصد کے لیے نا ہی پیسہ تھا، نا ہی باہر جانے کا کوئی ذریعہ تھا۔ پھر وہ مزدوری وغیرہ کرنے کے لیے باہر جانے کا قائل نا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ امریکہ یا انگلینڈ اپنی تعلیم کی بنیاد پر مستقل نوکری حاصل کرنے کے لیے جائے تاکہ وہاں رہ کر مزید تعلیم حاصل کرسکے۔ اگرچہ آج کل لاہور میں ایک فیکٹری میں ملازم تھا۔ مگر ایک تو تنخواہ کم تھی پھر یہاں رہ کر مزید تعلیم کا حصول ممکن نہیں تھا۔ اور باہر جانے کے لیے بہت زیادہ رقم چاہیے تھی جو نا اُسے عابدہ مہیا کرسکتی تھی نا ہی اُس کا کوئی اور عزیز رشتے دار۔ اور عابدہ چاہتی تھیں کہ اپنے بھائی کی شادی کردیں تاکہ اُس کے سر پر سے باہر جانے کا جنون اُتر سکے اور اس مقصد کے لیے وہ فیروزہ سے کہتی رہتی تھیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی اُن کے بھائی کے لیے دیکھیں۔ اور فیروزہ نے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اُن کی مدد کریں گی۔

فیروزہ جلیل اب اس لیے بھی عابدہ کا زیادہ خیال کرنے لگی تھیں کہ انہوں نے خود ہی اُن کی تنہائی کے خیال سے اپنی تین سالہ چھوٹی بیٹی انہیں دے دی تھی۔ اور فیروزہ جلیل کو تو گویا زندگی گزارنے کا ایک خوبصورت آسرا مل گیا تھا۔ انہوں نے تمام قانونی کارروائیاں پوری کرکے عابدہ کی بیٹی نور کو اپنا لیا تھا۔ اُس کی تعلیم اور دوسرے اخراجات بھی اپنے ذمے لے لیے تھے۔ اس طرح عابدہ چوہدری نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک تو فیروزہ جلیل کو اپنا احسان مند کرلیا تھا۔ دوسرے ایک بچی کے اخراجات

سے نجات مل گئی تھی۔ پھر جانتی تھیں کہ بچی اُن سے کون سا دور جارہی ہے۔ ہر روز کا ملنا جلنا تھا۔ فیروزہ جلیل نے گجرات ہی میں عابدہ کے گھر کے قریب ہی پلاٹ لے لیا تھا۔ اور ریٹائرمنٹ کے بعد اُن کا ارادہ گجرات ہی میں مستقبل قیام کرنے کا تھا۔ شہر کے مضافات میں واقع یہ ایک جدید ہاؤسنگ سوسائٹی تھی جہاں زیادہ تر بیرون ملک مقیم افراد نے گھر بنوائے ہوئے تھے۔

عابدہ کے شوہر بھی چونکہ سعودی عرب میں کام کرتے تھے اور انہوں نے اسی دوران اس کالونی میں پلاٹ لے کر گھر بنالیا تھا۔ مگر پھر اُن کا سعودی عرب ہی میں عمرہ کے دوران ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوگیا تھا۔ اور اُن کی تدفین بھی مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ کیونکہ انہوں نے مرنے سے پہلے یہی وصیت کی تھی۔ انہوں نے جو پیسہ کمایا تھا وہ مکان بنانے میں لگ گیا تھا۔

اور بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ یہ تو شکر ہے کہ عابدہ چوہدری نے شادی کے بعد شوہر کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر پہلے بی اے کیا پھر لاہور جا کر لائبریری سائنس میں ڈپلومہ لے لیا اور پھر پہلے کچھ عرصہ گجرات کے ایک پرائیویٹ کالج میں لائبریرین کی حیثیت سے ملازمت کی اور پھر جب گورنمنٹ کالج گجرات میں لائبریرین کی آسامی خالی ہوئی تو پہلے ایڈہاک پر یہاں تعینات ہوگئیں۔

اس دوران انہوں نے لائبریری سائنس میں ماسٹرز بھی کرلیا۔ اور یوں پھر بعد میں پنجاب سروس کمیشن کا امتحان دے کر مستقل ملازمت مل گئی۔ اور شوہر کے انتقال پر انہیں بہت زیادہ معاشی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر بھائی کے باہر جانے کے بعد خاصی خوشحالی آگئی تھی۔ اور اب وہ کافی پُرسکون زندگی بسر کررہی تھیں۔ فیروزہ جلیل کی وجہ سے ایک بچے کا بوجھ بھی کم ہوگیا تھا۔ اس لیے مسائل کا اتنا دباؤ نہیں رہا تھا۔

زاریہ جب گجرات آتی تو فیرزہ جلیل کو یہ خاموش سی بے حد محنتی اور ذہین لڑکی بہت پسند آئی۔ پھر اُس کی کافی عادتیں اُن سے ملتی جلتی تھیں۔ اس لیے بھی انہیں اس سے قلبی لگاؤ محسوس ہونے لگا۔

زاریہ اگرچہ ہاسٹل میں ایک دوسری لیکچرر کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر ایک تو دونوں نے مضامین مختلف ہے غزالہ پولیٹیکل سائنس کی لیکچرر تھی۔ اُس کی اپائنمنٹ پچھلے سال پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ہوئی تھی۔ اس لیے اُسے ایک اپنے مستقل ہونے کا زعم تھا۔ پھر تھی بھی خاصی خوش شکل اور تیز وطرار وہ کھاریاں کی رہنے والی تھی۔ اُس کے والد ریٹائرڈ کرنل تھے۔ اُس کی منگنی ایک کیپٹن سے ہوچکی تھی۔ اور وہ محض اپنے شوق اور وقت گزاری کے لیے جاب کررہی تھی۔ اُس کی دوستی کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی عالیہ کے ساتھ تھی۔

دونوں زیادہ تر اکٹھی ہی نظر آتی تھیں۔ ہاسٹل ہو یا کالج یا پھر شاپنگ پر جانا ہو وہ دونوں ہی ہر جگہ ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ کلاسز لے کر اسٹاف روم میں آکر الگ تھلگ بیٹھ کر آپس میں کھسر پھسر کرتی رہتی تھیں۔ کسی اور ٹیچر کو نا لفٹ کرواتی تھیں۔ نا ہی اُن کی شوخ وشریر عادتوں کی وجہ سے دوسری ٹیچرز انہیں منہ لگاتی تھیں۔ عالیہ اور غزالہ اسٹوڈنٹس میں بے حد مقبول تھیں۔ کیونکہ دونوں ہی امیر گھروں کی تھیں جدید ترین تراش کے فیشن ایبل کپڑے پہنتی تھیں۔ بال بھی تراشیدہ تھے۔ پھر ینگ اور خوبصورت بھی تھیں اسٹوڈنٹس کے ساتھ زیادہ ایج ڈفرنس بھی نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھا۔ اس لیے اسٹوڈنٹس بھی انہیں پسند کرتی تھیں۔ زاریہ اگرچہ ینگ تھی۔ خوبصورتی نہیں تو قبول صورت تو تھی۔ مگر ایک تو وہ خاموش طبع تھی۔ پھر شروع ہی میں فیروزہ جلیل اور عابدہ چوہدری کے ساتھ وقت گزارنے کی وجہ سے باقی ٹیچرز کے ساتھ اُس کے تعلقات علیک سلیک سے زیادہ نہیں بڑھے تھے۔ ہاسٹل میں بھی فیروزہ جلیل اُسے اپنے کمرے میں بلا لیتی تھیں۔ وہاں وہ اُن کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے ہوئے اُن کی لے پالک بیٹی نور کو پڑھا بھی دیتی تھی۔

نور بھی زاریہ کے ساتھ بہت اٹیچڈ ہوگئی تھی۔ فیروزہ جلیل نے فیصلہ کرلیا تھا کہ زاریہ کا رشتہ وہ عابدہ کے بھائی سلیم سے طے کروادیں گی۔ اس لیے وہ اکثر اسے کہتی رہتی تھیں کہ وہ شادی ضرور کرے۔ کیونکہ اکیلے زندگی گزارنا ایک عورت کے لیے بہت مشکل ہے۔

پھر اپنی مثال دیتی تھیں کہ تنہائی کا زہر انسان کو اندر ہی اندر آہستہ آہستہ ختم کرتا رہتا ہے۔ انسان تنہائی کی زندگی گزارتے گزارتے معاشرے اور دنیا سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ نا کوئی اُس کا دوست بنتا ہے۔ نا ہی دوسرے لوگ اُس کے مسائل کو شیئر کرتے ہیں اور پھر وہ لوگوں کے بے اعتنائی اور بے گانگی کو محسوس کرتے کرتے ذہنی مریض بن کر رہ جاتا ہے۔ زاریہ فیروزہ خاتون کی ایسی باتیں ہنس کر ٹال جاتی تھی۔ کیونکہ اُس نے یہ طے کرلیا تھا کہ ذیشان کی تعلیم مکمل ہونے اور اُس کے ملازمت حاصل کرنے تک وہ شادی کے بارے میں سوچے گی بھی نہیں کبھی......

کیونکہ یہ ضروری تو نا تھا کہ جس سے وہ شادی کرے وہ شخص اُس کے ساتھ اس حد تک تعاون کرے کہ وہ اُسے اپنی تنخواہ اپنے بھائی اور گھر والوں پر خرچ کرنے کی اجازت دے۔ مگر وہ فیروزہ جلیل کو صاف جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ ایک تو وہ اُس کی ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھیں۔ دوسرے اُن کی وجہ سے اُسے نئے شہر میں زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے اُس کو کلاسز بھی صرف دو ہی دی تھیں۔ پھر اُس کی کلاسز کے اوقات بھی ایسے تھے کہ وہ دس گیارہ بجے تک وہ آرام سے تیار ہوکر کالج جاتی تھی۔ بریک کے بعد اُس کی کلاسز ہوتی تھیں۔ اُس کے بعد اگر پریکٹیکل لینے ہوتے تو وہ کالج ہی میں رہتی ورنہ پھر فارغ ہوکر ہاسٹل آجاتی تھی۔

اکثر نور کو اُس کے اسکول سے بھی لے آتی تھی۔ جب کبھی فیروزہ جلیل کالج میں مصروف ہوتیں۔ ہاسٹل آکر نور کو کھانا دیتی پھر اُس کو سلادیتی اور خود بھی کچھ دیر آرام کرلیتی۔ تب تک فیروزہ جلیل بھی آجاتیں۔ شام کو اکثر دونوں شاپنگ کے لیے چلی جاتیں۔

ہاسٹل کے لان میں بیٹھ کر گپ شپ لگاتی رہتیں۔ نور بھی پاس ہی کھیلتی رہتی۔ ویک اینڈ پر زاریہ لاہور چلی جاتی۔ یوں اُس کا وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ اور یہ فیروزہ جلیل کی بدولت ہی تھا۔ اس لیے وہ اُن کی کوئی بات نہیں ٹالتی تھی۔ البتہ صرف اُن کی جلدی شادی کرنے کی بات نظر انداز کردیتی تھی۔ زاریہ کے گھر والوں کو شروع شروع میں اُس کی غیر موجودگی بہت محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی دور اتنے دنوں کے لیے کہیں گئی تھی۔

پھر جب وہ ہفتے کی شام کو گھر آگئی اور پیر کی صبح تک گھر میں ہی رہی اور صبح سویرے گجرات چلی گئی تو سب گھر والوں نے اُس کا یوں استقبال کیا جیسے وہ ایک عرصے بعد کسی باہر کے ملک سے

آئی ہو۔ حالانکہ اُس سے فون پر بھی برابر رابطہ رہتا تھا۔ مگر چونکہ ایک تو اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ پھر گھر میں پہلے ہی اتنے کم افراد خانہ تھے اُن میں سے بھی اگر کوئی ایک کچھ عرصے کے لیے ہی سہی گھر سے چلا جائے تو گھر میں عجیب طرح کی بے رونقی اور سناٹے کا احساس ہوتا۔

بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ دنوں کے لیے کوئی مہمان آجائے اور وہ چلا جائے تو اُس کی کمی بھی کچھ دِنوں تک بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے اور وہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اور رہی زاریہ تو وہ تو شروع ہی سے اکیلی تھی۔ کوئی بہن بھی نہیں، کوئی کزن وغیرہ بھی قریب نہیں رہتی تھی۔ جو تھیں وہ گاؤں میں یا دوسرے شہروں میں رہتی تھیں اور اُن سے ملنا جلنا بھی بہت کم ہوتا تھا۔ دوست کوئی خاص اُس کی کبھی تھی نہیں۔ مگر اُس کے باوجود اُسے تنہا رہنا پسند نہیں تھا۔ اور تنہائی سے اُسے وحشت ہوتی تھی۔ اُسے تو اکیلے کمرے میں بھی رات کو سوتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ اسی لیے تو اُس نے بچپن ہی میں شہروز کو اپنی خالہ سے مانگ لیا تھا س۔ کیونکہ وہ اُس کے کمرے ہی میں اُس کے ساتھ رہتا تھا۔

اب جبکہ وہ بڑا ہوگیا تھا تو وہ ذیشان کے کمرے میں شفٹ ہوگیا تھا۔ ورنہ تو زاریہ اُس کو اپنے پاس ہی ہر وقت رکھتی تھی۔ اب اُسے اکثر خیال آتا تھا یہ وہ لڑکے کی بجائے کسی خالہ یا پھوپو کی لڑکی لے لیتی تو زیادہ بہتر ہوتا کہ اُسے وہ اپنے ساتھ ہاسٹل میں بھی رکھ سکتی تھی اور یوں دوبارہ سے اُسے اکلاپے کی اذیت نا سہنی پڑتی اب تو پورے خاندان میں کسی کی کوئی چھوٹی بچی بھی نا تھی جسے وہ اپنا لیتی۔ رات کو اکیلے کمرے میں اُسے دیر تک نہیں اتی تھی۔

ہاسٹل میں اگرچہ زاریہ کی اپنی روم میٹ غزالہ کے ساتھ دوستی نہیں تھی۔ مگر اس کے باوجود اُسے اُس کا بہت آسرا تھا کہ کم از کم اُسے کمرے میں تنہا تو نہیں رہنا پڑتا تھا اور جب بھی غزالہ اپنے گھر چھٹی پر چلی جاتی تو وہ میڈم فیروزہ جلیل سے کہہ کر نور کو اپنے کمرے میں لے آتی تھی۔ اُسے پڑھاتی، اُس کو ہوم ورک کرواتی، سونے سے پہلے اُسے کہانیاں سناتی اور یوں وہ آرام سے سو جاتی۔

مگر ایک مرتبہ جب غزالہ بھی اپنے گھر گئی ہوئی تھی اور میڈم فیروزہ جلیل بھی راولپنڈی اپنی بہن سے ملنے گئی تھیں۔ جو کچھ عرصے کے لیے کویت سے آئی تھی۔ تو زاریہ کے لیے اپنے اکیلے کمرے میں رات گزارنا عذاب ہوگیا۔ کبھی خیال آتا کہ وہ نیچے اسٹوڈنٹس کے کمروں میں چلی جائے۔ یا پھر کسی دوسری ٹیچر کے پاس چلی جائے یا اُسے اپنے کمرے میں بلالے۔ مگر پھر وہ سوچتی کہ وہ لوگ کیا سوچیں گی کہ یہ اتنی بڑی اور پڑھی لکھی ہوکر ڈرتی ہے۔

اس طرح تو سارے کالج میں اُس کی بدنامی ہوگی۔ اُس نے ساری رات کمرے کی لائٹ آن رکھی اور کوئی نا کوئی کتاب پڑھتی رہی پھر بھی ڈر کے مارے کانپتی رہی۔ کبھی ہاسٹل کے بارے میں سنے ہوئے قصوں کا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ ایسا نا ہو کہ کوئی جن بھوت آکر اُس کا گلہ دبا دے۔

اور ایسا سوچتے ہی اُس پر لرزا سا طاری ہوجاتا۔ اس طرح ساری رات اُس کی آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ ہو رہی تھی۔ اور وہ نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دعا مانگ رہی تھی کہ

اُسے ان بے معنی اوہام اور خالی تصورات اور خوف سے نجات دے۔ تاکہ وہ جہاں بھی ہو آرام اور سکون سے زندگی گزار سکے۔ وہ اپنی کیفیت کسی سے بیان بھی نہیں کرسکتی تھی کہ مبادا لوگ اُس کے بارے میں اُلٹی سیدھی چہ مگوئیاں کریں۔ جوکہ وہ کسی صورت بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

کیونکہ اُسے اپنی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اُس نے کالج جاکر پہلا کام یہ کیا کہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر چار دن کی چھٹی لی اور کسی طرح اپنی کلاسز لے کر شام کو گھر چلی گئی۔

سب گھر والے اُس کی اچانک آمد پر بہت خوش ہوئے اگرچہ گھر میں بھی وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہی سوتی تھی۔ مگر یہاں اُسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ ایک تو اس گھر کے بارے میں ایسے بے سروپا قصے مشہور نہیں تھے۔ جیسے کہ ہاسٹل کے بارے میں زبان زد عام تھے۔ پھر اُس کے کمرے میں ٹی وی تھا۔

وہ رات کو دیر تک ٹی وی دیکھتی رہتی اور اُس وقت سوتی تھی جب آنکھیں خود بخود ہی نیند سے بوجھل ہوکر بند ہوجاتی تھیں۔

اس طرح وہ رات کو گہری نیند سوکر صبح فریش بیدار ہوتی تھی اب زاریہ نے سوچ لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے وہ ہاسٹل میں اکیلی نہیں رہے گی۔ اور کوئی نہیں تو عابدہ چوہدری سے کہے گی کہ اُسے رات کو اکیلے ڈر لگتا ہے اور وہ اُس کے پاس اپنے کسی بچے کو چھوڑ دیا کرے جب بھی وہ اکیلی ہوا کرے۔ کیونکہ فیروز جلیل کے بعد عابدہ چوہدری ہی ایسی ہستی تھیں۔ جن پر وہ اعتماد کرسکتی تھی۔ اور جانتی تھی کہ وہ کسی سے بات کریں گی نا ہی اُس کا مذاق اڑائیں گی۔ مگر وہ اُس بات سے بے خبر تھی کہ یہی اعتماد بعد میں اُس کے لیے مشکلات کا باعث ہوگا۔

ذیشان نے بی اے کا امتحان دینے کے بعد ایک کمپیوٹر سینٹر میں داخلہ لے لیا تھا تاکہ رزلٹ کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کوئی ہنر ہی سیکھ لے۔ اور شام کو دو تین ٹیوشن سینٹرز میں رات گئے تک ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ تاکہ اپنی یونیورسٹی کے داخلے کی فیس اور ابتدائی اخراجات کے لیے کچھ رقم جمع کرسکے۔ مگر افسوس کہ اُس کی نوبت ہی نا آئی۔ ذیشان کا رزلٹ آنے کے چند دنوں بعد ہی جبکہ وہ یونیورسٹی میں داخلے شروع ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا کہ اُس کے والد شدید بیمار ہوگئے۔ وہ اپنی صحت کے بارے میں ہمیشہ ہی سے لاپرواہ رہتے تھے۔

مسلسل کھانسی اور ہلکے ہلکے بخار کو وہ کبھی نزلہ زکام کی وجہ اور کبھی موسمی اثرات کہہ کر ٹال جاتے۔ اور بدستور دفتر بھی جاتے رہتے اور شام کو دوکان پر بھی بیٹھتے۔ ایک روز وہ دفتر ہی میں بے ہوش ہوگئے۔ دفتر والوں ہی نے انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچایا۔ اور پھر گھر میں اطلاع دی۔

ذیشان، عامرہ بیگم اور شہروز فوراً اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے ایکسرے لیے اور ایک دوسرے ٹیسٹ کیے اور جب تک ٹیسٹوں اور ایکسرے وغیرہ کی رپورٹ نا آجاتی انہیں اسپتال ہی میں رہنا تھا۔ رات کو ذیشان اُن کے ساتھ ہاسپٹل میں ہی رہا۔

اور پھر جب اگلے دن رپورٹیں آئیں تو یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ وہ ٹی بی جیسے جان لیوا مرض میں مدتوں سے مبتلا تھے۔ اور اب ٹی وی آخری اسٹیج پر تھی۔ اُن کا ایک پھیپھڑا تقریباً ختم

ہو چکا تھا۔ ذیشان نے یہ سب نہایت حوصلے سے سنا۔

مگر ماں اور شہروز کو کچھ نہیں بتایا اور یہی کہا کہ ابا کو کمزوری اور بخار کی وجہ سے چکر آ گئے تھے۔ اسی لیے وہ بے ہوش ہو گئے تھے اور کچھ دن اسپتال میں علاج کے بعد ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس پر عامرہ بیگم مطمئن ہو گئیں۔

مگر چند دن ہاسپٹل میں رکھنے کے بعد ڈاکٹرز نے انہیں لاعلاج قرار دے دیا۔ اور ہدایت کی کہ وہ مکمل طور پر بیڈ ریسٹ کریں۔ اچھی خوراک کھائیں۔ اور دوائیاں باقاعدگی سے استعمال کریں۔ تو زندگی کے آخری ایام سکون سے گزار سکیں گے چنانچہ ذیشان انہیں گھر لے آیا۔

اُن کے لیے زاریہ والا کمرہ تیار کروایا۔ اور امی اور شہروز کو یہی ہدایت کی کہ جب تک ابا مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتے اُن کی خوراک' دواؤں اور آرام کا سختی سے خیال رکھنا ہے۔ خود ذیشان نے دفتر والوں کو ساری صورت حال بتا کر اُن سے درخواست کی کہ وہ بی اے پاس کر چکا ہے اور وہ اپنے گھر کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر فوری ملازمت چاہتا ہے۔ اس لیے اُسے ابا کی جگہ ملازمت دے دی جائے۔

اور یوں ایم بی اے کر کے بینک آفیسر بننے کے خواب دیکھنے والا ذیشان بیس سال کی عمر میں گھر کی گاڑی چلانے کے لیے کلرک بننے پر مجبور ہو گیا۔ شام کو ابا کی جگہ غفور چاچا کی دکان پر سیلز مین کرنے لگا۔ یعنی اب اُس کے لیے مزید تعلیم حاصل کرنے کے دروازے مکمل طور پر بند ہو چکے تھے۔

کیونکہ دو دو جگہ کام کرنے کے بعد اُس کے پاس صرف رات کو سونے کا ہی وقت بچتا تھا۔

اور پھر ابا نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے بچوں کے گھر بستے دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ذیشان کی شادی اُس کی پھوپو کی بیٹی شرمین سے سادگی سے کر دی گئی۔ جبکہ زاریہ کی شادی عابدہ چوہدری کے بھائی سلیم سے ہو گئی۔ چونکہ شادیاں عجلت میں ہوئی تھیں۔

دونوں گھروں میں کوئی بھی خاص تیاری نا کی گئی۔ نا شرمین کوئی جہیز لے کر آئی اور نا ہی زاریہ کے لیے جہیز بنانے کا وقت ملا۔ چونکہ سلیم لاہور ہی میں ایک فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ اس لیے زاریہ نے لاہور میں ٹرانسفر کی درخواست دے دی۔ آج کل یوں بھی اُس نے شادی کے لیے ایک ماہ کی چھٹی لے رکھی تھی۔ اس لیے اُسے یقین تھا کہ فیروزہ جلیل کی کوششوں سے چھٹی ختم ہونے تک اُس کی ٹرانسفر لاہور ہو جائے گی۔

سلیم پہلے اپنے دوست کے ساتھ ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہتا تھا۔ شادی کے بعد اُسے الگ مکان کی ضرورت تھی۔ مگر اُس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ الگ مکان لے سکے۔ اس لیے وقتی طور پر وہ زاریہ کے والدین کے مکان کے اوپر والے حصے میں بنے ہوئے کمرے میں رہنے لگے۔

یہ کمرہ ذیشان اور شہروز کا تھا۔ شادی کے بعد ذیشان کو امی والا کمرہ مل گیا تھا۔ اور شہروز رات کو بیٹھک میں سو جاتا تھا۔

جبکہ امی نے ابا کے کمرے میں اپنی چارپائی ڈال لی تھی۔ اور یوں اُن لوگوں کا کسی نا کسی طرح گزارا ہو رہا تھا۔ پھر جب زاریہ کی لاہور ٹرانسفر ہو گئی تو اُس نے کرائے پر علیحدہ مکان لے لیا۔

(اس خوبصورت ناول کی دوسری قسط اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

افسانہ

سکینہ فرخ

مثلث

دوسرا اور آخری حصہ

پھر قدرت کو اس پر رحم آیا۔ ساس اور سسر کے یکے بعد دیگرے دنیا سے گزرنے کے بعد گھر کا بٹوارہ ہوگیا۔ تینوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے کر اس زندان خانے سے یوں بھاگے کہ پھر کسی نے مڑ کے نہ دیکھا۔ نند صاحبہ کس منہ سے کس بھائی کے گھر جاتیں سوا پنے گھر میں......

''یہی تو مصیبت ہے...... سسرال میں جتنے دکھ بابا کی لاڈلیاں اٹھاتی ہیں وہ ماں کی دلاریوں کے حصے میں نہیں آتے...... جس مرد کی محبت اور سپورٹ ایک عورت کو اندھا حوصلہ عطا کرتی ہے وہ اس کے باپ کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا...... یہ حوصلہ اس کی زندگی میں بے شک بڑا کارآمد ہو مگر سسرال میں آ کے گالی بن جاتا ہے...... شوہر کی نظروں میں عیب بن جاتا ہے۔''

☆......☆......☆

''آئندہ میرے سامنے زبان کھولی تو اچھا نہیں ہوگا......'' کسی تلخ لہجے کی بازگشت اس کے کانوں میں سرسرائی۔

''جائز بات پر بھی نہیں۔'' اُس کی اپنی مضبوط آواز کی بازگشت گونجی۔

''جائز اور ناجائز کیا ہے...... یہ تم نہیں میں طے کروں گی۔'' دوسری آواز بلند ہوگئی۔

''میں غلط بات' غلط سلوک اور غلط انداز برداشت نہیں کرسکتی اور نہ ہی کروں گی۔'' وہ بھی زور سے بولی۔

''تو جاؤ اپنے گھر...... اور وہاں جا کر جو مرضی آئے کرلو...... یہاں تو وہ چلے گا جو میں چاہوں گا۔'' وہ طنز سے بولا۔

''چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو......'' اس کا دبنگ لہجہ ایک درجہ نیچے گر گیا۔

''ہاں......'' دوسری آواز اور بلند ہوگئی۔

☆......☆......☆

''تو ایسا کرتی ہوں کہ میں شیری سے کہہ دیتی ہوں۔'' منو کی پُر جوش آواز اسے حال میں واپس لے آئی۔

''ہرگز نہیں...... خبردار جو تم نے شہروز سے کچھ کہا۔ وہ کیا سوچے گا؟'' اس نے بیٹی کو گھورا۔

''وہ کچھ نہیں سوچے گا...... بس میری فرمائش پوری کرنے نکل پڑے گا۔ میرے مطلوبہ شیڈز ڈھونڈے گا......'' منو کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''وہ تمہارا شوہر ہے...... ادب سے ذکر کرو اُس کا......'' اِس نے بیٹی کو تنبیہ کی۔

''ہوگا مگر وہ میرا اچھا دوست بھی ہے.....'' منو خوش ہوکر بولی۔

''نکاح کے بعد فیس بک' واٹس اپ' کالز اور میسجز پر مبنی ان کی یہ دوستی کس نوعیت کی تھی' وہ دونوں ایک دوسرے کو کتنا جاننے اور ماننے لگے تھے یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ بس بیٹی کے چہرے کو بغور دیکھتی رہی لگتا ہی نہیں کہ اتنا پڑھا لکھا ہے..... بہت سادہ مزاج ہے' بلکہ بیوقوف ہے..... منو کا دھیان لپ اسٹک کے شیڈز سے شہروز کی طرف منتقل ہوگیا۔

''مرد کبھی سادہ مزاج اور بیوقوف نہیں ہوتا..... وہ بیوقوف بناتا ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

اسے دنیا کی کوئی خبر ہی نہیں صرف اپنے کام اور فیملی سے لگاؤ ہے۔ منو پھر بولی۔

''ہاہاہا..... مرد کو اور دنیا کو خبر نہ ہو بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ تو بس اتنا جاننا چاہتا ہے کہ تمہیں دنیا کی کتنی خبر ہے اور میری بھولی بیٹی تم اس کو دنیا کی خبر مت دینے بیٹھ جانا ورنہ وہ تمہاری دنیا تاریک کردے گا۔'' وہ پھر خاموش رہی۔

پھر کہہ دوں اس سے وہ لے آئے گا میرے سارے شیڈز وہاں مل جائیں گے ناں۔'' اس نے ضد کی۔

''نہیں..... رخصتی کے بعد وہاں جاکر اس کے ساتھ شاپنگ کرنا جو دل چاہے لے لینا مگر ابھی نہیں۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

☆......☆......☆

وہ اس گھٹے ماحول سے چند دن کا فرار اس صورت میں پاسکتی تھی جب وہ اپنے میکے جاکر رہتی تھی۔

ماں باپ زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر ان کی نگاہیں اسے غور سے دیکھا کرتیں۔

''تم اتنی سوکھتی کیوں جارہی ہو؟ سسرال میں فاقہ کرتی ہو کیا؟'' بڑے بھیا سے نہ رہا گیا۔ وہ خاموش رہی۔

امی مہناز بہت زیادہ چپ نہیں رہنے لگی ہے۔ پٹر پٹر تو اس کی زبان چلتی تھی اب کیا ہوا۔ چھوٹے بھیا کو بھی حیرت ہوئی۔

''مت تنگ کرو تم دونوں میری بیٹی کو..... اب وہ خیر سے شادی شدہ ہے ذمہ داری آگئی ہے اس کے اندر..... ابو نے اس کی سائیڈ لی..... امی کی آنکھیں اس پر ٹکی اور ہونٹ خاموش تھے۔

''کتنے دنوں کے لیے آئی ہو۔'' بڑے بھیا نے پوچھا۔

''ایک ہفتہ کے لیے.....'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''چلو پھر اس ایک ہفتہ میں گھومنے پھرنے کا پروگرام بناتے ہیں سی سائیڈ چلتے ہیں۔ بوٹ بیسن سے چرغہ کھاتے ہیں.....'' چھوٹے بھیا خوش ہوگئے۔

بڑے بھیا کی نئی نئی جاب شروع ہوئی تھی وہ فوراً بولے۔ اور سارا بل میری طرف سے..... اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''مظاہر لینے آئیں گے۔'' ابو نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی ابو..... ہفتے کی رات.....'' اس نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے ان کو بتا دینا کہ کھانا یہیں کھائیں۔'' انہوں نے فوراً کہا۔

''ٹھیک ہے ابو.....'' اس نے سر ہلایا۔

☆......☆......☆

امی نے صرف کھانا نہیں بلکہ شاندار دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ انہیں روکتی رہی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ ابو اور دونوں بھائی بھی کام میں پیش پیش تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے داماد نہیں بلکہ کہیں کا پرنس ان کے گھر آرہا ہو۔

اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا...... اس کی شادی کو چار ماہ ہو چکے تھے۔ وہ جب بھی میکے آتی مظاہر کو یہاں وی آئی پی پروٹوکول ملتا...... شروع شروع میں تو وہ خاموش رہی...... مگر اب بھی ویسا ہی انداز اسے زیادہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''اماں بس بھی کریں اب تو وہ پرانے ہو گئے۔'' اس نے تنگ آ کے کہا۔

''داماد بھی کبھی پرانا ہوا ہے۔'' اماں مسکرائیں۔

وہ بیزار ہو کر وہاں سے ہٹ گئی۔

لاؤنج میں دونوں بھائیوں کے ساتھ ابو کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر تینوں مسکرائے۔

''اب یہاں کیا ہو رہا ہے......'' اس نے مشکوک انداز میں ٹیبل پر رکھے شاپر کو دیکھا۔

''یہ گھڑی کیسی ہے......'' ابو نے شاپر میں سے ایک رسٹ واچ کا بکس نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے کھول کر دیکھا...... راڈو کی بہت نفیس مردانہ رسٹ واچ اس میں موجود تھی۔

''یہ کس کی ہے......؟'' اس نے پرشوق انداز میں گھڑی کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔

مظاہر کے لیے ابو مسکرائے۔

''کیوں...... کس خوشی میں......'' اسے حیرت ہوئی۔

''بس یونہی......'' ابو پھر مسکرائے۔

''یونہی...... اتنی مہنگی گھڑی......'' اس نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔

''بھئی تحفہ دینے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت تھوڑا ہی ہوتی ہے۔'' بڑے بھیا مسکرائے۔

وہ خاموشی سے سب کی شکلیں دیکھ کر رہ گئی۔

مظاہر کی آمد پر سب کی طرف سے ملنے والی آؤ بھگت قابل دید تھی۔

وہ ہر دفعہ کسی فاتح کی طرح سسرال کا دروازہ پار کرتا اور مال غنیمت کی طرح اُسے اٹھا کے لے جاتا...... اس بار اسے یہ سب کچھ نہ جانے کیوں زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نادانستگی میں اپنے اور مظاہر کے ماں باپ کا موازنہ کرنے لگی۔ پچھلی بار ابو نے اسے قیمتی قلم گفٹ کیا تھا جو اس نے گھر لے جا کر لاپرواہی سے دراز میں پھینک دیا تھا۔

اس کے انداز میں ابھی بھی کسی محبت خلوص یا شکرگزاری کے رنگ نہیں تھے بلکہ نخوت اور بیزاری تھی۔ اس کے گھر والے شاید محسوس نہ کر رہے ہوں مگر اسے کوفت ہو رہی تھی۔

پچھلے کئی ماہ سے وہ جس جگہ قیام پذیر تھی شاید اس جگہ کے اثرات اب اس کے مزاج میں بھی نمایاں ہونے شروع ہو رہے تھے وہ خاموشی سے مظاہر کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔

اماں کا محنت سے بنایا ہوا کھانا اس نے سو سو نخرے دکھا کے کھایا۔ ابو کا دیا ہوا گفٹ بے دلی سے وصول کر کے وہیں ٹیبل پر ڈال دیا۔ بھائیوں کی گپ شپ کا جواب سرد مہری سے دیا۔

ابو کا مظاہر کو بار بار توجہ دینا اسے کھل رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ابو اسے یکسر نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔ ابو نے اسے ہمیشہ سب پر فوقیت دی تھی مگر آج مظاہر اپنی تمام بے حسی اور بے نیازی سے بھرپور انداز کے باوجود ابو کا منظورِ نظر بن چکا تھا۔ مہناز کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ دل ہی دل میں ابو سے بھی ناراض ہو گئی۔

واپسی میں مظاہر کا کیا ہوا صرف ایک جملہ اس کے ماں باپ کی ساری محبتوں پر پانی پھیر گیا...... آئندہ جب میکے آنے کا دل چاہے اکیلے آ جانا' میرے پاس اتنا زیادہ وقت نہیں ہوتا...... وہ سامنے روڈ کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ بے بسی سے مظاہر کی طرف......

☆......☆......☆

مناہل اور شہروز ساتھ کھڑے بے انتہا جچ رہے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دونوں کی نظر اتاری۔

زاہد صاحب کے بے شمار رشتہ دار پاکستان میں تھے۔ وہ لوگ شادی میں بھرپور انداز سے شریک تھے۔ زاہد اور ان کی بیگم آسیہ اپنے خاندان میں بے پناہ مقبول تھے سو ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے۔ اچھا پڑھا لکھا کھاتا پیتا خاندان نظر آ رہا تھا ان کا...... وہ بالخصوص دونوں میاں بیوی کے انداز و اطوار دور دور سے پرکھ رہی تھی اور شکر ادا کر رہی تھی۔ شہروز بھی مودب اور سلجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کاش جو کچھ نظر آ رہا ہے اندر سے بھی ویسا ہی اجلا ہو...... اس نے دعا کی۔

رخصتی کی مشکل گھڑی آ پہنچی۔ اس نے دل پر ضبط کا کڑا پتھر رکھ لیا۔

اپنے جگر گوشے کو ایک دوسرے خاندان کے سپرد کرنا ایک طرح سے اس سے دست برداری کا اعلان ہی تو ہوتا ہے۔ بیٹی پر سے ماں باپ کا اختیار اس لمحے ایک دم ختم ہو جاتا ہے۔ وہ پرائی ہو جاتی ہے...... وہ پھر لاکھ میکے آئے' وہاں رہے۔ ایک اجنبیت کا احساس درمیان میں آ جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دکھ بانٹنے میں جھجکنے لگتے ہیں اور یہ پردہ داری قائم رہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔

وہ ماں باپ کے گھر ایک ایسی مہمان بن جاتی ہے جس کو وہ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے اپنی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ دامے' درمے' سخنے......

بیٹی اس گھر سے چلی جاتی ہے مگر اس گھر والوں کے دلوں سے کبھی نہیں جاتی۔ وہ بھی اس مرحلے سے ایک بار گزری تھی جب اس نے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑا تھا اور آج اس کی بیٹی اس مرحلے پر کھڑی تھی۔

اس نے اپنے برابر کھڑے ہو آنسوؤں کو آنکھوں کے کناروں سے باہر نکلنے کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے اپنے شوہر کو دیکھا۔ جو بار بار آنکھوں کے گوشوں کو انگلیوں سے صفائی سے صاف کرتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑے تھے۔ مظاہر کے لیے مناہل ایک دنیا تھی۔ اسے اتنی محبت اظہر اور مظہر سے نہیں تھی۔ ان دونوں کی پیدائش تک مہناز کی زندگی خاردار راہوں کی مسافر تھی۔ سسرال کے کاموں کی بے تحاشہ ذمہ داری' مظاہر کا پل پل بدلتا مزاج' بچوں کی پرورش سب نے مل کر اسے خود سے بیگانہ نہ کر دیا تھا۔ اس سے قدم قدم پر قربانیوں کا مطالبہ اسے بار بار اپنی ذات کی نفی کے دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیتا تھا۔

شادی کے ایک سال کے بعد اس کا لایا ہوا جہیز کا سامان اس کی نند نینا کے جہیز میں چپکے سے رکھ دیا گیا۔ ہمارے گھر میں تو سب کچھ ہی ہے' اتنے ڈھیر سارے برتن' فرج ٹی وی پڑے پڑے سڑنے سے بہتر ہیں کسی کام ہی آ جائیں۔'' اس کی ساس کی منطق نرالی تھی۔ اس نے مظاہر سے پہلی بار اس بات پر جھگڑا کیا۔

اظہر اس کے پیٹ میں تھا مگر مظاہر نے ذرا لحاظ نہ کیا۔

''تو ٹھیک ہے اپنے ابو سے کہو اپنا کوئی کمرہ خالی کروالیں جہیز کے سارے سامان کے ساتھ تم کو بھی واپس کر دیتا ہوں۔'' وہ دم بخود رہ گئی۔

پھر اس کے بعد مظاہر کی عادت ہو گئی۔ جہاں کوئی بات ہوئی اس کے منہ سے کوئی شکایت نکلی مظاہر اسے سامان باندھنے کی دھمکی دے دیتا۔

اس کی نیندیں' سکھ' آرام' خواب اور بدن کی ساری توانائی مظاہر اور اس کے گھر کی بھینٹ چڑھ گئی۔

پھر قدرت کو اس پر رحم آیا...... ساس اور سسر

کے یکے بعد دیگرے دنیا سے گزرنے کے بعد گھر کا بٹوارہ ہوگیا۔ تینوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے کر اس زاندان خانے سے یوں بھاگے کہ پھر کسی نے مڑ کے نہ دیکھا۔

نند صاحبہ کس منہ سے کس بھائی کے گھر جاتیں سو اپنے گھر میں منہ چھپا کے بیٹھ گئیں۔ مظاہر نے ابتداء میں کرائے کا مکان لیا تو اس کے پاس نہ کوئی برتن تھا نہ ضرورت کی کوئی اور چیز اس نے شکایت بھری نگاہ مظاہر پر ڈالی...... پہلی بار وہ نظر چرا کے رہ گیا۔

پھر قطرہ قطرہ کر کے دریا بنانے کی جدوجہد میں وہ مظاہر کے ساتھ رہی۔ مظاہر کے ترش رویے کے بعد اس کی خاموشی کا دور شروع ہوا۔

مظاہر کی خاموشی اسے بھی مزید خاموش کر گئی۔ وہ کسی مشین کی طرح ان تھک اپنی ذمہ داریاں اور فرائض نبھاتی چلی جا رہی تھی۔ گھر کے بے پناہ کام' کسی نوکر کی مدد کے بغیر وہ تن تنہا نبھاے جا رہی تھی۔ دونوں بیٹیوں کے بعد مناہل جسے وہ سب پیار سے منو کہتے تھے کی آمد اس کی زندگی میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہوئی۔ اس نے مظاہر کو پہلی بار پگھلتے دیکھا۔

وہ پہلی اولاد تھی جسے اس نے گود میں اٹھایا۔ چوما' محبت سے لپٹایا اس کی آمد کے چند ماہ کے اندر اندر مظاہر نے ایک چھوٹے سے بزنس کا آغاز کیا جو دیکھتے دیکھتے پھیلنا شروع ہوگیا۔ خوشحالی دروازے پر دستک دینے لگی وہ سب کرائے کے گھر سے ذاتی گھر میں شفٹ ہوگئے۔

بچے اچھا کھانے پینے پہننے لگے' عام سے اسکولوں سے نکل کر بہترین درسگاہ میں داخل کروا دیے گئے۔ مظاہر کی پرانی کار کی جگہ چمچاتی ہوئی نئے ماڈل کی دو دو گاڑیاں کار پورچ میں آن کھڑی ہوئیں۔ ایک مظاہر کے لیے تو دوسری اس کے اور بچوں کے لیے......

مناہل جو سونے کا چمچ منہ میں لیے پیدا ہوئی تھی اس کے لیے تو مظاہر کا دل جیب اور باہیں ہمیشہ کھلی رہیں...... اس کی سختی اور بے نیازی نہ جانے کہاں جا سوئی تھی۔ شاید ہر باپ اپنی اپنی حیثیت میں اپنی بیٹی کے لیے تھوڑا زیادہ ہی کشادہ دل رکھتا ہے...... اور مظاہر...... اسے تو شاید محبت کرنے کا تجربہ ہی پہلی بار ہوا تھا نہ جانے وہ بیٹی سے محبت کر رہا تھا یا بیوی پر کیے گئے ظلم کی تلافی اب وہی مظاہر بیٹی کی رخصتی کے وقت پریشان تھا' اداس تھا...... اور شاید خوفزدہ بھی......

اُداس تو وہ بھی تھی...... بیٹی کی جدائی پر اس کا دل بھی اَن دیکھے اندیشوں سے لرز رہا تھا۔ مگر مظاہر کو یوں اُداس دیکھ کر اسے لگا کہ زندگی میں پہلی بار دونوں ایک جیسا دکھ جھیل رہے تھے ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔

بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے وہ رو پڑا۔ بیٹی بھی اس کے گلے سے لگی سسک رہی تھی۔ ہر وقت ہنگامہ بپا کرنے والی منو ایک مختلف لڑکی محسوس ہو رہی تھی۔ مظاہر نے داماد کو گلے لگایا تو گرم جوشی کی انتہا کر دی۔

سمدھن اور سمدھی سے بار بار بیٹی کا خیال رکھنے کی درخواست کرتا ہوا مظاہر اس مظاہر سے قطعی مختلف تھا جسے وہ جانتی تھی۔

بیٹی کے جانے کے بعد یوں لگا جیسے ایک بھاری بوجھ اس کے سینے پر آپڑا ہو۔ لیکن پچھلے کئی برسوں میں اس نے اپنا دکھ خود ہی بانٹنا سیکھ لیا تھا۔

اب وہ خود اپنی راز داری تھی اور اپنی غم گسار بھی...... اسے کسی کی ضرورت نہیں تھی...... سو خاموشی سے خود کو تسلی دیتی رہی۔

شادی میں شریک سارے لوگ شاندار ضیافت کے بعد واپس جا چکے تھے۔ اِکا دُکا قریبی عزیز رہ

گئے تھے..... جب سے مظاہر کے حالات اچھے ہوئے تھے اس کے بھائی بہن کی محبت بھی زیادہ جاگ اٹھی تھی۔ بالخصوص نینا کی..... اب سے بھابی کی بے اعتنائی کچھ بھی نہ کہتی..... وہ جتنا اس سے بیزار ہوتی یہ اتنا ہی ان سے قریب ہونے کی کوشش کرتی۔

وجہ وہ موٹی رقوم تھیں جو مظاہر اکثر و بیشتر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا کرتا تھا۔ وہ اس وقت بھائی کا دکھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے شوہر اور بیٹوں کے ہمراہ موجود تھی۔ گھر واپسی پر بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مظاہر اسے چھوڑ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''مہناز، تم مناہل کو فون کر کے اس کی خیریت پوچھو۔'' اس کے لہجے میں بیچارگی تھی۔

''کیا منو کو فون کروں..... وہ بھی اس وقت؟''

اس کی رخصتی کو بمشکل دو ڈھائی گھنٹے گزرے ہیں۔ آج اس کی سسرال میں پہلی رات ہے، خدا جانے ابھی وہاں کون کون سی رسومات ہو رہی ہوں گی اور آپ اس کی خیریت پوچھنے کا کہہ رہے ہیں۔ اس نے تختی سے کہا۔

''اچھا تو صبح سویرے کر لینا..... ایک بار اس کی آواز سن لینا.....'' مظاہر نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''دیکھیں جب مناہل صبح میں جاگے گی تو موقع دیکھ کر خود ہی فون کر لے گی۔''

''میرا ابھی اس کو فون مناسب نہیں ہے۔'' اس نے مظاہر کو سمجھایا۔

''اچھا.....'' مظاہر کے لہجے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔

بیٹی اب پرائی ہوئی مظاہر صاحب..... اب اس سے ملنے، بات کرنے اور گھر بلانے میں محتاط رہنا ہوگا۔ اس نے کانوں سے بھاری جھمکے اتارتے ہوئے کہا۔

مظاہر اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ایکدم اس کے قریب آیا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''مہناز تمہارے ہاتھ بالکل منو جیسے ہیں.....''

اس کا لہجہ اُداس تھا۔

''نہیں..... میرے ہاتھ منو کے جیسے نہیں، اس کے ہاتھ میرے جیسے ہیں۔'' اس نے آہستہ سے اپنے ہاتھوں کو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

مظاہر کچھ دیر خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''خدا کرے شہروز تمہاری طرح کمزور مرد نہ ہو..... جو اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے ناجائز دباؤ میں آ کر اپنی بیوی کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں بیوی کمزور ہے اور ماں باپ مضبوط..... بہن بھائی اپنا خون، بیوی پرائی آج تم کو بھی اپنا دکھ اکیلے ہی بانٹنا ہوگا..... اس نے ایک نظر دلگرفتہ بیٹھے ہوئے مظاہر پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

''یار میں رشتہ داریاں نبھانے سے سخت الرجک ہوں۔ پوری زندگی میں دو بار پاکستان آیا ہوں اور چاچی مامی کی محبتوں خالہ پھوپی کی دعوتوں سب سے بیزار ہو کے بھاگا ہوں..... اب اور نہیں.....'' شہروز اس کے سامنے کھڑا تھا۔

آج اس کی خالہ کے ہاں ان سب کی دعوت تھی۔

''ہاں مگر انکل آنٹی تو بے حد خوش ہوتے ہیں

اپنے رشتہ داروں سے مل کر...... ان کی شادی کو آٹھ دن گزر گئے تھے اور آج ان کی پانچویں دعوت تھی۔ وہ تو ہر روز ایک نئے گھر جا کے لوگوں سے مل کر مزے مزے کی ڈشیں چکھ کے بہت خوش تھی مگر شہروز کا منہ بنا ہوا تھا۔

''تو ٹھیک ہے ان کو خوش ہونے دو...... شادی ہم دونوں کی ہوئی ہے اور خوشیاں سارا خاندان منا رہا ہے...... ہم کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ہم بھی تھوڑے خوش ہو لیں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر بولا۔

''تو ہم خوش ہی ہیں۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''تم میرا پوائنٹ نہیں پک کر رہی ہو...... آئی مین میرا دل چاہتا ہے تمہارے ساتھ گھوموں پھروں وقت گزاروں ...... ہم آپس میں ایک دوسرے کو سمجھیں بیچ میں آ جاتے ہیں یہ رشتہ دار...... یہ کھانے اور یہ آنا جانا...... سو میں نے سوچا ہے کہ ہم بھاگ جاتے ہیں...... اس نے آدھی انگلش اور آدھی اردو میں اسے اپنی بات سمجھائی۔

''بھاگ جاتے ہیں......'' وہ اپنی جگہ پر اچھل گئی۔

میرا مطلب ہے کہیں چلے جاتے ہیں...... مجھے پورے ایک مہینے کی چھٹی ملی تھی جس میں سے پندرہ دن شادی کی رسموں اور دعوتوں میں برباد ہو چکے ہیں۔

اب ہمارے پاس جو وقت بچا ہے وہ ہمیں انجوائے کرنا ہے۔ تو میں نے سوچا ہے کہ ہم دبئی جا رہے ہیں...... واپسی کے ٹکٹس کا شیڈول میں تبدیل کروا لوں گا۔ تم تیاری کرو......'' شہروز نے ایک لمحے میں فیصلہ سنا دیا۔

''یوں اچانک......'' وہ بھی لمحے بھر کو پریشان ہو گئی۔

''تو پھر کیا ہوا...... جانا تو ہے ہی بعد میں نہ سہی کچھ پہلے سہی...... تھوڑا گھومیں گے پھر واپس امریکہ...... وہاں جا کر میرا روٹین بہت ٹف ہو جائے گا' پھر شکایت مت کرنا...... مجھ سے ٹائم بھی نہ مانگنا...... شہروز کا لہجہ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ اس کی ہر بات پر ہاں کہنے والا اسے کچھ مختلف محسوس ہوا۔

پھر شام میں وہ سامان باندھے تیار تھی۔ انکل آنٹی کو شہروز نے نہ جانے کیسے قائل کر لیا تھا۔ ان دونوں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ خوش نہیں تھے مگر مصلحتاً خاموش تھے۔ مناہل کو آنٹی کی نظروں میں ہلکا سا گلہ محسوس ہوا۔ کہیں آپ اس معاملے کا ذمہ دار مجھے تو نہیں سمجھ رہیں...... وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

فلائٹ کی روانگی میں زیادہ وقت نہیں تھا...... سو اس نے میکے جانے کے بجائے وہاں فون کر کے انہیں اپنے جانے کا بتایا۔ نتیجتاً امی بابا اظہر اور مظہر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ایئرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔

اس قدر اچانک روانگی ان لوگوں کے لیے یقیناً تشویش کا باعث تھی۔

مظاہر کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو ایک جا رہا تھا۔ وہ زاہد کی طرف بے بسی سے دیکھ رہے تھے اور وہ نظریں چرا رہے تھے۔

ان دونوں کا آپس کا فیصلہ ہے ہم کیا کر سکتے ہیں آسیہ آنٹی نے بظاہر ہنس کے کہا۔

اور مہناز اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مناہل کو سب لوگوں کی پریشانی دیکھ کر اپنے اندر کے خوف کو دبانا پڑا...... کم پریشان تو وہ بھی نہیں تھی۔ اتنی پریشان تھی کہ گھومنے پھرنے دنیا دیکھنے کا خیال بھی اسے خوش نہیں کر پا رہا تھا۔

ابھی تو وہ شہروز کو سمجھنے کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اس زندگی میں اتنے اُتار چڑھاؤ کی عادی کب تھی؟

مظاہر کی بے چینی دیکھ کر زاہد آگے بڑھے......

''ارے یار پریشانی کی کوئی بات نہیں......ان دونوں کو انجوائے کرنے دو......دو ہفتوں کے بعد ہم انہیں جالیں گے۔'' انہوں نے تسلی دی۔

ان کے لہجے کی بشاشت سے مظاہر کی تھوڑی ڈھارس بندھی۔ ان کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ بحال ہونا شروع ہوا۔

مناہل کے چہرے کو کھوجتی ماں کی نگاہوں نے سراغ پالیا تھا کہ یہ فیصلہ مناہل کا نہیں صرف شہروز کا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔ مہناز نے آگے بڑھ کے مناہل کو گلے سے لگالیا......

''پریشان مت ہونا......تم دور ہو کے بھی دور نہیں ہو ہم سے......'' اس نے بیٹی کے کان میں کہا۔

چیک ان شروع ہوا تو وہ دونوں سب کو الوداع کہہ کر اندر چلے گئے۔ مناہل کی اتری ہوئی صورت مہناز کے دل پر نقش ہوگئی۔ وہ پھر بھی خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ مگر مظاہر کی حالت پتلی تھی۔ زاہد کا ہنسی مذاق اور آسیہ کے قہقہے ماحول کو تھوڑا بہت ہلکا تو بنا رہے تھے مگر درحقیقت مظاہر کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اپنا دکھ نہ چھپایا جارہا تھا اور نہ ہی ظاہر کردینے کی ہمت تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی، اچانک ہی لے گیا اس کو...... میں تو ذہنی طور پر ابھی اسے الوداع کہنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔'' مظاہر نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔

اطہر اور مظہر بھی اُداس تھے...... مگر باپ کو تسلی دینے کے لیے مظہر بولا۔

''آپ پریشان مت ہوں...... میرے بہت سارے دوست ہیں نیویارک میں، اور ان میں سے ایک دو شہروز کو جانتے بھی ہیں۔ میں ان کی پل پل کی خبر رکھوں گا۔'' گھر کی طرف سفر یوں رواں تھا جیسے کوئی اہم چیز کھو گئی ہو۔

''میری بیٹی......اب نہ جانے کب آئے گی۔''

مظاہر کا دل بھر آیا۔ اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ مہناز کے پاس کوئی جملہ نہ تھا جس سے وہ مظاہر کو تسلی دے سکتی......سو وہ خاموش اپنے دکھے دل کو سمجھانے لگی۔

☆......☆......☆

وقت اپنی رفتار سے گزرتا ہے سو گزرتا گیا......

مناہل کی شادی کو چار برس گزر گئے۔ وہ اس دوران صرف ایک بار پاکستان آسکی۔ بھائی کی شادی پر اسے پورے ایک ماہ کی رخصت مل گئی تھی۔ سعدان جتنا خوبصورت اور صحت مند تھا اتنا ہی ضدی بھی...... وہ بچے کو سنبھال سنبھال کر ہلکان ہو جاتی۔ شہروز شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ صرف فون پر ہی مبارکباد دے کر فرض ادا کردیا تھا اس نے......مظاہر کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ شہروز کو کیسے خوش رکھیں۔ وہ اس سے برابر رابطے میں رہتے تھے۔ پاکستان سے مہنگے مہنگے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ وہ نہ ہو کر بھی ان کی پرائیریٹی لسٹ میں سب سے اوپر تھا۔ اتنا اوپر کہ وہ کبھی کبھی منو کو بھی بھول جاتے۔

منو نے ایک بار ماں سے گلہ کیا۔

''امی بابا اب مجھ سے زیادہ شہروز کو چاہنے لگے ہیں۔ ہر وقت کی ان کی باتیں ہی کرتے رہتے ہیں، ان کو گفٹس بھیجتے ہیں۔ اور اکثر میں ان کو یاد نہیں رہتی۔''

مہناز کے دل میں کسک سی اٹھی۔ یہی گلہ تو اسے اپنے باپ سے بھی ہوگیا تھا۔ اب سمجھ میں آیا ہر باپ اپنی لاڈلی کی زندگی آسان بنانے کے لیے اس کے شوہر کو عزت دیتا ہے، محبت دیتا ہے، کبھی کبھی اپنی بیٹی سے بھی زیادہ......

منو خوش تھی یا نہیں......اسے اندازہ نہیں ہوپاتا تھا۔ وہ پہلے سے کمزور ہوگئی تھی، اس کے سارے شوق ہوا ہو چکے تھے۔ اس کا میچنگ کریز اب قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر سعدان کے لیے ممتا

کی چمک تھی تو شہروز کے لیے وہ ایک ذمہ دار بیوی تھی۔

عورت کے زندگی کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ وہ روپ بدل چکی تھی۔ مہناز جانتی تھی کہ وہ جینا سیکھ رہی ہے۔

اس کی زندگی بھی سرد و گرم سے آراستہ ہوگئی وہ اس میں اپنے لیے راستہ بنا رہی ہے۔ کچھ سال اسے ایسے ہی جینا ہوگا۔ ہر عورت کے لیے سوالنامہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مگر ایک سوالنامہ سب کو ہی حل کرنا پڑتا ہے...... شہروز اس سے اور وہ شہروز سے کتنا خوش ہیں یہ مظاہر نہیں جانتے مگر وہ شہروز کو خوش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے...... اپنی بیٹی کا کھونٹا مضبوط کرنا ان کے لیے اب سب سے اہم کام بن گیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی بیٹیوں کے کھونٹے اس طرح کبھی مضبوط نہیں ہوتے۔''

اپنی بیٹی کو سکھ بھری زندگی دینے کی ابتداء کسی دوسرے کی بیٹی کو سکھ دینے سے ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کی وہ بیٹی جسے نکاح کے بول اس مرد کے ساتھ باندھ دیتے ہیں جو اس کا مالک بن جاتا ہے۔

اپنی بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی زیادہ آسان کام ہے بہ نسبت اس کے کہ داماد کو اپنی بیٹی سے حسنِ سلوک پر آمادہ کیا جاسکے۔ بس کسی اور کی بیٹی کو تحفظ دے دیں آپ کی بیٹی از خود محفوظ ہاتھوں میں چلی جائے گی کہ اللہ کسی کا ادھار نہیں رکھتا۔

عورت کی زندگی کا مثلث جس کے تین الگ الگ زاویے اسے تاعمر الجھائے رکھتے ہیں اس کے ایک کونے پر وہ خود دوسرے پر اس کا میکہ اور تیسرے پر شوہر اور سسرال والے ہوتے ہیں اور وہ ان کے درمیان توازن قائم رکھنے کے چکر میں ہلکان رہتی ہے۔ ذرا بے توازن ہوئی تو سارے کے سارے زاویے بگڑ جاتے ہیں زندگی کی Dimension ہی بدل جاتی ہے۔ سب کچھ تہس نہس ہوجاتا ہے۔

مرد جس کی زندگی وہ دائرہ ہے جو اس کی اپنی ذات کے گرد گھومتا ہے۔ خود کو محور بنا کے جینے والا مرد کبھی کبھی دائرے کے بھنور میں پھنس جاتا ہے۔ چکراتا ہے، بے بس ہوجاتا ہے، نہ تو اس بھنور میں ٹھہر پاتا ہے اور نہ نکل سکتا ہے...... بس تنہا رہ جاتا ہے۔

اس نے مثلث کے زاویے بگڑنے سے بچا لیے تھے مگر مظاہر تنہا رہ گیا تھا۔ اس کی تنہائی بانٹنا اب کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس کی آنکھوں میں وہی بے بسی تھی جو کبھی مہناز کو اپنے باپ کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔ اس بے بسی کا علاج اس کے پاس نہیں تھا۔ شہروز کے پاس تھا۔ مگر شہروز اس درد کو سمجھنے کے قابل اس وقت تک نہیں ہوسکتا تھا جب تک وہ خود ایک عدد بیٹی کا باپ نہ بن جاتا۔ اور تب تک بہت دیر ہوچکی ہوتی۔ جیسے ابو کے لیے اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ وہ اپنی بے بسی کے ساتھ دنیا سے جاچکے تھے۔ کہیں ابو بھی تو...... اس کے ذہن میں بھولا بسرا سفید داڑھی والا ایک چہرہ ابھرا جو اس کے نانا کا تھا......

''اوہ...... اوہ...... مکافاتِ عمل...... گزرنا چاہتے ہو تو گزرتے رہو، نہ ختم ہونے والے اس سلسلے کے عذاب سے...... اور اگر بچنا چاہتے ہو تو اپنے قدم، ہاتھ اور زبان روک لو...... عذاب رُک جائے گا۔ طوفان تھم جائے گا۔

اس نے مناہل کو دیکھا...... وہ ٹیرس کے کونے پر سیل فون لیے کھڑی تھی۔ شاید شہروز کا فون آیا ہوا تھا...... اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔

''اللہ تمہیں جلد ایک بیٹی سے نواز دے......'' شہروز کے دل کو پگھلا دے۔

دو آنسو مہناز کی آنکھوں سے نکلے اور ہتھیلی میں جذب ہوگئے۔

☆☆......☆☆

دل دا حال نہ جانے کوئی

لڑکیوں پر بے جا سختی کرنے والے بھائیوں کے لیے ایک دل سوز تحریر

بی بی جان نے قرآن شریف جزدان میں لپیٹ کر شیلف میں رکھا اور پاؤں میں چپل پھنسائے، دروازہ کھول باہر برآمدے میں نکل آئیں جہاں سامنے ہی ٹیبل پر عمار اور عمارہ اسکول جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے، ان پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں یک دم بول اٹھے۔

''السلام علیکم بی بی جان......''

''وعلیکم السلام بچوں جیتے رہو۔'' دونوں بچوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں دعائیں دیتیں وہ کچن کی جانب بڑھ گئیں جہاں سے آتی سوندھی سوندھی پراٹھوں کی خوشبو نے انہیں اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

''السلام علیکم بی بی جان......'' توے سے پراٹھا اتارتی سونیا انہیں دیکھ کر مسکرائی۔

''وعلیکم السلام......''

''ناشتہ دے دوں یا پہلے چائے پئیں گی۔'' جانتی تھی کہ اُس کی دادی ساس ناشتے سے پہلے چائے پیتی ہیں اس لیے پوچھ بیٹھی۔

''نہیں آج میں پراٹھا کھاؤں گی وہیں بچوں کے ساتھ مجھے بھی ناشتہ دے دو۔''

''پراٹھا......'' روٹی بیلتی سونیا کے ہاتھ پل بھر کو رک گئے۔ ہائی کولیسٹرول کے سبب بی بی جان کو پراٹھا کھانا سختی سے منع تھا۔

''ہاں بیٹا...... آج میرا بہت دل چاہ رہا ہے پراٹھا کھانے کو، اس لیے مجھے بھی بنا دو، کل سے پھر پرہیز کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' بنا بحث کیے سونیا نے اُن کی بات مان لی، بی بی جان مسکرا دیں انہیں سونیا کی دوسری تمام عادتوں کی طرح یہ بات بھی بے حد پسند تھی کہ وہ کبھی بھی، کسی معاملے میں بحث نہ کرتی بلکہ خاموشی سے ہر بات مان لیا کرتی۔

''ساتھ میں رات کا سالن گرم کر دینا اب پراٹھے کے ساتھ انڈہ کھا کر میں مزید بدپرہیزی نہیں کر سکتی۔''

تسبیح کے دانے گراتی وہ کچن سے باہر نکلی ہی تھیں کہ انہیں جیسے کچھ یاد آ گیا اور وہیں دروازے پر ہی رک گئیں اور ایک بار پھر سے سونیا کو مخاطب

کیا۔

''شاہ میر نماز پڑھنے مسجد گیا کیا؟''

''جی..... سونیا کی سمجھ میں نہ آیا وہ انہیں کیا جواب دے۔

''میں نے دیکھا نہیں ہو سکتا ہے گیا ہو۔''

گول مول جواب دے کر وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی جبکہ بی بی جان سمجھ گئیں کہ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔

''جانے یہ لڑکا کس ڈھیٹ مٹی کا بنا ہے مجال ہے جو کسی کی بات کا ذرا سا بھی اثر ہو۔''

بڑبڑاتے ہوئے وہ تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھیں جب اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر صاعقہ باہر آئیں اور بی بی جان پر نظر پڑتے ہی ساری بات اُن کی سمجھ میں آ گئی۔

''شاہ میر نماز پڑھنے نہیں گیا؟'' وہ سونیا کی جانب دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولیں جو جلدی جلدی بچوں کے بیگ میں لنچ باکس رکھ رہی تھی کیونکہ باہر وین والا مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔

''نہیں! بی بی آپ جانتی تو ہیں کہ وہ رات ہی اتنا لیٹ آتا ہے اور پھر صبح کہاں جلدی اٹھتا ہے۔''

''اُس کا رات لیٹ آنا ہمارا مسئلہ نہیں ہے لیکن صبح نماز پڑھنا تو اُس پر فرض ہے۔''

ناگواری کے ساتھ ہلکا سا غصہ بھی ان کے لہجے میں در آیا۔

''اٹھئے' آج ذرا اُس کے باوا سے بات کرتی ہوں سمجھائیں اپنے لاڈلے بیٹے کو کل اللہ کے پاس

کیا منہ لے کر جائیں گے غضب خدا کا اپنی ساری عمر دوسروں کو درس دیتے گزر گئی اور یہاں یہ عالم ہے کہ اپنی سگی اولاد نماز روزے سے منکر......"

انہیں غصہ سے بڑبڑاتا چھوڑ کر سونیا باہر گیٹ کی جانب بڑھ گئی تا کہ بچوں کو وین میں سوار کروا سکے کیونکہ انہیں اسکول کے لیے دیر ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

باجرے کی تھیلی کھول کر اُس نے چھت پر رکھے مختلف برتنوں میں باجرہ ڈالا جس کے ساتھ ہی پرندے برتن کے آس پاس منڈلانے لگے' انہیں دانہ چگتا دیکھتے ہوئے وہ کچھ دور رکھی لوہے کی پرانی سی ٹوٹی پھوٹی کرسی پر جا بیٹھی جب یک دم نیچے سے آتی امرود والے کی آواز نے اُس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی' ہرے ہرے مصالحے والے امرود اس کی ہمیشہ سے کمزوری رہے تھے جلدی سے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگ کر چھت کی منڈیر پر جا پہنچی تا کہ نیچے سے جاتے امرود والے کو آواز دے کر روک سکے۔ شومئی قسمت نیچے جھانکتے ہی اُس کی پہلی نگاہ گھر کے گیٹ کے عین سامنے کھڑے شہباز بھائی پر پڑی۔ جو اپنی موٹر سائیکل کو کپڑا مار کر صاف کر رہے تھے وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی جب اسی پل شہباز نے ایک نظر اوپر ڈالی جہاں کھلے سر کے ساتھ ملائکہ نیچے جھانک رہی تھی اُس کا موڈ یکدم ہی خراب ہو گیا وہ کپڑا موٹر سائیکل کی گدی پر پھینکتا' تیزی سے گیٹ کھول کر گھر کے اندر داخل ہوا سامنے ہی فاخرہ کھڑی تھیں۔

"ملائکہ کہاں ہے؟"

جاننے کے باوجود وہ ماں سے جواب سننا چاہتا تھا۔ شاید چھت پر پرندوں کو دانہ ڈالنے گئی ہے۔

"آپ کو میں نے ہزار بار منع کیا ہے اسے چھت پر مت بھیجا کریں مگر شاید آپ کی سمجھ میں میری کوئی بات نہیں آتی۔"

"ارے اپنے گھر ہی کی چھت ہے کون سا کہیں پڑوس میں گئی ہے جو تم اس قدر واویلا مچا رہے ہو۔"

دل ہی دل میں تھوڑا سا گھبراتے ہوئے وہ بظاہر دبنگ لہجے میں بولیں۔

"چھت پر جانے کے بھی کچھ طریقے ہوتے ہیں اماں' آپ کی مہارانی ابھی بنا دوپٹہ' کھلے بالوں کے ساتھ منڈی پر لٹکی ہوئی تھیں وہ تو میں نے دیکھ لیا تو نیچے اتر گئی ورنہ جانے یہ نظارہ اور کون کون کرتا اور ویسے بھی سارے محلے کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور اس وقت ہر غنڈہ' موالی اپنے گھر کی چھت پر کھڑا ایسی بدمست لڑکیوں کے نظارے کر کے اپنی آنکھیں سینک رہا ہوتا ہے۔"

سیڑھیوں سے نیچے آتی ملائکہ کے کانوں سے جیسے ہی شہباز کے الفاظ ٹکرائے وہ اپنی جگہ سن ہو گئی بھائی کے آخری جملے نے اُس کی ٹانگوں کو شل کر دیا دل چاہا نیچے جا کر دو چار کراری باتیں سنائے مگر اُس کا دل بلاوجہ لڑائی بڑھانے کو نہ چاہا مگر شہباز کی سوچ اور اُس کے الفاظ نے اس لمحہ اُسے بے حد دکھی کر دیا۔

"اچھا میں سمجھا دوں گی آئندہ احتیاط کرے گی۔"

شہباز کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے فاخرہ آہستہ سے بولی۔

"اچھی طرح سمجھا دیں ورنہ میں نے سمجھایا تو آپ کو سخت برا لگے گا۔"

غصے سے کہتا وہ جس تیزی سے اندر آیا تھا اُسی تیزی سے واپس پلٹ گیا فاخرہ نے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر قدم رکھا تھا کہ نگاہ اوپر سے آتی ملائکہ پر پڑ گئی جس کے چہرے پر چھائی سرخی اور شکن آلود پیشانی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ کچھ دیر قبل ہونے

والی ماں اور بھائی کی ساری گفتگو سن چکی ہے۔
"کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں بنا دوپٹہ چھت پر مت جایا کرو اور تم یہ دیوار پر ٹنگی کیا کر رہی تھیں؟"
ملائکہ کے خفگی بھرے چہرے کو نظر انداز کرتی وہ سوال گو تھیں۔
"مجھ سے کوئی بھی سوال کرنے سے پہلے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آپ اپنے بیٹوں کو بات کرنے کی تمیز سکھا دیں کہ گھر میں موجود بہنوں کے لیے کس طرح کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔"
"بیٹا جب تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے باپ بھائیوں کو لڑکیوں کا اس طرح شتر بے مہار پھرنا ناپسند ہے تو تھوڑی تم ہی خود کو بدل لو۔"
ماحول میں پھیلی گرمی کو کم کرنے کے لیے فاخرہ کو لہجہ نرم کرنا پڑا۔
"شتر بے مہار......"
ماں کے منہ سے نکلنے والے جملے نے ملائکہ کو مزید دکھی کر دیا۔
"سارا دن قیدیوں کی طرح گھر میں بند رہنا' شتر بے مہاری ہے؟ حد ہے اماں یہاں تو گھر کی چھت پر جانے سے پہلے بھی اجازت نامہ لینا ضروری ہے میرا خیال ہے آپ لوگوں نے کبھی شتر بے مہار لڑکیاں دیکھی نہیں اس لیے میرے جیسی شریف لڑکی کے لیے اس طرح کے فضول الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں امرود والے کی آواز سن کر چھت سے کیا جھانک لیا آپ لوگوں نے تو مجھے ذلیل و خوار ہی کر دیا حد ہوتی ہے بے اعتباری کی بھی......"
غصہ سے بولتی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ جبکہ پیچھے کھڑی رہ جانے والی فاخرہ کی سمجھ میں نہ آیا کس کا ساتھ دیں بیٹی یا بیٹا جبکہ دونوں کے نزدیک ہی وہ خود درست تھے اور دوسرا غلط......

☆......☆......☆

چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا ایسے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ایک عجیب سا سماں پیدا کر رہی تھی زمان نے ایک نظر اپنی ریسٹ واچ پر ڈالی ابھی صرف دس بجے تھے لیکن گاؤں کی گلیوں میں طاری سناٹا آدھی رات کا منظر پیش کر رہا تھا ایسے میں دور کہیں بھونکتے کتوں کی آوازیں ماحول کو مزید خوفناک بنا رہی تھیں مگر زمان کے لیے یہ سب کچھ نیا نہ تھا اُس کا سارا بچپن ان ہی گلیوں میں گزرا تھا۔ وہ اس ماحول کا عادی تھا اسی لیے اندھیرے میں آس پاس سے گزرتے نظارے دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ جب کریم چاچا نے تانگا روکا وہ یک دم چونک اٹھا۔
"گھر آ گیا؟" خود سے سوال کرتا وہ تانگے سے اچک کر نیچے اتر آیا اس کے ساتھ کریم چاچا بھی گھوڑے کی لگام باندھتا اُس کے قریب آن کھڑا ہوا۔
"شکریہ چاچا آپ نہ ہوں تو اتنی رات میں میرا اسٹیشن سے گھر آنا کس قدر مشکل ہو جائے۔"
"شکریہ تو اپنی ماں کا ادا کر وہ صبح سے کئی چکر اڈے پر لگا چکی ہے ہر بار یہ یقین دہانی کروانے کے لیے کہ زمان نے آج آنا ہے۔ ویلے سے ہی اسٹیشن چلے جانا سردیوں کے دن اور کالی سیاہ رات میرا بچہ پریشان نہ ہو جائے۔"
ہنستے ہوئے کریم چاچا نے سیٹ کے نیچے سے اس کا بیگ پکڑ کر کھینچا جب اُسی پل گھر کا دروازہ کھول کر نیناں اور اماں باہر نکل آئیں۔
"ماں صدقے میرا پتر آ گیا۔"
اماں نے آگے بڑھ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔
"لے بھئی سنبھال اپنے ویر کا بیگ میں گھر چلا'

اس ویلے تک صرف اسی ایک سواری کے انتظار میں اسٹیشن پر بیٹھا تھا۔''

دروازے کے پاس بیگ رکھ کر کریم چاچا واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ زمان کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

''ایک منٹ چاچا......'' آواز دے کر اُس نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور اوپر ہی رکھا لفافہ باہر کھینچ لیا جس میں خاکی رنگ کی گرم چادر باہر جھانک رہی تھی آگے بڑھ کر اُس نے لفافہ کریم چاچا کی جانب بڑھایا۔

''یہ میں لاہور سے آپ کے لیے لایا ہوں۔''

''ارے پُتر اس کی کیا ضرورت تھی۔''

منع کرتے ہوئے کریم چاچا نے اُس کے ہاتھ میں تھا لفافہ پکڑ لیا خوشی اُن کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

''خوش رہو ہمیشہ شاد و آباد رہو۔''

اُسے دعائیں دیتے وہ ایک بار پھر تانگے کی جانب بڑھ گئے۔ زمان جانتا تھا کہ کریم چاچا کرایہ کی مد میں اُس سے کوئی رقم نہ لیں گے اسی لیے وہ ہمیشہ جب بھی چھٹیوں میں گاؤں آتا اُن کے لیے تحفتاً کچھ نہ کچھ لے آیا کرتا اس کا لایا ہوا تحفہ کریم چاچا کے لیے کسی انمول دولت سے کم نہ ہوتا جس کا اندازہ اُسے ہمیشہ کریم چاچا کے چہرے پر پھیلی خوشی دیکھ کر ہو جاتا اور کریم چاچا کے چہرے کی خوشی زمان کو بھی خوش کر دیتی۔

☆......☆......☆

وہ کلاس لے کر باہر نکلا تو پہلی نگاہ سامنے کھڑی ماہا پر پڑی جسے دیکھتے ہی شاہ میر کے چہرے پر رونق آ گئی۔ یہ ہی تو وہ ہستی تھی جس کی خاطر وہ اتنی جدوجہد کر کے روز یونیورسٹی آتا ورنہ اُس کا تعلق تو ایک کاروباری گھرانے سے تھا جہاں میٹرک' انٹر کے بعد لڑکے اپنے باپ کا کاروبار سنبھالتے' اس کے بڑے دونوں بھائی بھی بمشکل انٹر پاس تھے' بڑے والے عمیر شہر کے معروف علاقے میں جوتوں کی دکان چلاتا تھا جبکہ چھوٹا' اباجی کے ساتھ ان کی دکان پر بیٹھا' شاہ میر شروع سے ہی پڑھنے میں اچھا تھا۔ اس کی دلچسپی اور رجحان کو دیکھتے ہوئے اباجی نے انٹر کے بعد اُسے آگے پڑھنے کی اجازت دے دی۔

ماہا فرسٹ ایئر سے ہی اُس کی کلاس فیلو تھی۔ جس کا تعلق ایک ماڈرن گھرانے سے تھا وہ اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتی جبکہ اُس کی نسبت شاہ میر کا گھرانہ خاصا مذہبی اور قدامت پسند تھا جہاں تنہا عورت کا گھر سے باہر نکلنا ہی خاصا معیوب سمجھا جاتا ایسے میں گاڑی ڈرائیو کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ اس کی ماں اور دونوں بھابیاں شرعی پردہ کرتیں جبکہ اباجی دکان داری کے ساتھ ساتھ ہر ہفتہ مسجد میں درس بھی دیا کرتے اور اکثر ہی مذہبی اجتماعات میں شرکت کے لیے شہر سے باہر ہوتے۔

شاہ میر کو اپنے گھر کا گھٹا ہوا ماحول بالکل پسند نہ تھا جہاں اباجی کی اجازت کے بنا کوئی پتہ بھی نہ ہل سکتا تھا اُس کی نسبت شاہ میر کے تمام دوست اور اُن کے گھرانے خاصے آزاد تھے۔ خاص طور پر ماہا جس کی والدہ ایک این جی او چلاتی تھیں اور اس کے والد خاصے آزاد خیال تھے۔ شاہ میر جب بھی ماہا کے ساتھ اُس کے گھر جاتا ایک عجیب سی احساس کمتری میں گھر جاتا ایسے میں اُسے اپنی ماں اور بھابیاں خاصی بیچاری سی لگتیں جن کی اپنی کوئی مرضی ہی نہ تھی اور ایک ماہا کی مما جن کی مرضی کے آگے اس کے والد کبھی چوں بھی نہ کرتے یہ ہی وہ فرق تھا جو شاہ میر کو ہمیشہ ماہا کے گھر جانا' اُس کی مما سے بات کرنا بہت اچھا لگتا وہ اِن ہی سوچوں میں گم تھا جب ماہا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''ہیلو شاہ میر' کیا سوچ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں......''

آہستہ سے جواب دیتا وہ ہنستا ہوا اُس کے قریب آن کھڑا ہوا' ماہا کے بدن سے پھوٹتی کلون کی خوشبو کو اُس نے سانس کے ذریعے اپنے اندر اتارا۔

''میرا اسائنمنٹ بنا دیا؟'' ماہا ایک ہفتہ بعد دبئی سے آئی تھی جاتے ہوئے اپنے ایک اسائنمنٹ کا کام وہ شاہ میر کو سونپ گئی تھی اُس کے ایسے سارے کام ہمیشہ شاہ میر ہی کیا کرتا۔

''ہاں......''

جواب کے ساتھ ہی شاہ میر نے ہاتھ میں پکڑی فائل اُس کی جانب بڑھا دی۔

''تھینک یو سوچ شاہ میر آئی لو یو۔'' فائل تھامتے ہی اُس نے مارے خوشی کے شاہ میر کے ہاتھ کو چوم ڈالا اُس کی اِس حرکت نے جیسے شاہ میر کے جسم میں زندگی دوڑا دی وہ یکدم ہی کھل اٹھا۔

''یہ دیکھو میں تمہارے لیے دبئی کے پرفیوم لے کر آئی ہوں۔'' اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر اُس نے ایک بکس باہر نکلتے ہوئے شاہ میر کی جانب بڑھایا۔

''اور ہاں آج رات گھر آ جانا مما نے ڈنر پر بلایا ہے۔'' جاتے جاتے وہ اُسے ہدایت کرنا نہ بھولی اور اس ہدایت کے ساتھ ہی شاہ میر کو اپنے ابا اور دادی یاد آ گئے جو گھر لیٹ جانے کی صورت میں اُسے وہ لتاڑ دیتے کہ وہ کوشش کرتا کہ دوبارہ کبھی لیٹ نہ ہوتا کہ کسی کی باتیں سننے کو نہ ملیں مگر ماہا کی جانب سے ملنے والی محبت بھری دعوت اُس کے سارے ارادوں کو تعمیر سے قبل ہی زمین بوس کر دیتی۔

☆......☆......☆

اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم
تمہارے بنا بھلا ہم کیا جئیں گے

ڈسٹنگ کے ساتھ زور وشور سے گانا گاتی ملائکہ کی زبان کو یکدم جیسے بریک لگ گیا۔ جب بیرونی دروازہ کھول کر عثمان صاحب اندر داخل ہوئے۔

''السلام علیکم ابا جی......'' سلام کے ساتھ ہی اُس نے اپنے دوپٹے کی تلاش میں یہاں وہاں نظر دوڑائی۔

''وعلیکم السلام......'' جواب دیتے ہوئے عثمان صاحب نے ایک ناگوارسی نگاہ اپنے سامنے بنا دوپٹہ کھڑی ملائکہ پر ڈالی جب اُسی پل فاخرہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر دوپٹہ اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔

''دوپٹے کا وزن اتنا زیادہ تو نہیں جو تم کام کے دوران اُسے یہاں وہاں پھینک کر بھول جاؤ۔''

''سوری ابا جی دراصل میں کتنی بھی کوشش کروں دوپٹہ اوڑھ کر مجھ سے کوئی کام ہوتا نہیں۔''

فاخرہ کے گھورنے کے باوجود اُس نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی جبکہ اس کی بات سنتے ہی عثمان صاحب کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ کر غائب ہوگئی۔

''میری تو خیر ہے بچہ' ابھی اگر شہباز آ جاتا تو بڑا ناراض ہوتا تم جانتی ہو اُسے اس طرح گھر میں گانا بجانا بھی اُسے ناپسند ہے۔''

''ہونے دیں ناراض! اُسے تو عادت ہے بلاوجہ دوسروں پر رعب جمانے کی۔'' لاپرواہی سے کہتی وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی عثمان صاحب تھوڑی دیر کھڑے اُسے دیکھتے رہے پھر خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

''یہ اس ٹائم تم اتنا تیار ہو کر کہاں جا رہے ہو؟'' شاہ میر کو تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلتا دیکھ کر صاعقہ نے دیوار گیر گھڑی پر ایک نظر ڈالی جو رات کے دس بجا رہی تھی۔

''ابھی صرف دس بجے ہیں امی......'' لاپرواہی

سے جواب دیتا وہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھا جب اُسی پل باہر کا دروازہ کھول کر بلال صاحب اندر داخل ہوئے۔

''السلام علیکم بابا جان......'' باہر کی جانب بڑھتے شاہ میر کے قدم سست پڑ گئے۔

''وعلیکم السلام یہ اتنا تیز پرفیوم تم نے لگایا ہے......''

''جی میرا دوست دبئی سے لایا تھا۔''

''تمہیں شاید علم نہیں پرفیوم میں الکحل ہوتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ اپنے دوستوں سے کہہ دو تمہیں تحفہ میں عطر دیا کریں استغفار......''

''ساری دنیا پرفیوم استعمال کرتی ہے اب اگر آپ کے گھر میں اس کا پرہیز ہے تو ضروری نہیں کہ میں سب کو یہ بتاؤں کہ ہم عطر استعمال کرتے ہیں تحفہ وصول کرتے وقت اپنی پسند کا اظہار کم از کم مجھے مناسب نہیں لگتا۔''

کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا اس کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''حد ہے یار کس طرح کے لوگ میں یہ عجیب 'کھاؤ ان کی مرضی کا' پہنو ان کی پسند کا' یہاں تک کہ بندہ پرفیوم بھی استعمال نہ کرے کہ ہمارے بابا جان کو پسند نہیں' اس زمانے میں اتنے دقیانوسی لوگ کہ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔''

غصے سے بڑبڑاتا وہ باہر روڈ پر آ گیا ماہا کا گھر شہر کے مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ ایسے میں اُسے اچھا نہ لگا کہ وہ رکشہ میں بیٹھ کر وہاں تک جائے جبکہ موٹر سائیکل عمیر بھائی لے گئے تھے یہ ہی سوچتے ہوئے اُس نے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس باہر نکالا کہ اُس میں موجود رقم گنی' آج صبح ہی اُسے بی بی جان نے کچھ اضافی رقم دی تھی جو پرس میں ابھی بھی موجود تھی۔ دل ہی دل میں حساب لگاتا شاہ میر ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا صرف ماہا کے گھر جانے کا مسئلہ تھا واپسی میں تو یقیناً اُسے ماہا کا ڈرائیور گھر تک چھوڑ جاتا کیونکہ اکثر جب کبھی موٹر سائیکل نہ ہوتی ماہا خود اُسے گھر تک چھوڑ جایا کرتی یا پھر ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیتی یہ ہی سوچ کر اُس نے اطمینان سے ٹیکسی لی اور ماہا کے گھر کی جانب رواں دواں ہو گیا جہاں پہنچ کر اُسے ہمیشہ زندگی کا احساس ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

''میں نے ڈبے میں انڈے کا حلوہ رکھ دیا ہے صبح کالج جاتے ہوئے کھا جایا کرنا اور ہاں یہ دیسی گھی اور بادام ہیں یہ بھی رکھ لے اتنی مشکل پڑھائی میں جب تک اچھا کھایا پیا نہ جائے بندہ ہی بیمار ہو جاتا ہے۔'' فکر مندی سے کہتی امی نے جیسے ہی اُس کے بیگ میں دیسی گھی رکھنا چاہا زمان نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

''دیسی گھی رہنے دیں یہ وہاں میرے لیے بے کار ہو جاتا ہے کیونکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ کھانا مجھے ہوسٹل سے ہی ملتا ہے۔''

''پر پتر صبح روٹی پر تو لگا کر کھا سکتا ہے کہ نہیں......''

''نہیں اماں وہاں چائے کے ساتھ پاپے ملتے ہیں' پراٹھے والا شوق تو اماں تو ہی پورا کرتی ہے اور ہوسٹل میں ماں نہیں ہوتی۔''

''اچھا......''

انہوں نے کچھ دیر سوچا اور سلور کا ڈبہ بیگ سے باہر نکال لیا۔

''یہ دیسی انڈے ہیں ایسے لے جا سکتا ہے یا اِن پر بھی پابندی ہے۔''

''یہ لے جاؤں گا آپ باہر ہی رکھ دیں بیگ میں ٹوٹ جائیں گے۔'' عطیہ نے دیسی انڈے ایک

گتے کے ڈبے میں ڈال کر زمان کے سامان کے قریب ہی رکھ دیے۔

''چھ مہینے تیرے آنے کا انتظار کرتی ہوں اور تُو دس دن میں ہی واپس لوٹ جاتا ہے۔''

بیٹے کی جانب دیکھتی وہ پیار بھری حسرت سے بولی۔

''بس اماں دو سال رہ گئے پھر لوٹ کر تیرے پاس ہی آنا ہے۔''

شاہ زمان نے لاڈ سے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اللہ تجھے کامیاب کرے میرے پتر اُس سوہنے رب نے ہمت دی تو تجھے سرجن بننے باہر کے ملک بھیجوں گی۔''

''ابھی چھ ماہ بعد آتا ہوں تو اتنی پریشان ہوتی ہو وہاں سے چھ سال بعد آؤں گا پھر بتاؤ تنہا میرے بنا کیا کرو گی۔''

''قربانی ماں کی ذات کا ایک ایسا حصہ ہے جو وہ ہمیشہ اپنی اولاد کی کامیابی کے لیے دیتی آئی ہے اور میں بھی یہ ہی چاہتی ہوں کہ میرا پُتر ایک نامور سرجن بنے اور اُس کے لیے جو مجھ سے ہو سکا میں ضرور کروں گی۔''

عطیہ کے لہجے میں عزم کے ساتھ ساتھ دکھ کی لہر بھی اتر آئی۔

''وہ تکلیف جو تیرے باپ کی بیماری کی صورت میں' میں نے دیکھی ہے نہیں چاہتی کہ کوئی جوان عورت اس طرح اپنے شوہر کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتا دیکھے اسی لیے چاہتی ہوں کہ تو ایک اچھا ڈاکٹر بن اور پھر جہاں تک ہو سکے غریبوں کا مفت علاج کر تجھے ڈاکٹر بنانا صدقہ جاریہ ہے جو میں نے تیرے باپ کے نام پر کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ صرف دس سال کا تھا جب اُس کا باپ ہیپاٹائٹس جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر انہیں اس دنیا میں تنہا چھوڑ گیا اور پھر جس طرح اس کی ماں نے ان دونوں بہن بھائیوں کی پرورش کی وہ ایک الگ تکلیف دہ داستان تھی۔

مگر پھر بھی اُس نے اپنی کوششوں سے اُن دونوں کو ایک کامیاب انسان بنا دیا یہ اُسی کی محنت اور ہمت کا ثمر تھا کہ زمان آج لاہور کے ایک میڈیکل کالج میں تیسرے سال کا طالب علم تھا جبکہ اُس سے چھوٹی نین تارا گاؤں کے قریبی کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی اور عطیہ کی جان اپنے ان دونوں بچوں میں ہی اٹکی رہتی تھی۔ جن کی کامیابی کے لیے وہ ہر لحہ دعا گو تھی۔

''انشاء اللہ امی آپ بس ہمارے لیے دعا کیا کریں۔'' ماں کو خود سے قریب کرتے ہوئے زمان کا لہجہ بھیگ گیا۔

''میری تو ہر دعا تم دونوں کے لیے ہی ہے۔''

''اماں چاچا ٹانگا لے کر آ گیا ہے۔'' ماحول کے بوجھل پن کو نین تارا کی تیز آواز نے قدرے کم کر دیا۔

''جا پتر رب راکھا شہر پہنچتے ہی اطلاع کر دینا۔''

ماں سے مل کر زمان بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا وہ جب بھی گھر آتا واپسی میں بہت اُداس ہوتا شہر جا کر کئی دنوں تک اُسے گاؤں کے لوگ' وہاں کی گلیاں' کھیت' کھلیان اور سنگی بیلی یاد آتے اور پھر آہستہ آہستہ کئی دنوں بعد وہ شہر کے ماحول میں رچ بس جاتا ویسے بھی وہ بنیادی طور پر ایک دیہاتی بندہ تھا یہ ہی سبب تھا جو اُسے اپنے آبائی ماحول سے جو محبت اور انسیت تھی وہ آج اتنے سال بعد بھی ختم نہ ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

''کہاں سے آرہی ہو تم؟'' اس نے زوہا کے گھر سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ سامنے سے آتے شہباز کی اُس پر نظر پڑ گئی۔

''زوہا کے گھر سے نظر نہیں آرہا؟''

لاپرواہی سے جواب دیتی اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی وہ گھر کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہی ہوئی تھی کہ شہباز اُس کے سر پر آن پہنچا۔

''تم بات کرنے کی تمیز شاید بھول گئی ہو۔''

''میں زوہا کے گھر کے گیٹ سے باہر نکلی تھی تو ظاہر ہے اُسی کے گھر سے آرہی تھی پھر آپ کو ایسا سوال ہی نہیں کرنا چاہیے تھا جس کا جواب میں اتنا اُلٹا سیدھا دیتی کہ......''

''کیا بات ہے ملائکہ کیوں بھائی سے اتنی بدتمیزی کر رہی ہو۔''

اس سے قبل کہ بات مزید آگے بڑھتی امی ان دونوں کے درمیان آگئیں۔

''بدتمیزی......''

ملائکہ نے حیرت سے انہیں دیکھا اور ایکدم ہی ہنس دی۔

''میں صرف ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی وہ بھی اگر آپ لوگوں کو بدتمیزی لگتا ہے تو بہتر ہے کہ مجھ سے بات ہی نہ کیا کریں۔''

اتنا کہہ کر وہ وہاں رُکی نہیں تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

''یہ سب ابا کا قصور ہے جو اِسے اتنا سر چڑھا رکھا ہے دونوں بڑی والیوں کو دس پڑھاتے ہی اپنے گھر کا کر دیا اِسے جانے کیوں اس گھر میں ہمارے لیے عذاب بنا کر رکھا ہے۔''

ملائکہ کو اس طرح جاتا دیکھ کر شہباز نے غصے سے دانت پیستے ہوئے ماں کو گھورا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا یہ گھر جتنا تمہارا ہے اتنا ہی اُس کا بھی ہے شرم کرو چھوٹی بہن ہے وہ تمہاری جسے تم عذاب کا نام دے رہے ہو۔'' شہباز نے جواب نہیں دیا۔

''اور ہر وقت چھوٹی چھوٹی بات پر تکرار مت کیا کرو اس طرح عزت کم ہو جاتی ہے بلاوجہ چھوٹوں کے منہ نہیں لگتے۔''

بیٹے کو خاموش کھڑا دیکھ کر ماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ بات کبھی اُسے بھی سمجھایا کریں کہ بڑوں سے بات کرنے کی تمیز سیکھے۔''

''میں نے آپ کو منع کیا تھا نہ کہ اُسے اس وقت باہر مت جانے دیا کریں سارے محلے کے آوارہ لڑکے گلی کے کونے پر جمع ہیں۔''

''ارے تو وہ کیا میری بچی کے لیے جمع ہیں؟ حد ہے بلاوجہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنا بڑا کر دیتے ہو۔''

غصے میں برا سا منہ بناتی فاخرہ اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی جبکہ شہباز کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا پھر ان کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆......☆......☆

صاعقہ نے محسوس کیا شاہ میر کچھ دنوں سے اُلجھا اُلجھا سا تھا شاید وہ کچھ پریشان تھا یا صاعقہ کو ایسا لگ رہا تھا جو بھی تھا وہ کچھ خاموش خاموش تھا یہ ہی دیکھتے ہوئے ایک دن صاعقہ اس کی پریشانی کی وجہ پوچھ بیٹھی۔

''میں کاروبار کرنا چاہتا ہوں۔''

شاہ میر کی جانب سے آنے والا جواب خاصا غیر متوقع تھا جس نے صاعقہ کو حیران کر دیا۔

''تو اِس میں پریشانی والی کیا بات ہے اپنے باوا کے ساتھ دکان پر جایا کرو تا کہ کاروبار کی کچھ سوجھ بوجھ آئے۔''

''میں بزنس پڑھ رہا ہوں امی الحمد للہ مجھے

کاروبار کی ساری سوجھ بوجھ ہے ضرورت صرف پیسے کی ہے آپ بابا سے کہیں مجھے اپنے ذاتی کاروبار کے لیے کچھ رقم مہیا کریں۔''

''ذاتی کاروبار......'' کچھ پل رک کر صاعقہ نے بیٹے کی جانب دیکھا۔

''تمہارے باپ دادا صدیوں سے جوتوں کا کاروبار کرتے آرہے ہیں تم بھی یہ ہی سیکھو اور اللہ کا نام لے کر شروع کرو۔''

''مجھے جوتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لیے میں یہ کام نہیں کرسکتا۔''

''تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

آج کا دن شاید صاعقہ کے لیے حیرت کا دن تھا اس لیے وہ مزید حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

''مجھے گارمنٹس کا کام شروع کرنا ہے آپ بابا سے کہیں ڈالمین میں میرے لیے کوئی دکان دیکھیں۔''

یہ سبق اُسے پچھلے کئی دنوں سے ماہا پڑھا رہی تھی کیونکہ اس کے والد گارمنٹس کا بزنس کرتے تھے اور کراچی کے علاوہ بھی ان کی کئی شہروں میں کپڑوں کی بڑی بڑی دکانیں تھیں ورنہ تو شاہ میر کو کبھی بھی بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''جو کام کبھی کسی نے کیا ہی نہیں وہ تم کیسے کرو گے؟ اور پھر اتنی مہنگی جگہ پر دکان لینا اور اس کے کرایہ کی ادائیگی ایسے میں بھلا بچت کیا ہوگی۔''

''وہ میرا مسئلہ ہے اماں آپ لوگوں کا کام صرف مجھے پیسہ فراہم کرنا ہے اس کے بعد کیا کرنا ہے وہ میں سب کرلوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

اطمینان سے جواب دیتا وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ بابا کو بتادیں پھر میں خود اُن سے بات کرلوں گا۔''

اور تو سب ٹھیک تھا مگر شاہ میر کی ڈیمانڈ ان کی حیثیت سے زیادہ تھی اسی سوچ نے صاعقہ کو پریشان کردیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ڈالمین میں کاروبار شروع کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم درکار ہوگی اور شاید یہ رقم فراہم کرنا عثمان صاحب کے لیے مشکل ہوجائے جبکہ وہ شاہ میر کی ضدی فطرت سے بھی بخوبی واقف تھیں جانتی تھی کہ اب جو بات اُس کے منہ سے نکل گئی ہے اُس سے ایک انچ پیچھے ہٹنا شاہ میر کے نزدیک ناممکن ہے انہیں حیرت تھی کہ وہ نوکری کا شوق چھوڑ کر کاروبار کی سمت کیسے آگیا۔

☆......☆......☆

''تم ابھی تیار نہیں ہوئیں اور یہ صحن میں اتنا پانی کہاں سے آیا۔'' اُلجھے بالوں کے ساتھ صحن میں وائپر لگاتی ملائکہ کو دیکھ کر فاخرہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''کیوں؟ کہیں جانا ہے کیا؟''

فاخرہ کی جانب سے آنے والا دوسرا سوال اُس نے قطعی نظر انداز کردیا۔

''تمہیں رات بتایا تو تھا کہ آج سونیا کے گھر دعوت ہے اور اس نے خاص طور پر تاکید کی ہے کہ میں تمہیں ساتھ لے کر آؤں۔''

''اُف......آپی کے گھر دعوت قطعی نہیں۔''

وہ نفی میں اپنی گردن ہلاتے ہوئے انتہا سے زیادہ بوریت بھرا گھر جہاں بندہ اونچی آواز میں سانس بھی نہیں لے سکتا۔

اُسے سونیا کے گھر کا ماحول قطعی ناپسند تھا اور اپنی اس ناپسندیدگی کا اظہار وہ اکثر بہن کے سامنے بھی کردیا کرتی تھی جس کا وہ کبھی برا نہیں مناتی۔

''بری بات ہے بیٹا ایسا نہیں کہتے سونیا کا سسرال ایک دین دار گھرانہ ہے جو اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے دنیاوی لغویات سے دور ہیں۔''

''بس کریں امی ایسا بھلا اس زمانے میں

کہاں ہوتا ہے۔ گھر میں نہ ٹی وی نا ریڈیو، کوئی زمانے کی خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟''

''وہ پہلے کون سا ٹی وی ریڈیو کی شوقین تھی میری بچی تو خود ان تمام لغویات کی سخت مخالف ہے پتہ نہیں تم میں یہ سارے شوق کہاں سے آ گئے ورنہ سونیا اور سامیہ نے خود کبھی ٹی وی پر کوئی فضول پروگرام نہیں دیکھا وہ دونوں بچیاں تو ٹی وی جیسی موذی بیماری سے قدرے دور تھیں۔''

''میں زندہ ہوں امی زندہ.....'' فاخرہ کی بات کاٹ کر وہ زور سے ہنس دی۔

جبکہ سونیا آپی اور سامیہ تو ہمیشہ سے ہی مردہ تھیں مردہ دل، کوئی تفریح اور نہ ہی کوئی لائف.....''

''اچھا چھوڑو ان تمام باتوں کو، اور تم جا کر تیار ہو جاؤ مجھے تنہا دیکھ کر تمہاری آپی سخت ناراض ہوں گی۔''

''سوری امی معذرت فی الحال آپی کے گھر جانے کا کوئی موڈ نہیں ہے کیونکہ آٹھ بجے رات ٹی وی پر میرا پسندیدہ شو آنے والا ہے جسے میں کسی حال میں مس نہیں کر سکتی۔''

وائپر دیوار سے لگا کر اُس نے موٹر کے پائپ سے اچھی طرح اپنے پاؤں دھوئے اور قریبی چارپائی پر رکھی مصالحے دار املی کا پیالہ اٹھائے اوپر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جب اسے پیچھے سے آواز دے کر فاخرہ نے روکا۔

''چھت پر مت جانا شہباز گھر ہی ہے ایسا نہ ہو میری غیر موجودگی میں تم دونوں آپس میں اُلجھ پڑو۔''

''میں نہیں اُلجھتی آپ اپنے بیٹے کو سمجھا کر جائیں بلاوجہ میرے منہ مت لگیں۔''

جواب دے کر وہ رُکی نہیں اور تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔

☆......☆......☆

''تجارت کا حکم تو اللہ کے نبی ﷺ نے بھی دیا ہے اور اسی میں برکت ہے۔''

صاعقہ کی ساری بات سن کر عثمان صاحب نے دھیرے سے اپنی بات شروع کی۔

''اس حوالے سے مجھے خوشی ہے کہ شاہ میر کا دماغ بھی تجارت کی جانب راغب ہوا شکر الحمدللہ.....''

''مگر وہ مردانہ کپڑوں کی دکان کھولنا چاہ رہا ہے جبکہ اس سلسلے میں اسے کوئی تجربہ نہیں۔''

''تجربہ سیکھنے سے ہی آتا ہے خاتون اگر وہ ایسا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ اُس سے کہیں جگہ دیکھ لے میں پیسہ دے دوں گا۔''

''جانتے ہیں وہ ڈالمین سینٹر کی بات کر رہا ہے دکان کا ایڈوانس اور مال ان سب کے لیے اتنی رقم یکشمت آپ کہاں سے دیں گے کچھ عرصہ قبل تو ابھی عمیر کو دکان کر کے دی ہے اسی کا پیسہ پورا نہیں ہوا۔''

صاعقہ زندگی کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھنے کی عادی تھیں یہ ہی سبب تھا جو وہ ایک خوشحال زندگی گزار رہی تھیں۔ جس میں بلاوجہ کی ٹینشن نہ تھی۔

''اللہ مالک ہے وہ کوئی سبب بنا دے گا مجھے امید ہے شاہ میر پڑھا لکھا نوجوان ہونے کے ناطے کاروبار کو اچھی طرح سنبھال لے گا اور جلد ہی اس کے کاروبار کے لیے فراہم کردہ رقم ہمیں واپس وصول ہو جائے گی۔''

''جیسے آپ کی مرضی.....''

اور پھر رات ہی صاعقہ نے ساری بات شاہ میر کو بتا دی جسے سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''بہت شکریہ امی آئی لو یو..... آپ نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔''

فون اٹھا کر ٹیرس کی سمت جاتا وہ اپنے مخصوص انداز میں ماں کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولا وہ انداز جو اُس نے کچھ عرصہ قبل ہی ماہا سے سیکھا تھا اُسے ماہا کا شکریہ کے ساتھ 'آئی لو یو' کہنا اتنا پسند تھا کہ صرف اس ایک جملے کی خاطر وہ جانے اُس کے کتنے کام سرانجام دیا کرتا اور ذرا نہ گھبراتا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے آپ میں مگن بڑی دل جمعی سے ریڈیو پر آنے والا کوئی فلمی پروگرام سن رہی تھی جب دروازے پر بجنے والی گھنٹی نے اس کا دھیان منتشر کر دیا ایک کے بعد بیل دوبارہ اُسی تیزی سے بج اٹھی۔

''اُف مصیبت یہ اِس وقت کون آ گیا؟''

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاخرہ کچھ دیر قبل بازار کے لیے نکلی تھی۔

''شاید امی کسی کام سے واپس آئی ہیں؟ یہ ہی سوچتے ہوئے ننگے پاؤں وہ تیزی سے نیچے اتری اور تیسری بیل کے بجتے بجتے دروازے پر جا پہنچی۔

''آ رہی ہوں گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر بھول مت جایا کریں۔''

زور سے کہتے ہوئے اُس نے بیرونی گیٹ پورا کھول دیا جب سامنے نظر آنے والی اجنبی شخصیت پر نظر پڑی جو اُسی کی جانب تک رہا تھا ملائکہ یکدم گھبرا گئی۔

''جی بولیں......'' دروازہ بند کرتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔

''شہباز گھر ہے؟''

''اوہ......''

اسی پل اسے یاد آیا شہباز بھی گھر ہی تھا اور شاید اس وقت وہ باتھ روم میں ہوگا اسی لیے اتنی بار ڈور بیل بجنے پر بھی باہر نہیں آیا ورنہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ امی کی غیر موجودگی میں دروازے پر ہونے والی بیل اُس کے کانوں تک نہ جاتی۔

''ایک منٹ......''

آہستہ سے کہتی وہ جیسے ہی واپس پلٹی نگاہ سامنے کھڑے شہباز پر پڑی جو سرخ چہرے اور غصہ بھری نظروں سے اُسے ہی گھور رہا تھا اُس کا چہرہ دیکھ کر ملائکہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اگر وہ کچھ دیر مزید وہاں کھڑی رہی تو شاید آج شہباز اُسے جان سے ہی مار دے ویسے ہی گھر میں اس وقت وہ دونوں تنہا تھے۔ پچھلے دنوں ٹی وی پر دکھایا جانے والا ایک واقعہ اُس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا جسے یاد کرتے ہی اُس کی ہتھیلیاں پسینہ سے بھیگ گئیں اور وہ شہباز کے قریب سے گزر کر تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگی اُسے لگا شہباز بھی اُس کے پیچھے ہی آ رہا ہے وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتی وہ اپنے کمرے میں پہنچ گئی اور دروازے کو اچھی طرح لاک کر دیا اس کے ساتھ ہی بے اختیار آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اور وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی جب یکدم دروازے پر دستک ہوئی تو اُس کا خیال درست نکلا شہباز اس کے پیچھے اوپر آ گیا تھا۔ ملائکہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اُس کے حلق سے آواز نکلنا بند ہوگئی دستک دوبارہ ہوئی اور وہ وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اس کی ساری ہمت جیسے ختم ہوگئی۔

''یا اللہ مدد......''

یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے اور پھر شاید اُسے ہوش نہ رہا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

دوشیزہ کی سینئر ترین لکھاری فرحت صدیقی کے قلم سے......

خوبصورت یادداشتیں......

فرحت...... فرحت...... فرحت...... اٹھو۔''
رات کے بارہ بج رہے تھے۔ لندن کی خوشگوار رات، میں گہری نیند میں تھی۔ اچانک آواز سنی۔ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ یہ 22'23 ستمبر کی رات تھی۔

''سارہ...... سارہ...... سارہ...... اٹھو۔''
آواز تیز تھی۔ اپنے کمرے سے باہر آئی۔ دل تھا دھک...... دھک...... دھک...... اللہ خیر...... اللہ خیر......''

''بیگم صاحبہ کا بیگ تیار کرنا ہے اسپتال جانا ہے۔''

''خون کا ٹیسٹ ہوگا۔'' میرا دل کلیجہ سب منہ کو آرہا تھا۔ سارہ Mam کی بیٹی حیران پریشان کھڑی تھی۔ میں نے بیگ میں ان کی ضرورت کی چیزیں رکھی۔ سارہ کی طرف دیکھا۔

آج دوپہر میں جب واک سے واپس آئی۔ تو سارہ سہگل حیران پریشان کھڑی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' سارہ کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ ویسے دوپہر کے 4 بجے رہے تھے۔

میں دو گھنٹے سے باہر تھی واک کی۔ اور پارک میں بیٹھی اللہ کی بنائی دنیا اور رنگ برنگ لوگ دیکھ رہی تھی۔

ٹریفک کا انتظام زبردست...... پھر بھی بہت شور تھا۔ لیکن اس کے باوجود میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک مسافر اپنے بیگ پر سر رکھے مسلسل گہری نیند میں تھا۔ سیانے ٹھیک کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ یہ تو ٹریفک کا شور تھا۔ سامنے کی سیٹ پر ایک خاتون اپنے موبائل فون سے مسلسل مووی بنا رہی ہے پارک کے اردگرد چھ بازار تھے۔ درمیان مین ایک خاتون کا مجسم تھا۔ وہ محترمہ آدھی بیٹھی آدھی کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں جام تھا۔ جس طرف اُس کی ٹانگ تھی۔ اس طرف کے روڈ پر ہمارا فلیٹ تھا۔ الف ننگی...... بہت دل چاہا کہ اس کو لمبی شرٹ پہنا دوں۔ مگر لوگ...... مجھے پاگل سمجھ کر پتھر ماریں گے۔

''ہاں سارہ...... کیا ہوا......؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی تمہاری Mam تو بہت ڈانٹتی ہیں۔''
''ہوا کیا......؟'' میں نے پوچھا۔
''پانی لاؤں...... جوس لاؤں...... پھل کاٹ کرلاؤں۔'' تو انہوں نے ڈانٹ دیا۔
''جب دل چاہے گا بتا دوں گی۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ سارہ کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔
''پانی اور آدھا جوس ملا کر...... دوسرے گلاس میں آدھا ناریل کا پانی اور سادہ پانی ملا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ایک سیب کاٹ کر بھی رکھ دیتے ہیں۔ کیونکہ جب بھی کیمو ہوتی ہے۔ اُس کے تیرے اور چوتھے دن بخار ہو جاتا ہے۔ اور مزاج میں تلخی آ جاتی ہے۔
''ویسے سارہ...... Mam بہت حوصلے والی ہیں۔ دوسری بار کینسر کے موذی مرض سے جنگ کر رہی ہیں۔ درد ہو رہا ہوگا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار...... پوچھو Mam کیسی ہیں؟''
''شکر الحمد للہ...... ٹھیک ہوں۔'' ہمیشہ یہ جواب ملتا ہے۔ آج پیر ہے اور جمعرات کو کیموتھراپی کا پانچواں سیشن ہوا تھا۔ کھانا پینا بہت کم ہو جاتا ہے۔ میں نے خاموشی سے ناریل کا پانی اور جوس کا گلاس رکھ دیا۔ چپ چاپ اٹھا کر دونوں گلاس پی لیے۔ اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ دس منٹ کے بعد آواز آئی۔
''فرحت...... فرحت......''
''جی Mam......''
''دال چاول میں۔''

''جی Mam...... ابھی لاتی ہوں۔ پھر کلیجہ منہ کو آ گیا۔ آواز میں انتہائی کمزوری تھی۔ دال چاول سبزی اچار سلاد سب ایک پلیٹ پر ڈالا۔
''اتنا سارہ میں نہیں کھا سکتی۔''
''جتنا دل چاہے چھوڑ دیں۔ ضائع نہیں ہوگا۔ میں کھالوں گی۔''
''نہیں مجھے ایک خالی پلیٹ لا دو۔''
''کوئی پلیٹ نہیں ہے آپ کو اس میں کھانا...... آپ شروع تو کریں۔''
''ہاں Mam پتہ ہے اک دن کیا ہوا زمل میری دو سال کی پوتی اور ہنی اسکول سے آ رہے تھے سامنے ایک گدھا گاڑی سبزی والی آ رہی تھی۔''
''ماشاء اللہ!'' ڈھوڈھو (گدھا) میرے سائز کا ہوگیا ہے۔''
''یہ زمل کہہ رہی تھی۔'' Mam ہنس دی۔
''دیکھا آپ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔
باتوں باتوں میں Mam کھانا کھاتی رہیں۔
سارہ کہنے لگی۔
''فرحت...... آپ کو ہی Mam کو منانے کے سارے گر آتے ہیں۔''
''کیا کریں بھی؟'' جب Mam نے پوچھا۔
''کیا تم میرے ساتھ لندن چل سکتی ہو۔''
''فرحت......''
''کینسر نے دوبارہ جکڑ لیا ہے کیموتھراپی ہے۔''
''کتنے عرصے کے لیے۔''
''چھ ہفتے کے لیے۔''
''ٹھیک ہے Mam میں چلوں گی۔''
''چھ ہفتے کی دوائیاں اپنی ضرور ساتھ لانا۔''
''ٹھیک ہے Mam کب چلنا ہے۔''
''دو دن بعد...... فرحت تمہارا شکریہ۔ تم میرا ساتھ دے رہی ہو۔''
''Mam شکریہ کس بات کا۔'' یہ تو آپ کی محبت ہے۔ لندن آ کر پتا چلا...... کہ مزید چھ ہفتے رکنا ہوگا۔ چھ عدد تو کیموتھراپی کے سیشن ہوں گے اور باقی ٹیسٹ وغیرہ......
''خیر......'' میں نے بیگ جلدی سے تیار کر دیا۔ 'یا حفیظ' گیارہ بار پڑھ کر پھونک ماری۔ میاں صاحب نے بیگ پکڑا۔ سوا بارہ بجے وہ اسپتال چلے گئے۔
''رات دو بجے...... سارہ تسبیح پڑھ رہی ہے اور میری آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی ہے۔ کیموتھراپی کا تکلیف دہ مرحلہ میری آنکھوں کے سامنے ہے تصور کو اس قیامت سے گزرتے اور جان دیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تین سال پہلے کے سارے لمحے آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔
رات سوا چار بجے...... تہجد کا وقت ہے چلو سارہ تہجد پڑھتے ہیں اور Mam کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تہجد پڑھ کر سات بار درود شریف پڑھا 11 مرتبہ الحمدللہ سورۃ فاتحہ' 11 مرتبہ آیت الکرسی' تین بار چاروں قل 21 مرتبہ یا اللہ یا شافی 21 مرتبہ یا حی قیوم اور سات مرتبہ درود شریف پڑھ کر پانی پر دم کیا۔ یہ آزمودہ نسخہ ہے۔ اللہ بیماری میں بہت شفا دیتا ہے۔
پانچ بج کر 20 منٹ...... نماز فجر پڑھ لی۔ سارہ نے بھی پڑھ لی ہے۔ 23 ستمبر 2014ء صبح 8 بجے...... سارہ اسپتال جا رہی ہے۔ نائٹ سوٹ اور گرم جرسی لے کر۔ ''دعا کرنا۔''
''دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، انشاء اللہ

سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''انشاء اللہ......'' سارہ بولی۔
''دوپہر 2 بجے...... سارہ نے فون پر بتایا۔
Mam بہتر ہیں شکر الحمد للہ زندگی بھی کیا چیز ہے۔ کبھی ہم اپنے حالات سے گھبرا کر زندگی کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر جب کبھی اللہ تعالیٰ بیماری کی شکل میں آزمائش میں ڈالتا ہے تو پھر یہی زندگی کتنی انمول ہو جاتی ہے۔ قیمتی ہو جاتی ہے۔
شام چھ بجے...... سارہ اسپتال سے واپس آنا ہے نڈھال تھکی ہوئی۔
ڈاکٹر کہتے ہیں۔ بخار نہیں ٹوٹ رہا۔ بخار میں کچھ نہیں ہوتی۔ کمزوری بھی بہت ہے اگلے جمعہ 3 اکتوبر ہو گی۔
''انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا سارہ۔ کوئی بات نہیں ہے۔ چھٹی کیموتھراپی آخری ہے اللہ بہتر کرے گا۔'' میں نے جواب دیا۔
''نہیں...... فرحت...... یہ کیموتھراپی کا سیشن بارہ عدد ہے۔''
''کیا؟'' میں نے جو واپسی کے دن گننے شروع کیے تھے سارے بھول گئے۔ واقعی اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے۔ بندہ تو بالکل بے بس ہے۔ تو ہی جانتا ہے کہ میرا کتنا دانہ پانی یہاں پر ہے؟
''اللہ بہتر کرے گا۔'' میں نے سارہ سے کہہ تو دیا۔ لیکن لگتا تھا۔ آواز خالی خالی سی ہے۔
''کیوں فرحت صدیقی......؟ تم تو اللہ کی رضا میں راضی رہتی ہو۔ اب کیا ہوا۔ اُداس کیوں ہو؟'' کسی آواز نے مجھ سے پوچھا۔
میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ کئی دفعہ کاموشی میں بھی بہت سارے جواب چھپے ہوتے ہیں۔
''رات دس بجے...... Mam کی رپورٹ آ گئی ہیں۔ تسلی بخش ہے بخار ٹوٹ گیا۔ صرف 'سرخ ذرات' نہیں بن رہے۔ یہ خون کے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ کیونکہ کیموتھراپی کا عمل اتنا زہریلا ہوتا ہے اس کے راستے میں جو بھی آتا ہے وہ سب کو تباہ کر دیتا ہے۔ اُس کا نشانہ صرف کینسر نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے خون کی بے حد کمی ہو جاتی ہے۔
لندن کی بارش بہت کم اتنی خوف ناک ہوتی تھی۔ جتنی رات کو تھی۔ میری کھڑکی سے بارش جب سیدھی میرے چہرے پر پڑی۔ تو فوراً آنکھ کھل گئی رات کے 2 بجے تھے۔ کھڑکی بند کی بجلی کی چمک اتنی زیادہ تھی کہ پورا کمرہ روشن ہو جاتا تھا اور آواز اتنی خوف ناک کے دل سہم جاتا تھا۔ میں کبھی بھی بارش، طوفان، آندھی سے خوف زدہ نہیں ہوئی۔ لیکن اُس رات میرا دھیان بار بار Mam کی طرف جا رہا تھا۔ ٹریفک ساری رات ہی چلتی رہتی ہے اس کا بھی شور مسلسل آتا رہتا ہے۔ یہ لندن کا مصروف ترین علاقہ ہے۔ رات کو بھی سکون نہیں ہوتا صبح صبح ٹپ ٹپ گھوڑوں کی آواز...... پولیس جارہی ہوتی ہے۔ کالے براؤن اور سفید خوبصورت گھوڑے۔ ان کے قدموں کی آواز...... Mam کل بھی نہیں آ سکی۔ بخار پھر ہو گیا تھا اور ڈائریا بھی، ڈرپ مسلسل لگی ہوئی تھی۔ میاں صاحب صبح 9 بجے کہہ کر گئے ہیں۔
''آج انشاء اللہ ہم آجائیں گے میں سارا دن پڑھتی رہی۔ 'یا حفیظ' اللہ تعالیٰ کی ذات پر جتنا پکا یقین ہوگا۔ اتنا ہی دل کو سکون ملتا ہے۔ بے سکونی تب ہوتی ہے جب ایمان کمزور ہوتا ہے شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ وہ اپنی چونچ دل میں رکھ دیتا ہے۔

دوپہر ڈھائی بجے...... Mam سارہ اور میاں صاحب کے ساتھ اندر آرہی ہے۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ......

''کیسی ہیں آپ؟'' میں بھاگ کر ان کے گلے لگ گئی۔

''اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں۔'' دل مضبوط تھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سیدھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔

''دال چاول ہیں......'' مجھ سے پوچھا۔

''جی Mam۔''

''تھوڑے سے لے آؤ۔''

''ایک ہم پاگل ہیں پوچھ پوچھ کر تھک جاتے ہیں یہ سوپ پی لیں، قیمہ بھنا ہوا ہے ایک چمچ ہی لے لیں۔ چکن لے لیں۔ فش برگر کھالیں جواب ہی نہیں دیتی۔ سارہ میرے ساتھ کچن میں آ کر بول رہی تھی۔ کھانا میکرو کی بجائے چاول فرائی پین میں گرم کر رہی تھی۔ دوسرے فرائی پین میں سارہ دال گرم کر رہی تھی۔ تمہیں پتہ ہے میکرو میں گرم کر کے کھانا دینا امی کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ کینسر کے مریض کے لیے نقصان دہ ہیں۔

''مجھے پتہ ہے۔''

''پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''مجھے بھی رات ہی بھائی نے بتایا۔ ان کے کولیگ کو پچھلے سال کینسر ہوا تھا۔ اُس نے گھر سے میکروواوون ہی نکال دیا ہے۔ وہ ماشاء اللہ اب بالکل ٹھیک ہے اور آفس آرہا ہے۔''

'' انشاء اللہ Mam بھی جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''آمین ثم آمین۔''

زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ شفا دینی ہو تو خاک کی پڑیا بھی کام کر جاتی ہے۔ اگر زندگی کے دن ہی نہ ہوں تو مسلسل علاج توجہ بھی کام نہیں آتے۔ تصور پھر نظروں کے سامنے آ گیا۔ پل پل زندگی روٹھ رہی تھی۔ نظروں کے سامنے، ڈاکٹر کہتے تھے آکسیجن ماسک سے مصنوعی سانس آرہا ہے ورنہ جسم کے اندر گردے دل پھیپھڑے سب فیل ہو چکے ہیں۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب...... شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔'' میں مایوس نہیں تھی۔ لیکن جب تہجد کے وقت تصور کے زندگی کے لمحات ختم ہو گئے۔ تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔

دال چاول گرم ہو چکے تھے۔ Mam نے دو تین چمچ کھائے۔ آنکھیں بند کر کے خاموشی سے لیٹ گئی۔ میرا ذہن پھر بھٹک گیا۔ جب تک تصور کا دانہ پانی تھا فرمائش کر کے صرف دال مجھ سے پکوا کر چمچ سے شوق سے کھاتا تھا۔

سارا دن وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی۔ میری کھڑکی کے سامنے خوبصورت پارک ہے۔ رنگ برنگ پتے سڑک پر بکھر رہے ہیں۔ نارنجی زرد، براؤن، سبز، پیلے سارے رنگ ایک ہی پتے میں۔ جانے والوں کے قدموں کے تلے کچلے جا رہے ہیں فنا کی طرف جاتے ہوئے یہ مرجھائے ہوئے پتے کہہ رہے ہیں۔

''اگر ہم زمین پر نہ گرتے تو ہماری جگہ پر نئے پتے کیسے آتے؟ ہاں یہی دنیا ہے اور یہی کائنات......''

شام کو Mam نے چائے پی ہے۔ بخار پھر ہو گیا ہے۔ شام کو روز ہی بخار ہو جانا اچھی علامت نہیں ہے۔ تصور کو پھر روزانہ شام کو ہی بخار ہو جاتا تھا۔ یہ دماغ پر تصور کی طرف پلٹ گیا ہے۔

رات کو Mam نے کچھ نہیں کھایا۔ سو گئی ہیں۔ نماز پڑھ کر سونے کی کوشش کر رہی تھی رات

کے گیارہ بج رہے ہیں۔ Mam کی طبیعت اک دم خراب ہوگئی۔ میاں صاحب ٹیکسی کے لیے کال کر رہے ہیں کیونکہ بخار کے ساتھ ایسی حالت میں اسپتال جانا بہت ضروری ہے۔

''خبردار...... فون مت کرنا۔ مجھے اسپتال نہیں جانا، یہ سارہ اور فرحت کو کیوں جگا دیا تم نے......'' Mam سخت ناراض ہوکر بول رہی ہیں میاں صاحب چپ کھڑے ہیں۔

''تم سب نکلو میرے کمرے سے......'' ہم سب چپ چاپ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ سارہ ایک دوبار دروازے سے جھانک کر واپس آ گئی۔ AROS کا پانی پی رہی تھی۔ ڈاکٹر نے صرف وہی پانی پینے کے لیے کہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے ہلکا سا قہوہ بنایا۔ خاموشی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

''Mam اگر دل مانے تو صرف ایک گھونٹ پی لیں۔'' میں کہہ کر فوراً کمرے سے باہر آ گئی۔

رات ایک بجے...... میاں صاحب کہہ رہے ہیں۔ تم دونوں اب سو جاؤ۔ بیگم صاحبہ سوگئی ہیں۔ یقیناً قہوہ سے سکون آیا ہوگا۔

صبح بہت اُداس ہے۔ اگلی کیمو اب 13 اکتوبر کو ہے۔ لیکن اُس کے لیے ضروری ہے کہ بخار نہ ہو۔ اور سرخ ذرات بننے شروع ہوں۔ کیونکہ خون بننے کا عمل رُک چکا ہے۔ جو اچھا نہیں ہے۔

صبح گیارہ بجے اُٹھ کر ہلکا سا ناشتہ کیا ہے۔ پھر سوگئی ہیں۔ دل میں اُداسی اور مایوسی چھا رہی ہے۔

''یا اللہ...... جب میں مایوس ہو جاؤں کہ میری دعائیں قبول نہیں ہوئیں۔ تو یہ یاد کرنے میں میری مدد فرما کہ تیری رحمت میری مایوسیوں سے کہیں زیادہ ہے اور میری زندگی کے بارے میں تیرے فیصلے میری خواہشوں سے بہتر ہیں۔''

13 اکتوبر کی کیمو بھی ملتوی ہوگئی ہے۔ ابھی تو سات کیموتھراپی ہیں۔

''یا اللہ جو سر تیرے سامنے جھکتا ہے۔ اسے دنیا والوں کے سامنے جھکنے سے بچا۔ اور جب تک زندہ رکھے چلتے ہاتھ پیروں کے ساتھ ایمان پر رکھ۔ اے اللہ میں تیری رحمت کے صدقے التجا کرتی ہوں کہ Mam کو صحت اور زندگی عطا فرما۔ آمین ثم آمین۔''

صبح گیارہ بجے دل میں عجیب سی اُداسی ہے۔ میری ذات تو 'لمحہ موجود' میں قید ہے۔ جو گزر گیا۔ وہ بھول گئی۔ جو آئے گا۔

''مجھے پتہ ہیں۔'' رب میرے لیے ہے وہی میرے حق میں بہتر سوچتا ہے۔

''فرحت...... فرحت...... Mam بلا رہی ہیں۔''

''جی Mam۔''

''اِدھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' Mam کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا ہے۔

''خیریت......'' میں نے پوچھا۔

''تم ایسے کرو عید کے لیے تم نے جمعہ کو عاشہ کے پاس صلاحو جانا تھا۔ آج شام کو چلی جانا۔ ہم لوگ چار بجے آکسفورڈ جا رہے ہیں۔ خوشی ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ Mam نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ہی ہسٹری میں P.H.D کی ڈگری لی تھی۔'' سارہ کہہ رہی تھی۔

''Mam کی کلاس فیلو نے وہاں پارٹی ارینج کی ہے چار کلاس فیلو نے باقی لوگوں کو بھی بلایا ہے Mam کے لیے۔ سنہری یادوں کو تازہ کرنے کے لیے۔ ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ ان کے لیے بہت اچھا ہے۔'' آنکھوں میں ستارے اتر

آئے ہیں۔

یادوں کی کہکشاں جھلملا رہی ہے۔ تصور کے قائداعظم یونیورسٹی کے سارے دوست اچانک اس کو ملنے آ گئے تھے۔ تو تصور خوشی سے سرخ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کہنے لگے۔

''اچھی علامت ہے۔ اُس شام اُس کو بخار بھی نہیں ہوا تھا۔ عنبر نے فوراً شکرانے کے نفل پڑھے۔ دن رات بخار میں اس کو پٹیاں کرتی تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ خدا کے لیے عنبر کچھ تو کھالو۔'' میں التجا کرتی۔

''امی جی...... کیا کروں حلق سے نیچے نہیں اترتا'' وہ بے بسی سے کہتی۔ میں کیا کہتی۔ جب شریکِ زندگی جو جان دینے والا ہو۔ اس کی جان پر بن آئی ہو۔ کھانا حلق سے کیسے اترتا۔

''سارہ یہ جیولری بھی رکھ دو۔ نہیں...... یہ سرخ پرنٹ والا سوٹ، ہاں یہ ٹھیک ہے۔ Mam کی آواز خوشی سے بھرپور تھی۔

''فرحت...... میری دوائیاں Aros کی بوتل ایک سیب ایک کیلا بادام اور کاجو......''

''یہ لیجیے...... میں نے بیگ تیار کر دیا ہے۔ ٹیکسی کو کال کر دی ہے آنے ہی والی ہو گی۔

''فرحت ہمارے ساتھ نیچے چلو میں نے ان کا بیگ تھام لیا سارہ کے ساتھ لفٹ کے ذریعے نیچے آ گئے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے استقبال کیا۔

Mam کے گولڈن بال اڑ اڑ کر چہرے کو چھو رہے تھے۔ گہرے رنگ کی سرخ لپ اسٹک گورے رنگ پر خوب جچ رہی تھی۔

''فرحت سنو......'' انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ زندگی اور موت کا وقت مقرر ہے اس لیے موت سے کیا ڈرنا...... زندگی اللہ کا تحفہ ہے اس کی قدر کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو ہارٹ اٹیک سے مر جاتے ہیں حادثے میں یتیم ہو جاتے ہیں ان کے دلوں میں ہزاروں خواب اور خواہش ہوتی ہیں جو وہ پوری نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے کینسر بہت بہتر ہے۔ ہمیں اپنے خواب اور خواہش پوری کرنے کے لیے دھیرے دھیرے وقت دیتا ہے مریض کو پتا ہوتا ہے اس کے اندر کا کیا حال ہے؟ میں اپنا ایک خواب اور ایک خواہش پوری کرنے جا رہی ہوں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے چپے چپے پر یادوں کی سنہری بارات ہے۔ ٹیکسی کب کی آ چکی تھی۔ سارہ نے سامان رکھوا دیا تھا۔

انہوں نے دھیرے سے ہاتھ چھوڑ دیا ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر بے حد خوبصورت مسکراہٹ سے مجھے الوداع کہا۔ ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔

شام چار بجے...... ٹیکسی میری نظروں سے آہستہ آہستہ اوجھل ہو چکی ہے۔ میں ہونق کھڑی ہوں۔ Mam کے لفظوں کا ہجوم میرے اردگرد ناچ رہا ہے۔ ٹھنڈک ہوا سے خزاں کے زرد زرد پتے چاروں طرف اڑ رہے ہیں اور لوگوں کے قدموں تلے کچلے جا رہے ہیں۔ میں ان پتوں کا رقص جنوں دیکھ رہی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے، اور کانوں میں Mam کے الفاظ ایک خاص ردھم کے ساتھ اتر رہے ہیں۔

''کاش...... کاش......''

رات دس بجے......

میں آٹھ بجے صلاحو پہنچ گئی ہوں۔ عاشہ اور بچے بے حد خوش ہیں بدھ سے پیر تک کے لیے آ گئی ہوں۔

Mam کا میسج آیا ہے۔

''Life Is Beautifull'

☆☆......☆☆

افسانہ

راحت وفا راجپوت

آدابِ محبت

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو یہ جان گئی تھی کہ زندگی بہت حسین ہے اور مزید حسین اللہ پر بھروسہ اور راست گوئی بناتی ہے

تم محبت کے آداب سے واقف نہیں
تمہارے جذبوں میں اتنی شدت نہیں
تمہارے لمس میں اتنی حدت نہیں
جتنی ہم چاہتے ہیں
تمہیں کون سکھائے
آدابِ محبت!

کاغذ اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ شہریار کے لکھے ہوئے چند جملوں نے اُس کی ہستی کو ہلا ڈالا تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں بے وقعت ہوگئی تھی۔ اُس کے جذبوں کی اتنی توہین...... وہ تڑپ کر رہ گئی۔ پچھلی بار شہریار نے بات کرتے کرتے ایک دم فون بند کردیا تھا تو اُسے تب ہی محسوس ہوگیا تھا کہ کوئی انہونی ہونے والی ہے۔

☆......☆......☆

شہریار سے اُس کی منگنی کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے۔ شہریار کی والدہ نے سبین کو کسی تقریب میں دیکھا تھا۔ اور وہیں اُس کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرلی تھیں۔ سبین کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ بازار میں اُس کے والد کی کریانے کی دکان تھی۔

والدہ سیدھی سادھی گھریلو خاتون تھیں۔ خود سبین ایک سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ بی اے کرنے کے بعد گھر ہی میں کام کاج سنبھال لیا تھا اُس نے...... اپنے والدین کی دل وجان سے خدمت گزار تھی۔

اُس کے والد رشید کے دوست کے بیٹے کی دعوت ولیمہ تھی۔ اُس نے بہت اصرار سے فیملی سمیت آنے کی دعوت دی تھی اور وہیں پر وہ اپنی معصومیت اور سادگی سمیت شہریار کی والدہ کے دل میں اُتر گئی۔ چند دنوں بعد ہی وہ رشتے کے لیے آن پہنچیں۔

شہریار خاصا خوبصورت تھا ایک پرائیویٹ فرم میں اچھے عہدے پر تھا۔ تنخواہ کے علاوہ دیگر سہولیات ملی ہوئی تھیں۔ ہر لحاظ سے یہ رشتہ اچھا تھا۔ سبین کے والدین نے سوچنے کا وقت مانگا۔ رشید صاحب نے شہریار کے آفس والوں سے پتہ کیا۔ سب نے اُس کی تعریف ہی کی تھی۔ سوچ بچار کے بعد ہاں کردی

گئی اور شہریار کی والدہ اُسے انگوٹھی پہنا کر بات پکی کر گئیں۔ شادی کے لیے دو سال کا وقت دیا گیا۔ شہریار کی چھوٹی بہن کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے تھے وہ لوگ اور ان کا ارادہ دونوں بہن بھائی کی ایک ساتھ ہی شادی کرنے کا تھا۔

☆......☆......☆

منگنی کے دو ماہ بعد اُس کی ہونے والی ساس اس کے گھر آئیں اور اُس کی ماں سے کہنے لگیں۔ شہریار نے تصویر دیکھ کر سبین کو پسند کیا ہے۔ اسے ہماری پسند پر بھی پورا بھروسہ ہے۔ مگر وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ کبھی کبھار سبین سے فون پر بات کرلیا کرے۔ اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی

رہتی ہے۔ سبین کی ماں تو خاموش ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے آخر شوہر سے بات کرنے کے بعد جواب دینے کا کہہ دیا۔

رات کو شوہر سے بات کی وہ بھی سوچ میں گم ہوگیا۔ سبین خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُسے شہر یار کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے والدین کی پریشانی دیکھ بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔ وہ بے چارے ڈر بھی رہے تھے کہ اگر انکار کر دیا تو داماد برا نہ مان جائے اور دل یہ بھی نہیں مانتا تھا کہ منگنی جیسے کچے رشتے میں اُن کی بیٹی منگیتر سے بات کرے۔ رشتہ اچھا تھا اور وہ اُسے کھونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کر ہی لیا کہ نئے زمانے کے ساتھ چلنا ہی عقلمندی ہے اور فون پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆......☆......☆

سبین کو والدین کے فیصلے نے دکھی کر دیا تھا۔ ماں بیٹی کو سمجھتی تھی۔ اُس کی ناگواری کو دیکھ بھی رہی تھی پھر بھی اُس نے سمجھایا۔

''بیٹی یہ رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے' اور مرد کی اَنا کو ذرا سی بھی ٹھیس لگ جائے تو وہ بھولتا نہیں ہے۔ کچھ باتوں کو دل نہ چاہتے ہوئے بھی ماننا پڑتا ہے۔''

سبین نے سر جھکا دیا اور اگلے ہی دن شہر یار کے گھر سے نیا موبائل فون آ گیا سم اور بیلنس سمیت۔

☆......☆......☆

دوسرے دن دوپہر کو وہ کپڑے دھو رہی تھی جب ایک ناموس آواز گونجی ماں بیٹی دونوں چونک پڑیں دوسرے ہی لمحے بات سمجھ میں آتے ہی دونوں نے ایک دوسرے سے نظر چرا لی۔

بیل مسلسل ہو رہی تھی آخر سبین ہمت کر کے اٹھی اور کمرے میں آ گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اُس نے موبائل پکڑا۔

''ہیلو...... ہیلو...... سبین...... میں شہر یار...... آواز آ رہی ہے۔'' سبین کے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

''کچھ بولو۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''جی......'' اُس کی مری مری آواز نکلی۔

''شکر ہے ورنہ میں تو سمجھا تھا شاید تم گونگی ہو۔''

اور پھر آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ وہ ہوں ہاں کرتی رہی۔ وہ مسلسل بول رہا تھا۔ جب بھی وہ فون بند کرنے کا ارادہ کرتی وہ کہہ دیتا۔

''دیکھو ابھی بند نہ کرنا۔'' اور پھر روزانہ اسی وقت فون کرنے کا کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا تو بھی کتنی ہی دیر وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے گم صم بیٹھی رہی۔

☆......☆......☆

پھر روزانہ دوپہر کے وقت مخصوص ٹائم پر شہر یار کا فون آنے لگا۔ اُس وقت باپ تو دکان پر ہوتا تھا اور ماں بھی اُس وقت خاموشی سے اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔

سبین اپنے آپ کو ایک اَن دیکھی قید میں محسوس کرتی تھی۔ دن بدن خاموش ہوتی جا رہی تھی شہر یار کی باتیں...... مستقبل کے وعدے' ارادے اُس کے دل کو خوش نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کا دل بجھتا جا رہا تھا۔

شہر یار کی بہن سحرش کی منگنی طے ہوگئی تو شہر یار نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ وہ سبین کو منگنی میں ضرور بلوائیں۔ ایک بار پھر سبین کے گھر میں سوچ بچار شروع ہوگئی۔ سبین نے صاف انکار کر دیا اُس کی ساس بھی بہت اصرار کر رہی تھی۔ ایک بار پھر اُس کے والدین مجبور ہوگئے اور انہوں نے سبین کو مجبور کیا کہ وہ منگنی میں شریک ہو مگر ذہنی کشمکش نے اُسے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ بخار کی شدت سے اُس سے ہلا

بھی نہ گیا۔ مجبوراً ماں کو اُس کے پاس رُکنا پڑا اور رشید منگنی میں چلا گیا۔ چونکہ بات بیماری کی تھی اس لیے شہریار کچھ نہ کہہ سکا اور نہ ہی اُس کی ماں نے کوئی بات کی۔

☆......☆......☆

پندرہ دن تک وہ بستر پر پڑی رہی۔ بخار کے بعد کی کمزوری نے اُسے بہت لاغر کر دیا تھا۔ شہریار نے بہت گلے شکوے کیے مگر وہ خاموش رہی۔ اُس کی خاموشی اور شہریار کی بے تابی و بے باکی بڑھتی جارہی تھی۔ روانی میں وہ ایسی بات کر جاتا کہ وہ شرم سے سرخ پڑ جاتی۔ وہ چاہتا تھا کہ سبین بھی اُس کی گفتگو میں شامل ہوا کرے۔ کھل کر بات کرے۔ مگر وہ ایسا نہ کر پاتی۔ جس پر شہریار کا موڈ خراب رہنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

سنو تم راز ہو اپنا
تمہیں افشاں نہیں کرتے
جسے شفاف رکھنا ہو
اُسے میلا نہیں کرتے
بچھڑنا ہی ضروری ہو تو
پھر رویا نہیں کرتے

سحرش اُس کے گھر آئی ہوئی تھی۔ منگنی کے بعد وہ بہت خوش تھی۔ سسرال سے آیا ہوا سوٹ اور جیولری پہن کر آئی تھی اور مسلسل اپنے سسرال والوں کی تعریفیں کیے جارہی تھی۔ سبین مسکرا کر اُس کی باتیں سن رہی تھی۔ اُس کی ساس ماں کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھی وہ سحرش کو ساتھ لیے کچن میں آ گئی۔ سحرش بھی اُس کا ہاتھ بٹانے لگی اُس کا ارادہ بریانی بنانے کا تھا۔

وہ گوشت دھو رہی تھی۔ سحرش پیاز کاٹنے لگی۔

''بھابی...... آپ کے تو بہت مزے ہیں۔'' سحرش نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' سبین نے مسکرا کر کہا۔

''بھائی سے روزانہ فون پر باتیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کا مزاج سمجھنے میں آسانی ہوگئی ہے آپ کو...... ایک ہم ہیں تصویر پر ہی گزارا کر رہے ہیں'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''تو تم بھی اپنے منگیتر سے بات کر لیا کرو۔'' سبین نے چھیڑا۔

''ہماری ایسی قسمت کہاں...... عادل نے اتنی بار اجازت مانگی ہے اُس کی امی بھی آئی تھیں کہ کبھی کبھار بات کر لیا کریں۔ عادل کی بڑی خواہش ہے مگر بھائی نے سختی سے منع کر دیا۔''

سبین ساکت رہ گئی۔ یوں لگا جیسے بھرے بازار میں اُس کے سر سے کسی نے چادر کھینچ لی ہو۔

''بھائی نے سختی سے منع کر دیا۔ بھائی نے منع......'' ہر طرف یہی آواز گونج رہی تھی۔

شہریار نے اپنی بہن کو منگیتر سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی تھی اور خود اپنی منگیتر سے روز بات کرتا تھا اور اُسے مجبور بھی کرتا تھا کہ کھل کر بات کرے، جھجک ختم کر دے۔ اتنا دوغلا پن جو بات بہن کے لیے پسند نہیں تھی وہ اپنے لیے پسند تھی۔ کیا وہ اتنی ارزاں تھی یا پھر اُس کا کوئی بھائی نہیں تھا تو اُس نے سمجھا کہ وہ آزاد خیال ہوگی۔

سبین کے وجود میں جیسے آگ بھڑک اٹھی۔ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ اپنے آپ پر قابو پا کر اُس نے کھانا تیار کیا۔ مقررہ وقت پر شہریار کا فون بھی آیا۔ اُسے خبر تھی کہ اُس کی بہن اور ماں اُسی کے گھر میں ہیں پھر بھی سب کے سامنے کال کر رہا تھا۔ سبین نے موبائل آف کر دیا۔

☆......☆......☆

پھر رات بھر وہ جاگتی رہی۔ آنسو بہتے رہے

اور وہ خدا سے معافی مانگتی رہی پچھتاوے اُسے ڈستے رہے۔ اُس نے کیوں نہ ہمت دکھائی۔ ماں کو صاف انکار کردیتی۔ کیا ہوتا رشتہ ختم ہو جاتا۔ اگر قسمت میں نہیں تھا تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ رشتہ ٹوٹنے کا کوئی بھی بہانہ بن جاتا۔ وہ کیوں کمزور ہوگئی۔ اُس نے اپنے خدا سے زیادہ طاقتور سسرال والوں کو سمجھ لیا۔ سجدے میں گری اپنے آپ سے شرمسار ہوتی رہی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن وہ بالکل پُرسکون تھی۔ دوپہر کو شہریار کا فون آیا۔ اُس نے کہا صرف ایک بات کہوں گی۔ آج کے بعد میں آپ سے فون پر بات نہیں کروں گی میں آپ کا فون واپس بجھوا رہی ہوں۔ اتنے دن بھی میں نے خود پر جبر کرکے بات کی ہے، اب نہیں۔ شادی کے بعد میں آپ سے بات کروں گی۔'' اتنا کہہ کر اُس نے موبائل آف کیا۔ سم نکالی اور ڈبے میں بند کرکے ماں کے حوالے کردیا۔ یہ شہریار کے گھر بجھوادیں۔ ماں نے بیٹی کا چہرہ دیکھا اور پھر خاموشی سے ڈبہ پکڑلیا۔ موبائل واپس بجھوائے کافی دن گزر چکے تھے۔ شہریار کے گھر والوں کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اُس کے والدین پریشان تھے مگر وہ مطمئن تھی۔ جب اللہ کی رضا میں راضی ہوجاؤ تو پھر کوئی اضطراب پریشانی نہیں ہوتی اور پھر اتنے دن کی خاموشی کے بعد ڈاک سے ملنے والا یہ پیغام اُس کی ساری امیدوں کو توڑ گیا تھا۔

اُس نے لکھا تھا'' تم محبت کے آداب سے واقف نہیں۔'' اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا محبت کرنے کے آداب یہ ہیں کہ دن بھر اور رات رات بھر کسی غیر محرم سے محبت کی باتیں کی جائیں۔ اُس کی بے باک باتوں کو سنا جائے۔ یا پھر باہر چھپ چھپ کر ملاقاتیں کی جائیں۔ منگنی کوئی ایسا پکا رشتہ تو نہیں ہوتا کہ ہر بات کی آزادی مل جائے۔ کوئی بھی شخص ہماری قسمت کا مالک کیسے ہوسکتا ہے قسمت کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے اور جب اللہ نے حکم دے دیا ہے کہ غیر محرم سے نرم و ملائم لہجے میں گفتگو کرنا بھی گناہ کے زمرے میں آتا ہے تو پھر اتنی بے تکلفی پر اللہ کتنا ناراض ہوگا۔

جو شخص شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کی عزت نفس کی حفاظت نہ کرسکا اپنے گھر والوں اور بہن بھائیوں کو اُس سے ہونے والی گفتگو بتاتا رہا وہ بعد میں کیا اُس کی عزت کو بحال کرے گا۔ اور جو اتنا دوغلا ہے کہ اپنی بہن کے لیے غیرت مند بن جاتا ہے اور اپنے ہر حد سے نکلنا جائز سمجھتا ہے۔ کیا عورت اور مرد کے لیے شرم و حیا الگ الگ ہیں۔ اگر عورت کو پردہ کرنے کا حکم ہے تو مرد کو بھی نگاہیں جھکا لینے کا حکم ہے۔

اور بیٹے کی فرمائش لے کر آنے والی ماؤں کو بھی سوچنا چاہیے کہ بہو بھی کسی کی بیٹی اور گھر کی عزت ہے۔ ماؤں کو خود ہی اپنے بیٹوں کو سمجھانا چاہیے۔

اپنی آنکھوں کو باوضو رکھنا
جب بھی آئینہ روبرو رکھنا
زندہ رہنا بھی اک عبادت ہے
زندہ رہنے کی آرزو رکھنا

سبین نے جان لیا ہے کہ شہریار اُس کا نصیب ہی نہیں تھا۔ اور جو اُس کا نصیب ہے وہ ایک روز اسے ڈھونڈتا ہوا اُس کے دروازے تک ضرور آن پہنچے گا۔ اور تب تک خدا پر بھروسہ اور امید ہی زادِ راہ ہے۔ اور یہ زادِ راہ اُسے منزل تک ضرور پہنچائے گا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

متاعِ حیات تھے وہ

ایک خوبصورت تحریر جو محبت کرنے والوں کو ضرور رُلائے گی

ہوا میں ایک شوریدگی کی کیفیت تھی۔ یا یہ صرف ضرار کے اندر کا غبار تھا۔ وہ اپنی وہیل چیئر پر کسی جامد و ساکت 'ٹیڈی بیئر' کی طرح بیٹھا خزاں کی دیوانگی کو کھڑکی کے ذریعے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ کمرہ بہت عجیب وغریب انداز سے سجایا گیا تھا۔ ہر چیز بدنظمی کا شکار نظر آ رہی تھی۔ وہ پچھلے دو گھنٹے سے اسی حالت میں تھا شاید مین گیٹ سے کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ گاڑی کی مانوس آواز پر اس کی خوبصورت آنکھوں میں زندگی کی روشنیاں جگمگانے لگیں۔ مگر اگلے ہی لمحے ریا کے ساتھ فیضان کو دیکھ کر سب کچھ ماند پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے بجائے صرف اور صرف بے بسی تھی۔ ریا اور فیضان باتوں میں مگن ہال میں داخل ہو گئے۔ پھوپو سے ملنے کے بعد ریا کا ارادہ ضرار سے ملنے کا تھا۔ مگر ضرار بیزاری کا سائن دروازے پر آویزاں کر چکا تھا۔ اس کے مزاج یا منشاء کے خلاف کوئی بھی کام اسے بری طرح مشتعل کر دیتا تھا۔ نارمل حالت میں واپس آنے کے لیے چند گھنٹے اُسے خود کو سمجھانا تھا۔

☆......☆......☆

سارہ بیگم جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں۔ شوہر کا کاروبار اور جائیداد اچھی تھی۔ اس لیے مالی پریشانی نہ تھی ان کے دو ہی بیٹے ضرار اور فیضان تھے۔ دونوں ہی خوبصورت اور ذہین...... بری قسمت نے یہاں بھی مات دی۔ اور ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ضرار اپنی ٹانگوں سے محروم ہو گیا۔ نہایت باہمت ہونے کے باوجود وہ انجینئرنگ کا آخری سمسٹر پورا نہ کر سکا اور گھر میں مقید ہو کر رہ گیا۔ ایسے میں چھوٹے بھائی یعنی فیضان کی شدید ضرورت کے باوجود وہ اپنی مصروفیات میں اُلجھا رہا اور سارہ بیگم الگ بیٹے کے غم میں نڈھال تھیں کیا کر سکتی تھیں۔ ایک ریا ہی تھی جسے ضرار کا خیال تھا۔ ریا سارہ بیگم کے بھائی کی بیٹی تھی۔ بچپن ہی سے اس کی ضرار کے ساتھ خوب بنتی تھی۔ اگر کبھی فیضان سے لڑائی ہو جاتی تو فوراً ضرار سے شکایت کرتی۔

"ضرار فیضان کی پٹائی کریں مجھے تنگ کرتا ہے۔" ضرار کو ریا کی ہر بات حرف آخر لگتی اور وہ

فیضان سے خوب جھگڑتا، حالات بدل گئے۔ مگر اُن کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہر روز اسے ملنے آتی اس سے خوب باتیں کرتی اور اکثر وہ دونوں قریبی پارک بھی جاتے۔ فیضان اس سے خفا ہوتا کہ بھائی کو نوکر کے ساتھ بھیج دیتے ہیں تمہیں کیا ضرورت ہے جانے کی۔ مگر ریا کو فیضان کی اس بات سے شدید اختلاف تھا۔ پارٹی کا ارادہ ہوتا تو ریا ضرار کو بھی کھینچ کر بٹھا لیتی جس پر فیضان رنگ میں بھنگ ڈالنے کی پاداش میں خوب ابرو چڑھاتا۔ اسے ریا کا ضرار کے قریب ہونا بالکل پسند نہیں تھا۔ مگر براہ راست نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆......☆......☆

''ہیلو ینگ لیڈی۔'' ہال میں ریا کی شوخ آواز گونج گئی۔ ریا سے ایسے القابات سننے کی سارہ بیگم عادی ہو چکی تھیں۔ اس لیے جواباً خوش دلی سے ملیں۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اس کے بعد سارہ بیگم نے اُسے ضرار کی خراب طبیعت کے بارے میں بتایا۔ وہ فوراً ضرار کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور بنا ناک کیے اندر داخل ہوگئی۔

''آپ کی طبیعت خراب ہے؟ اور مجھے بتایا بھی نہیں۔'' وہ شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''تمہارے پاس آبِ شفا ہے میرے لیے تو کردو ٹھیک مجھے......'' وہ نم لہجے میں بولا تو ریا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

صرف دو سال کی ہی تو بات ہے جب وہ اپنے پیروں پر چل سکتا تھا۔ اعلیٰ شکل وصورت اور اعلیٰ کردار کے باعث ہزاروں دل اس کے لیے دھڑکتے تھے۔ مگر اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس کا اپنا بھائی اس کا دوست کسی کھلونے کی طرح اُسے رکھ کر بھول چکا تھا۔

''تم بھی اکتا جاتی ہوگی میری باتوں سے حتیٰ کہ

میری موجودگی سے باقی سب لوگوں کی طرح کیوں آئی ہو یہاں...... کیوں آ کر اپنا وقت برباد کر کے میرے مردہ دل کو جینے کی آس دیتی ہو۔'' اس پر ایک جنون کی کیفیت طاری تھی۔ شاید وہ ریا سے ناراض تھا۔

''آپ نے اتنا تنگ دل پایا ہے مجھے تو یہ بھول ہے آپ کی ضرار میری دوستی اور انسیت کو آپ اپنی مایوسی میں کیوں بہا دیتے ہیں۔ ضرار ایسا مت سوچیں۔ میں آپ کے دل میں اپنے لیے ایسی سوچیں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔'' وہ آنسوؤں سے بھرپور آنکھیں لیے اسے اپنی وفا کا یقین دلا رہی تھی۔ مگر ضرار کا دل تو جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر طرح کے جذبات سے عاری۔

''مجھے آرام کرنا ہے تم جاؤ......'' وہ لیمپ آف کرتے ہوئے اُسے کہہ رہا تھا۔ وہ فقط اسے بے بسی سے دیکھ کر پلٹ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے روز شام کو وہ مکمل تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ بالکل ایسے حلیے میں جس طرح ضرار اسے دیکھنے کی خواہش کرتا تھا کھلے گھیرے والی شلوار اور شارٹ شرٹ کے ساتھ لمبے ریشمی بال لہرا لہرا کر اسے اور بھی خوبصورت بنا رہے تھے۔

''ماشاء اللہ...... کیا خیرہ کرنے والا حسن پایا ہے محترمہ نے......'' ریا کو دیکھتے ہی فیضان نے ڈائیلاگ بولا۔

''اچھا تو تم جیلس ہوئے......؟'' ریا نے شکل بناتے اسے چھیڑا۔

''بالکل نہیں اپنی چیز سے کیسی رقابت......'' وہ ذومعنی جملہ بول کر براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

ریا اُس کا مطلب سمجھ چکی تھی مگر وہ اسے سنجیدہ لے کر شہ نہیں دینا چاہتی تھی اس لیے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ فیضان کی آنکھیں دیر تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

پھوپو گھر پر نہیں تھیں اس لیے وہ سیدھی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دو کپ کافی بنا کر ٹرے میں رکھ ہی رہی تھی کہ فیضان پھر سے وارد ہو گیا۔

''تھینکس بیوٹی......''

کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے شوخی سے بولا۔

''یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔'' ریا نے فوراً اس سے کافی کا مگ جھپٹا اور ٹرے میں رکھ لیا۔

''یہ ضرار کے لیے ہے......''

''او ہو ابھی سے سسرالیوں کی خدمتیں وہ بھی صدا کا ڈھیٹ تھا۔ مکمل طور پر اس کا اسٹیمنا چیک کرنا چاہتا تھا۔

''خوش فہمی بلکہ غلط فہمی ہے تمہاری میں اپنی پھوپو کے گھر میں ہوں سسرال میں نہیں۔'' وہ مصنوعی بھولپن سے کہتے ہوئے نکلنے میں عافیت جانی۔ کیونکہ وہ فیضان کے ارادے بھانپ گئی تھی۔

آج وہ ضرار کو منانے کی غرض سے آئی تھی۔ حالانکہ ناراضی کی وجہ وہ نہیں جانتی تھی مگر محبت میں محبوب آقا بن جاتا ہے اور اپنے آقا کو کون ناراض دیکھ سکتا ہے۔

ضرار بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ ریا نے ٹرے آرام سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور آہستہ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی آمد سے بے خبر نہیں تھا۔

''تم واقعی ہی پاگل ہو ریا۔'' اس نے ریا کا ہاتھ اپنے ماتھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہوں میں پاگل آپ نے کیا ہے مجھے پاگل اگر چھوڑنا ہی تھا تو کیوں مجھے اپنے سنگ محبت

کی حسین وادیوں میں اُتار اُ کہہ دیتے نہیں کرتا میں تم سے محبت ...... مر جاتی میں تو کیا ہوتا آپ کا درد سر تو ختم ہو جاتا۔'' وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

ضرار کو اپنے تلخ رویے کا احساس ہو گیا تو اس نے نرمی سے ریا کا ہاتھ تھام لیا۔

''سوری...... میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میں کیا کروں تمہیں یوں اپنی بے سہارا محبت کا بہلاوا دے کر خوش فہم نہیں کرنا چاہتا۔ کبھی کبھی محبت ناسور بن جاتی ہے جسے کاٹ کر پھینکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ میں بھی وہی ناسور بن چکا ہوں تمہارے لیے میں تمہیں اپنی محبت کے پنجرے میں مقید کر کے تمہاری خوشیاں نہیں چھین سکتا۔ وہ بظاہر تو اسے سمجھا رہا تھا مگر اس دل اس خیال سے بھی گھائل ہو جاتا تھا کہ ریا اس سے بچھڑ جائے۔

اگر میں کیوں کہ مجھے پسند ہی آپ کی محبت کی قید تو آپ زبردستی مجھے آزاد نہیں کر سکتے۔ اس نے کافی کا مگ اسے تھماتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی۔

☆......☆......☆

ضرار زیادہ تر کمرے میں ہی ناشتہ کرتا تھا اس لیے کھانے کی میز پر حسبِ معمول صرف فیضان اور سارہ بیگم تھیں امی مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' فیضان نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو سارہ بیگم بھی متوجہ ہو گئیں۔

''امی مجھے ریا پسند ہے۔ آپ ممانی اور ماموں سے بات کریں۔'' اس نے نارمل انداز میں کہا تھا۔

''سارہ بیگم کو شروع ہی سے ضرار اور ریا کے بارے میں اندازہ تھا اس لیے وہ قدرے حیران اور پریشان ہو کر بولیں۔

''کیا تمہیں نہیں پتہ ریا کا جھکاؤ بچپن سے ہی ضرار کی طرف ہے۔ یعنی وہ دونوں شاید محبت کرتے ہیں۔''

''اوہو امی آپ بھی کس زمانے کی بات کر رہی ہیں۔ خود ہی بتائیں کوئی لڑکی معذور شخص سے شادی کرنا پسند کرے گی۔ ویسے بھی بھائی شاید اسے نہ کر چکے ہیں کل میں نے اُن کی باتیں سنی تھیں۔ جاتے ہوئے ریا کا موڈ بھی خراب تھا۔ اس لیے آپ بے فکر ہو کر بات کریں۔ آفٹر آل میں پرفیکٹ ہوں اس نے اتراتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ سارہ بیگم بڑے بیٹے کی محبت کو یکسر نظرانداز کر کے وہ اب بھائی سے رشتہ مانگنے کا سوچ رہی تھیں۔

دسمبر نے خوب دھوم مچا رکھی تھی تمام تعلیمی ادارے بھی شمال علاقہ جات کی طرف ٹوورز پر جا رہے تھے ریا بھی اپنی یونیورسٹی کے گروپ کے ساتھ اسکردو جا رہی تھی۔ تین سال قبل وہ فیملی کے ساتھ اسکردو گئی تھی ضرار بھی ساتھ تھا۔ ان دونوں نے ایک بڑے پتھر پر چند لکیریں کھینچی تھیں۔ محبت کی لکیریں...... ریا وہاں جا کر انہیں دوبارہ دیکھنا چاہتی تھی اور ضرار کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ ابھی تک تمہاری اور میری منتظر ہیں۔

آج رات ریا کی روانگی تھی۔ ضرار سے فون پر لمبی بات ہوئی۔ ریا کو لگا شاید وہ اس کے جانے سے اداس ہے۔

''اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو میں کینسل کر دیتی ہوں پلان۔'' وہ صدقِ دل سے کہہ رہی تھی۔

مگر ضرار نے اسے جانے پر فورس کیا تو نا چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ ریا روانہ ہو چکی تھی۔ فیضان کو خبر ہوئی تو فوراً ہی سارہ بیگم کو بتایا کیونکہ ریا کی غیر موجودگی میں ہی ایسا ممکن تھا کیونکہ اگر اس کی رائے پوچھی گئی تو یقیناً وہ ضرار کے حق میں تھی۔ دوسری طرف ضرار تمام بات چیت سے بے خبر ڈرائنگ بورڈ پر ریا کے اسکیچ کو مکمل کر رہا تھا۔

صرف آنکھیں بننا باقی تھیں۔ آج ایک بار پھر اس کا دل تمام تر شدتوں کے ساتھ جینے کا خواہش مند تھا۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ اس کا بھائی اس کی خوشیوں پر شب خون مارے گا۔

سارہ بیگم کے بھائی اور بھابی باخوشی رضا مند ہوگئے منگنی وغیرہ کا اہتمام بالکل نہیں کیا گیا تھا۔ ڈائریکٹ نکاح کی ڈیٹ منتخب کرلی گئی۔ یہ سب فیضان کی خواہش پر ہوا تھا۔ ریا اور ضرار اس سے بے خبر تھے۔

☆......☆......☆

فیضان کمرے میں داخل ہوا تو ضرار کتاب کا مطالعہ کررہا تھا۔

''برو کبھی کمرے سے نکلا بھی کریں۔ آپ تو غالب ہی بن بیٹھے ہیں۔ ہر وقت مطالعہ......'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تو ضرار نے صرف مسکراہٹ میں ہی جواب دینا ضروری سمجھا۔

''اچھا یہ لیں مٹھائی کھائیں بہت جلد آپ کا بھائی دُلہا بنے گا۔'' اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے مٹھائی ضرار کے سامنے کی۔

''مبارک ہو......کس کی قسمت پھوٹی جو تمہاری باتوں میں آ گئی۔'' ضرار نے گزشتہ تمام ناانصافیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اُس کی خوشی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

''ریا سلطان کی...... آپ کی چہیتی کزن کی......'' اس نے بڑے بامعنی انداز میں جواب دیا اور ضرار کے فیس ایکسپریشن پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر مخالف بھی ضرار تھا۔ اس نے کمال اداکاری سے کام لیتے ہوئے ناصرف مٹھائی کھائی بلکہ اپنے ٹوٹے دل کی خفیف سی پرچھائی بھی چہرے سے عیاں نہ ہونے دی۔

فیضان جا چکا تھا۔ اس کی کمرے سے لے کر اس کے رگ رگ میں وحشت گھول کر ناامیدی اور محبت کا ایک کھولتا ہوا دریا تھا...... جسے عبور کرنا اس کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اس لیے اس نے باخوشی ڈوبنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ڈرائنگ بورڈ پر صرف آڑھی ترچھی لکیروں کی اوٹ سے ریا کا نامکمل چہرہ نظر آرہا تھا۔

جسے ضرار نے مزید چھپا دیا بالکل ایسے ہی جیسے وہ اپنے دل کو منوں مٹی تلے دفن کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔

ریا مسلسل کال کررہی تھی۔ مگر اپنی ٹوٹی پھوٹی ذات کا ریا کی ہمدردی اور محبت سے جوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے موبائل کو آف کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

ایک ہفتہ ہو چکا تھا اسے گئے ہوئے مگر ضرار سے ایک دفعہ بھی بات نہیں ہو پائی تھی اس کا موبائل مسلسل بند تھا اس لیے اس نے واپسی کا ارادہ کرلیا۔

☆......☆......☆

ریا کی آمد اچانک تھی اس لیے سب حیران اور خوش بھی تھے۔

''مما پھوپو کے گھر میں سب خیریت ہے۔'' اس نے مما سے استفسار کیا۔

''ہاں سب ٹھیک تھا بلکہ بہت ٹھیک ہے۔ اب وہ پھوپو کا نہیں تمہارا گھر بننے والا ہے۔'' مما نے خوشی سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......'' ریا کے دل نے یکدم خطرے کا الارم بجایا تو بے صبری ہو کر بولی۔

''مما بتائیں ناوہ میرا گھر کیسے بن جائے گا۔'' اس کی آنکھوں میں تفکر تھا۔ مما کی بات نے اس کے شک کو یقین میں بدل دیا۔ تو کیا یہی وجہ تھی کہ ضرار میری کال اٹینڈ نہیں کررہے تھے۔ فیضان تو سب جانتا تھا اس کے باوجود وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ ضرار یقیناً اسے بے وفا سمجھ رہا ہوگا۔ اس خدشے نے سر

اٹھایا تو وہ فوراً ہی گھر سے نکل گئی۔ مما آوازیں دیتی رہ گئیں مگر اس نے بالکل نہ سنی۔

30 منٹ کا فاصلہ تھا پھوپو کے گھر کا..... مگر ایسا لگ رہا تھا ہزاروں ماہ و سال گزر گئے ہیں گاڑی میں..... وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس ارادے سے اندر داخل ہوئی کہ ضرار کو اپنی وفا کا یقین دلائے گی مگر فیضان سے بری طرح ٹکرا گئی۔ فیضان جو پہلے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ جلدی سے اسے تھام کر بازوؤں کا گھیرا اس کے گرد تنگ کرلیا۔ وہ اس گرفت میں بری طرح کسمسائی تو فوراً فیضان کو اسے چھوڑنا پڑا۔

''جانِ من اتنی بے پروائی..... آخر تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔'' اس نے حق جتاتے ہوئے کہا تو ریا کا پارہ ہائی ہوگیا۔

''جسٹ شٹ اپ..... شٹ یور ماؤتھ.....'' یہ استحقاق کسی اور پر جتانا' ہٹو میرے راستے سے.....''

وہ تقریباً اُسے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

فیضان فقط کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ اس کی پندرہ سالہ معصوم محبت کو تار تار کرنے پر اتنے سے ری ایکشن کی اُسے امید تھی۔

☆......☆......☆

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تو کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ کمرے میں غزل کی مدھم آواز کا بسیرا تھا۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اس نے لائٹ آن کرتے ہوئے ساتھ ہی سی ڈی پلیئر آف کردیا۔ ضرار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے پھوپو کو بتایا نہیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔'' اس نے بڑے ہی پختہ لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''کون سی محبت..... وہ محبت جو کسی اور کی ہوگئی۔ اگر یہی سوال میں تم سے کروں کہ تم اتنی آسانی سے کسی اور کی کیسے ہوسکتی ہو تو کیا جواب دو گی۔'' اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

''تو یقیناً ضرار میں کہوں گی کہ ریا سلطان مرجائے گی مگر محبت میں دوغلا پن دکھا کر اسے داغ دار نہیں کرے گی۔'' اس نے بھی جواباً چیخ کر جواب دیا۔

''لیکن میں تمہاری قربت کے لیے تمہیں رسوا نہیں کرنا چاہوں گا۔ فیضان ایک آئیڈیل پرسنلٹی کا مالک ہے تم اس کے ساتھ خوش رہوگی۔ اور ویسے بھی یقین کرو تم مجھے بھول جاؤ گی بلکہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا ہمیشہ کے لیے۔'' وہ اسے بہلانے کی کوشش کررہا تھا۔

''محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے.....'' اس نے ایک اور سوال داغ دیا تھا۔ مگر جواب خاموشی تھا۔

''تو گویا آپ یہی چاہتے ہیں میں تو آپ کو اپنی محبت بلکہ جنونیت کا یقین دلانے آئی تھی اور آپ تو یوں بھولے بیٹھے ہیں جیسے میری میت پر ماتم بھی اس غرض سے نہیں کریں گے کہ محبت کا راز راز ہی رہے۔''

''تم فیضان سے شادی کرلو۔'' ضرار نے بنا نظریں ملائے اُس سے کہا تو ریا نے بے اختیار اسے کالر سے جھنجھوڑ ڈالا۔

''اگر اب آنکھوں میں اتنی بزدلی ہے کہ ملا بھی نہیں پارہے تو اس وقت روکنا تھا مجھے جب دھیرے دھیرے اُن کی گہرائی میں ہاتھ پکڑ کر قدم قدم اُتار رہے تھے۔'' وہ شدید غم و غصہ کی کیفیت میں تھی۔ وہ مجرم بنا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''وہ محبت نہیں ہمدردی تھی تمہاری.....'' وہ مکمل

طور پر اُس کا دل توڑ کر نئی زندگی میں اسے دیکھنا چاہتا تھا مگر دل توڑنے سے اگر محبت مر جاتی تو مرزا کے بعد کوئی کسی سے محبت نہ کرتا۔

''ٹھیک ہے آپ کی محبت بلکہ ہمدردی میں، میں کرلوں گی شادی فیضان سے، مگر آپ گناہگار ہیں میرے..... قیامت کے روز چیخ چیخ کر بتاؤں گی خدا کو۔'' وہ روتے ہوئے کمرے سے جا چکی تھی۔ ضرار کو اپنی پرواہ نہیں تھی۔ اس لیے وہ پرسکون تھا کہ ریا وقت کے ساتھ اسے بھول جائے۔

☆.....☆.....☆

شادی کی تیاریاں اپنے جوبن پر تھیں سیارہ بیگم کے گھر میں بری کی تیاریاں زور و شور پر تھیں۔ فیضان بھی شاپنگ اور دوسری انتظامات میں مصروف تھا۔ ریا کو جیتنا اُس کی سب سے بڑی فتح تھی۔ ضرار معمول کے مطابق اپنے کمرے اور اپنی ذات کے حصار میں مقید تھا۔ آج کل وہ اپنے امریکہ کے کاغذات پر کام کررہا تھا۔ فیضان کی شادی کے فوراً بعد وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ جبکہ ریا مسلسل خاموشی کی چادر اوڑھے ہوئے تھی نہ کسی سے کچھ کہتی نہ سنتی بس لائٹس آف کر کے کمرے میں پڑی رہتی۔ اس کی ان حرکات کو سب شرماہٹ کا نام دے رہے تھے مگر وہ تو دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے لیے کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی۔ وہ نہ تو فیضان سے اپنی بخشش مانگ سکتی تھی اور نہ ہی اس سنگدل کے آگے اپنی قبولیت کے لیے گڑگڑا سکتی تھی۔

مما اس کے کمرے میں آئیں تو اس کا تکیہ خاموش آنسوؤں کی گواہی دے رہا تھا۔ ماں تھیں آخر بہت کچھ سمجھ گئیں۔

''بولو میری بچی!''

''نہیں..... نہیں کرنا چاہتی میں شادی.....'' وہ فوراً ہی پھٹ پڑی۔

''مما مجھے بچالیں میں مر جاؤں گی۔'' وہ اُن کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

مما کو اس کے ردِعمل پر شدید دھچکا لگا تھا۔

''آخر کیوں نہیں تم شادی کرنا چاہتی۔''

''مما میں ضرار سے محبت کرتی ہوں وہ بھی کہتے ہیں شادی کرلو مما خود ہی بتائیں میں منافقت بھری زندگی کیسے گزاروں گی۔ آپ سب تو جانتے تھے حتیٰ کہ پھوپو کو بھی سب علم تھا۔''

''دیکھو میری جان پہلے کی بات اور تھی تم ضرار کی حالت تو دیکھو۔ تم بہت جلد اس سے اُکتا جاؤ گی ایک اور بات اگر تم کسی اور کا نام لیتی تو میں یہ شادی روک دیتی۔ لیکن اس حماقت کی میں تمہیں ہرگز اجازت نہیں دوں گی اگر تم نے ایسا کچھ کیا جو ہماری مرضی کے خلاف ہوا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تمہیں فیضان سے شادی کر کے اپنے والدین کے احسانات کا بدلہ چکانا ہوگا۔''

اس آخری جملے نے اس کی روح کو گھائل کردیا۔ قسمت اسے فیضان نامی کنوئیں میں پھنکنا چاہتی تھی۔ اس لیے اب خاموشی ہی اس کا واحد راستہ تھی۔ اور وہ اپنی خاموشی کو ابدیت کا رنگ دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''ضرار میں چاہتی ہوں اگر مجھے موت آئے تو میں اس مشکل گھڑی کو آپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آپ کے سنگ گزاردوں۔''

ریا نے یہ جس قدر جذب سے کہا تھا ضرار کا ردِعمل اتنا ہی شدید تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ دونوں یونیورسٹی جایا کرتے تھے آج یہ بات ریا کو یاد آرہی تھی۔

''بیوٹیشن اسے مہندی لگانے کے بعد دلہن بنارہی تھی۔ سرخ کامدار لہنگے میں وہ سوگوار سی بہت حسین لگ رہی تھی۔ آنسو مسلسل اُس کی آنکھوں

میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک غم کا سمندر تھا جو اس کے دل کو توڑ کر نکلنا چاہتا تھا۔ رخصتی کا وقت قریب آیا تو اس نے آخری بار اپنے کمرے میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مما اس کے ساتھ جانا چاہتی تھیں مگر اس نے منع کر دیا۔

وہ کمرے سے نکلنے کے بعد بہت خوش تھی۔ سب سے ملنے کے بعد وہ کمال اعتماد کے ساتھ فیضان کے ہمراہ اُس کا ہاتھ تھام کر چلنے لگی۔ فیضان کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی پورچ میں رُکی ریا اور فیضان پھوپو اور باقی مہمانوں کے ہمراہ اندر آنے والے تھے۔ ضرار ملازموں کے ساتھ ہال کے گیٹ پر اُن کا منتظر تھا۔ معمول کے خلاف آج وہ اچھے طریقے سے تیار ہوا تھا تاکہ اس کی گھائل روح کا شائبہ تک بھی کسی کو نہ ہو۔

ضرار نے اپنی نگرانی میں فیضان اور ریا کا کمرہ سرخ گلابوں سے سجوایا۔ اب وہ ہال کی سجاوٹ میں مصروف تھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھا ملازموں کو ہدایات دے رہا تھا۔ ہال کے دروازے سے لے کر اُن کے کمرے تک سرخ قالین اور اس کے اوپر دیئوں کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ لائٹس آف کر کے وہ ملازمین کے ساتھ اُن کا منتظر تھا۔ اس کے دل میں ایک بجھی سی خواہش نے سر اٹھایا کہ کاش وہ اس قابل ہوتا کہ ریا اس کی ہو جاتی۔ مگر اگلے ہی لمحے سختی سے اس کے ضمیر نے اسے سرزنش کر کے خاموش کروا دیا۔ ریا نے قدم اندر رکھا تو ضرار کا دل بھی ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ دیئوں کی روشنی میں وہ اس کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر ایک بار پھر ٹوٹ سا گیا۔ اسے ریا آج بے وفا لگی۔ لائٹس آن کر دی گئیں۔

ریا فیضان کے پہلو میں دھیرے دھیرے قدم رکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں ضرار پر جمی ہوئی تھیں۔ ضرار بھی یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے قدموں میں لرزش اور آنکھوں میں بکھرے آنسو جنہیں وہ دیکھ رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا۔ ریا فیضان کی پرواہ کیے بغیر مسلسل ضرار کو دیکھ رہی تھی۔ سوائے اطمینان کے ان آنکھوں میں کچھ نہ تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے قدم ڈگمگائے اور وہ کسی شیشے کی گڑیا کی طرح زمین بوس ہو گئی۔ عین ضرار کے سامنے اُس کی آنکھیں بھی اسی عالم میں مند گئیں۔ ضرار آگے بڑھ کر اسے تھامنا چاہتا تھا مگر وہ اس قابل ہی کب تھا وہ اٹھنے کی کوشش میں گر گیا تھا۔ ان ساعتوں میں ضرار کے کانوں میں ریا کا وہی جملہ گونج رہا تھا۔

☆......☆......☆

''ضرار میں چاہتی ہوں اگر مجھے موت آئے تو میں اس مشکل گھڑی کو آپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آپ کے سنگ گزاروں۔''

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ زہر اس قدر مہلک تھا کہ جان بچانا ناممکن تھا۔ وہ واقعی ہی اپنی خواہش کی تکمیل کر چکی تھی۔ ضرار سمیت تمام نفوس کے لیے سوائے پچھتاوے اور عبرت کے لیے کچھ نہ بچا تھا۔

ضرار نے ریا کو فیضان کو سونپ کر اسے نئی خوشحال زندگی دینی چاہی مگر وہ بھول گیا تھا وہ ریا سلطان تھی جو ہر لحہ اپنی محبت کی پاسداری کے لیے ہلکان رہتی فیضان نے ریا کو تو جیت لیا مگر صرف ایک نامکمل شام کے لیے...... جو شام زندگی بھر اسے شکست کا احساس دلائے گی۔

جو رُکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار قدم قدم ہم نے تجھے یادگار بنا دیا

☆☆......☆☆

زندگی سے جڑے اک حسین رنگ کا چھٹا حصہ

''میں حلفیہ آپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ڈیڈی کو آپ کے منہ سے نکلے ایک لفظ کا پتہ بھی نہیں چلے گا......''

اور ماہا مجبور ہوگئی...... ہار گئی......

☆......☆......☆

ماہا نے اپنی داستان کیا سنائی...... جینا کو چپ سی لگ گئی۔ اُسے یوں لگا کوئی چیز دھڑام سے زمین پر گری ہو اور ٹوٹ گئی ہو۔ شاید یہ جواد کا وہ بت تھا جو اُس کے دل میں سب سے بلند جگہ پر ایستادہ تھا۔ اَنا اور ضد کوئی زندگی اس طرح برباد بھی کرسکتی ہے اُس نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اَنا اور ضد کی خاطر کوئی اپنی زندگی کے بائیس سنہری سال یوں ضائع بھی کرسکتا ہے۔ یہ خیال ماہا اور جواد کی داستان سننے کے بعد ہی اُس کے دل میں آیا تھا۔

ان دنوں اُس کے پاس سوچنے کے لیے دو ہی موضوع تھے۔ اپنے والدین کی داستان اور اپنی داستان...... اُس کو سامنے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ ہینڈسم تو یوں اُس کی زندگی میں طوفان کی طرح آیا تھا اور کسی ہریکین کی طرح سب کچھ برباد کر کے چلا گیا...... دل کو اُس سے ہزاروں گلے تھے۔ لیکن دل کو پھر بھی اُس سے شدید محبت تھی۔ اُسے بھولنا جینا کے بس میں نہیں تھا۔ اسی طرح ڈیڈی سے گلہ تھا۔ پھر بھی اُن کی محبت دل میں موجود تھی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اُن کی شخصیت کے ان تاریک پہلوؤں سے مایوس ہوئی تھی۔ لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے۔ وہ غلطیوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔

وہ تو بس دل میں روشن رہتی ہے...... دل کو روشن رکھتی ہے...... اندھیروں میں راستہ دکھاتی ہے...... ہینڈسم نے دل کو درد دیا تھا۔ لیکن یہ درد بھی انمول تھا...... زندگی بخش تھا...... سائے کی طرح وہ اُس کے ساتھ رہتا تھا...... واقعی کسی نے سچ ہی تو کہا ہے وہ محبت ہی کیا جس میں درد نہ ہو...... یہ درد بھی محبوب کی طرح عزیز ہوتا ہے...... محبوب کی دی ہر چیز عزیز ہوتی ہے چاہے

وہ درد ہی ہو......

ماہا چھوٹی سی ٹرے میں جوس کا گلاس لے کر آئی تو وہ چونک کر سوچ نگر سے نکل آئی۔

''کیا بات ہے...... بہت دنوں سے تم چپ چپ سی ہو...... خاموش ہو...... آخر کیا سوچتی رہتی ہو......؟'' جینا نے گلاس لے کر نظریں جھکا لیں۔

''بس یونہی زندگی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں...... ڈیڈی کے بارے میں سوچتی ہوں......''

''مجھے امید ہے تم اُن کے بارے میں منفی انداز میں نہیں سوچتیں...... تمہاری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔'' ماہا نے پُر امید نظروں سے اُسے دیکھا۔

''آف کورس ناٹ ممی......'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''ہاں تھوڑی مایوسی ضرور ہوئی ہے لیکن میں نے خود کو اُن کی جگہ رکھ کر سوچا تو وہ اتنے غلط بھی نہیں لگے...... لیکن انہیں آپ کے بارے میں اتنی دل شکن باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں...... انکار کرنا تھا تو آرام سے بھی کر سکتے تھے۔ اب دیکھ لیجیے ان باتوں کی وجہ سے اپنی اور آپ کی زندگی کو جہنم بنا لیا...... اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ نقصان تو میرا ہی ہوا...... میں ماں کی خالص محبت کا مزہ نہ چکھ سکی...... مجھے اُن سے سب سے بڑا شکوہ یہی ہے کہ انہوں نے آپ کو مجھ سے دور کر دیا...... ماں باپ کے جھگڑوں میں سب سے زیادہ نقصان اولاد کا ہی ہوتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہوئے بہت سمجھدار لگ رہی تھی۔ ماہا نے غور سے اُس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔

''جواد اتنے قصوروار نہیں ہیں......'' ماہا پُرسوچ انداز میں بولی۔

''رشتہ تو بے جوڑ تھا لیکن اگر جواد کو معلوم ہوتا کہ میں ساتھ والے کمرے میں ساری گفتگو سن رہی ہوں تو شاید وہ اتنے دل شکن الفاظ استعمال نہ کرتے۔''

''لیکن ممی اصل بات تو یہ ہے کہ یہ الفاظ اور جذبات اُن کے دل میں تھے۔ یہ تلخی اُن کے اندر موجود تھی۔ ورنہ زبان پر کبھی نہ آتی چاہے آپ سن رہی ہوتیں یا نہیں۔'' جینا زور دے کر بولی تو ماہا اُسے سمجھانے والے انداز سے گویا ہوئیں۔

''اُن کی ساری زندگی، پورا مستقبل داؤ پر لگا تھا...... جب ایسی سچویشن ہو تو انسان بغیر سوچے سمجھے دل کے جذبات زبان پر لے ہی آتا ہے...... تم اس بارے میں مت سوچو۔''

''اگر یہ بات ہے ممی تو پھر آپ اپنی بے عزتی کیوں نہیں بھلا سکتیں...... آپ اپنی تلخی کیوں کم نہیں کر سکیں...... آپ نے اُن کو کیوں معاف نہیں کیا...... آپ نے اُن کو جیتنے کی کوشش کیوں نہیں کی...... میری خاطر ہی سہی کوشش کی ہوتی۔''

''کوشش کی تھی...... لیکن شاید وہ کافی نہیں تھی۔ میں تم سے یہی کہنا چاہتی ہوں کہ ہم دونوں ہی قصوروار ہیں...... ہو سکتا ہے دونوں میں سے کوئی ایک زیادہ قصوروار ہو لیکن کسی کو بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا...... تم...... بس تم یہ خیال رکھنا کہ خدا تمہیں کبھی ایسی سچویشن میں نہ ڈالے۔''

''میں......'' وہ تلخی سے ہنسی......

''میں تو آل ریڈی ایسی سچویشن میں ہوں ممی...... مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کر ایک ایسے شخص سے وقتی طور پر طلسماتی حالات کے شکنجے میں آ کر شادی کر بیٹھی...... جس کا اصلی نام نہیں جانتی...... اُس کا

خاندان نہیں جانتی...... وہ کہاں رہتا ہے یہ تک نہیں جانتی...... وہ کبھی واپس آئے گا یا نہیں یہ پتہ نہیں مجھے...... میں نے ڈیڈی کے بارے میں اُس وقت ایک لحظہ کے لیے نہ سوچا۔ اُن کی عزت کے بارے میں نہ سوچا۔ بس دل میں بات تھی تو صرف ایک کہ میں اُس شخص سے اپنی ذات سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ اُس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اُس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا...... اُس کی ایک بار کی آفر پر کچھ سوچے بغیر کورٹ چلی گئی اور نکاح کے کاغذ پر دستخط کر دیے......

اور آپ جانتی ہیں اُس رات کے بعد میں نے اُس کی شکل نہیں دیکھی اُس کی آواز نہیں سنی...... اُس نے کوئی رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے اُس سے نفرت ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن کمال کی بات ہے دل میں آج بھی اُس کے لیے صرف محبت ہے۔ دل کو پھر بھی اُس سے شکایت نہیں۔'' وہ بری طرح آنسو بہا رہی تھی اور ماہا حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جینا کو اس قابل کہاں سمجھتی تھی۔ اُس کی کھلنڈری لاپرواہ اور لاابالی شخصیت کو دیکھتے ہوئے اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی گہری محبت کر سکتی ہے۔ شاید اسی لیے اُسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔

اُس کا اصلی نام کیا ہے...... کہاں رہتا ہے...... کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ باتیں اُس کے لیے اہم نہیں تھیں۔ اور سب سے زیادہ حیران تو وہ نکاح کی بات سن کر ہوئی تھی۔ آج سے پہلے کبھی جینا نے نکاح کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ تو یہ بچہ ناجائز نہیں ہوگا...... یہ جینا کی جائز اولاد ہے...... اُس نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

معاشرے کی نظر میں ابھی بھی وہ قصوروار تھی۔ لیکن ماہا تو حقیقت جان گئی تھی۔ کم زکم جینا نے گناہ نہیں کیا تھا۔

''تم نے کبھی اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی؟''

''بہت کوشش کی ممی...... پہلے تو اُس نے بتایا تھا کہ وہ اُسی رز کسی کورس کے سلسلے میں ملک سے باہر جا رہا ہے...... پھر کئی جگہوں پر سیر و سیاحت کے لیے جائے گا۔ اُس کے دوست بھی وہیں جوائن کریں گے۔ وہ اپنے کزن کے پاس ٹھہرے گا اور جیسے ہی اپنا موبائل خریدے گا۔ آئی مین انٹرنیشنل موبائل تو مجھے نمبر بتائے گا...... لیکن میں انتظار ہی کرتی رہ گئی۔ اُس کی کال نہیں آئی...... میرے دل میں خوف اترنے لگا...... کیا پتہ وہ بھی عام لڑکوں کی طرح مجھے دھوکہ دے کر چلا گیا ہو...... پھر کبھی نہ ملنے کے لیے...... میرا دل بے چین ہونے لگا۔ میں ان سب جگہوں پر جاتی رہی جہاں اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں بھی گئی جہاں پہلی بار اُس سے ٹکرائی تھی۔ اُس کے اُس دوست کے گھر بھی گئی۔ جہاں ہم آخری دن ٹھہرے تھے۔ لیکن وہاں جو تالا لگا تھا وہ آج تک لگا ہے۔ اور تو اور اُس کا کوئی دوست مجھے آج تک نظر نہیں آیا......

جیسے صفحہ ہستی سے غائب ہو گئے ہوں......

کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ کوئی برا خواب ہو...... حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو...... لیکن پھر...... اپنی طرف دیکھتی ہوں تو یقین کرنا پڑتا ہے۔'' بھیگی سیاہ آنکھوں اور آنسوؤں سے ترغم زدہ چہرے کے ساتھ وہ انتہائی ڈپریس لگ رہی تھی۔ ماہا کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اتنی سی عمر میں کیا روگ لگا بیٹھی تھی۔ خود کو کیسی بھول بھلیوں میں

گم کرلیا تھا۔ زندگی کو اُلجھا ہوا گورکھ دھندہ بنالیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اس وقت ہاٹ چاکلیٹ کی سخت ضرورت ہے۔ دیکھنا جادو کا اثر دکھائے گی...... ایک دم ہشاش بشاش ہوجاؤ گی۔''

جینا بے اختیار مسکرائی۔ ہاٹ چاکلیٹ اُس کی کمزوری تھی۔

''آپ کو کیسے پتہ مجھے ہاٹ چاکلیٹ بہت پسند ہے؟''

''ماں ہو تمہاری...... حالات کیسے بھی ہوں...... مائیں بچوں سے بے خبر نہیں رہ سکتیں...... تم بس دو منٹ ویٹ کرو...... میں ابھی آتی ہوں۔''

ماہا چلی گئی تو جینا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بہتے آنسو صاف کیے اور بے اختیار اُس خوشگوار شام میں پہنچ گئی جب پہلی بار ہینڈسم سے ملاقات ہوئی تھی۔

بلو جینز اور بلیک لانگ شرٹ میں ملبوس بالوں کی ہائی پونی ٹیل بنائے وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے کافی کے ایک کپ کے لیے ریستوران جارہی تھی کہ دن میں تارے نظر آگئے۔ وہ ٹکر ہی اتنی زبردست تھی کہ پہلے تو اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پوری قوت سے اپنے سامنے کھڑے شخص کے چہرے پر زوردار تھپڑ جڑ دیا...... سامنے والا شخص جو اپنی پیشانی سہلا رہا تھا۔ پہلے تو ششدر رہ گیا پھر توہین کے احساس سے چہرہ سرخ ہوگیا۔

''دیکھ کر نہیں چل سکتے؟'' درد سے بے حال چیختے ہوئے اُس نے سامنے والے شخص کی طرف دیکھا اور اس کیفیت میں بھی نظریں ہٹانا بھول گئی...... دل نے ایک دھڑکن مس کی۔

''یہی بات میں بھی آپ سے کہہ سکتا ہوں......'' وہ کاٹ دار آواز میں بولا۔

''آپ کو اپنے ٹمپر کو کنٹرول میں رکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ خود کو کیا سمجھتی ہیں آپ...... کسی دیس کی ملکہ یا شہزادی جو جب دل آئے کسی پر ہاتھ اٹھالیا......'' وہ بڑی مشکل سے اپنی آواز کی تختی کنٹرول کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ زندگی میں پہلی بار تھا کہ اپنے دوستوں اور بے شمار لوگوں کے سامنے اُس کی بے عزتی ہوئی تھی۔ جو اُسے ہضم نہیں ہورہی تھی۔

''چلو چھوڑو...... ہینڈسم...... چلتے ہیں......''

''نہیں یار...... ایسی پٹاخہ قسم کی بدتمیز لڑکیوں کو سبق دینا لازمی ہے تاکہ آئندہ وہ کسی اور کے ساتھ ایسی حرکت نہ کریں...... خود کو خدائی فوجدار سمجھ رکھا ہے۔'' اِس کے چہرے کی سرخی ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔

''نہیں ہینڈسم...... اُس نے زیادتی کی ہے...... میں مانتا ہوں...... لیکن تم مرد ہو تمہیں برداشت کا ثبوت دینا ہوگا...... نظر انداز کردو اور چلو...... ہم یہاں تماشہ تو نہیں لگاسکتے...... سب دیکھ رہے ہیں...... یہاں سے چلنا ہی ٹھیک ہے ہینڈسم......''

''مت پکارو مجھے اس نام سے......'' وہ ناگواری سے بولا۔

اور غصے سے لڑکی طرف دیکھا جو ابھی تک بت بنی اُسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ سب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو اُسے ہوش آیا۔

''آئی ایم سوری......'' وہ ایکدم ہراساں ہوکر لڑکے کے سامنے آگئی جس کی چند لمحے پہلے

عزت افزائی کر چکی تھی۔
''آئی ایم سوری...... پلیز مجھے معاف کر دیں...... مجھ سے غلطی ہو گئی......'' ایک لمحے میں ہی اس کی آنکھوں میں ڈھیروں آنسو آ گئے۔ لیکن وہاں اَنا کو جو ٹھیس لگ چکی تھی۔ وہ ذرا سی معافی سے دور ہونے والی کہاں تھی۔ اُسے نظر انداز کرتا اپنے دوستوں کے ساتھ وہ چلا گیا۔ اور وہ کتنی دیر وہیں کھڑی رہی اور پھر دھیمے قدموں سے واپس مڑ گئی۔ کیسی کافی اور کہاں کی کافی...... دل ایک دم اچاٹ ہو گیا۔ لیکن اُس روز سے جو ہلکی سی کسک دل میں ہوئی اس نے جینا کا ساتھ نہیں چھوڑا وہ بہت ہینڈسم تھا۔ مردانگی اُس کے ہر انداز سے جھلکتی تھی۔ شاید اسی لیے دوست اُسے ہینڈسم کہتے تھے۔ ورنہ یقیناً اُس کا نام کچھ اور ہوگا۔ اُسے یہ بھی یاد رہا کہ وہ اس نام سے پکارے جانے پر چڑتا تھا۔ لیکن دوست پھر بھی زبردستی اسی نام سے بلاتے تھے۔

اُسے خود پر زبردست کنٹرول تھا۔ ورنہ اگر کوئی اور ہوتا تو اتنے بھرپور تھپڑ پر آپے سے باہر ہو جاتا۔ بے نقط سناتا...... تھپڑ کے جواب میں اُس سے بھی زور سے تھپڑ رسید کر کے بدلہ اتارتا......

لیکن اُس نے چند الفاظ کہنے پر اکتفا کیا۔ جواباً لڑکی پر ہاتھ نہ اٹھایا یہ اُس کی شرافت کا ثبوت تھا۔ ورنہ تھپڑ کے جواب میں تو لوگ کئی حدیں پار کر جاتے ہیں۔ بے عزتی سے سرخ چہرے نے جینا کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اُس کی عزتِ نفس کو سخت ٹھیس لگی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ دوستوں کے کہنے پر کوئی نازیبا حرکت کیے بغیر چلا گیا۔

''اوہ میں کیوں اُس کے بارے میں سوچ جا رہی ہوں...... میں کیوں اُسے ڈیفنڈ کر رہی ہوں...... اُس کا سایہ کیوں میرے ساتھ ساتھ ہے۔ وہ کیوں میرے خیالوں میں آ بسا ہے...... میں اسے بھول کیوں نہیں پا رہی...... اور...... اور دل کیوں اُسے دوبارہ دیکھنا چاہتا ہے...... پتہ نہیں اُس سے ملاقات ہو پائے گی یا نہیں......

''نہیں......'' وہ ساری جان سے لرز گئی۔ مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اللہ کرے اُس سے جلدی ملاقات ہو۔ کتنے ہی دن وہ دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتی رہی۔ دل بے چین تھا...... بے قرار تھا اور مضطرب بھی تھا۔ آخر اُس کی دعائیں رنگ لائیں...... اُس روز وہ سوچ رہی تھی اسے دوبارہ اُسی ریسٹوران جانا چاہیے۔ شاید اگر قسمت اچھی ہوئی تو ملاقات ہو جائے۔

اُس روز وہ بلیک اور فیروزی بے حد خوبصورت کامبی نیشن والے اسٹائلش ڈیزائنرز سوٹ میں ملبوس تھی۔ بال بھی خوبصورت اسٹائل میں کٹے ہوئے تھے بڑا سا دوپٹہ کندھے پر ڈالے...... ریسٹوران کے بیرونی دروازے پر کھڑے ہو کر اُس نے بیٹھنے والوں کا جائزہ لیا تو ایکسائٹمنٹ سے دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بلیک براؤن ڈریس شرٹ اور جینز میں ملبوس وہ ایک ٹیبل پر سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ براؤن گھنے بال ماتھے پر پڑے اُسے اور بھی ہینڈسم بنا رہے تھے۔ اُس کے سامنے کافی کا کپ تھا جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ بے خیالی میں وہ میز پر پڑے کی چین کو انگلیوں میں گھما رہا تھا۔ جینا دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' اُس کی آواز سن کر اُس نے چونک کر اوپر دیکھا۔ ایک لمحہ کو پہچان کی لہر ابھری اور اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''میرے دوست کسی بھی وقت پہنچنے والے ہیں۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔ لیکن دوبارہ جینا کے چہرے پر نظر نہ ڈالی۔ جینا خود ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

''میں صرف چند منٹ لوں گی آپ کے......'' وہ لجاجت سے بولی۔

''اُس دن ...... اُس دن کے لیے میں معذرت خواہ ہوں...... مجھے بے حد افسوس ہے...... دراصل اتنی زور کا درد ہوا تھا کہ میں ضبط نہ کرسکی......اور بے پناہ غصے میں......'' وہ اپنا جملہ پورا نہ کرسکی۔ وہ خاموش تھا...... خاموش ہی رہا...... اُس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا...... نہ ہی اُس کی طرف دیکھا۔

''تو آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟'' یوں نظر انداز کیے جانے پر وہ بھیگی آواز میں بولی تو اُس نے آنکھیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ بھیگی بھیگی کاجل سے سجی بے پناہ سیاہ آنکھیں...... کانپتے لب اور آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتا گلابی چہرہ...... غصے اور ناراضگی کے باوجود وہ اُسے دیکھے گیا۔

''غلطی ہر انسان سے ہو جاتی ہے...... اور معاف کر دینے والا بڑا انسان ہوتا ہے۔'' وہ نظریں جھکائے دھیمی آواز میں بولی۔

''تو شاید میں بڑا انسان نہیں ہوں...... چھوٹا آدمی ہوں۔'' وہ اُس کی آنکھوں میں غور سے دیکھ کر بولا۔ وہ جینا جو کسی سے نہیں ڈری تھی۔ جانے کیوں اُس کے سامنے دوسری بار بے بس ہوگئی۔

''ویسے میرا معاف کرنا آپ کے لیے اتنا اہم کیوں ہے...... ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب سے گزر کر جاسکتے ہیں۔ جیسے دیکھا ہی نہ ہو......''

''ایسا نہیں ہوسکتا......'' جینا بے ساختہ بولی۔ اور پھر یکدم چپ ہوگئی۔

''کیوں نہیں ہوسکتا...... ہم نہ تو دوست ہیں نہ رشتہ دار ہیں کہ ملاقات ہو تو علیک سلیک ضروری ہو؟'' وہ ابھی بھی سنجیدگی مگر شائستگی سے بات کر رہا تھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات بھی تھے جیسے وہ تھپڑ والے واقعہ کو بھولا نہ ہو اور عزتِ نفس ابھی تک مجروح ہو...... لیکن تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان کی طرح ضبط کے دامن کو ہاتھوں سے چھوٹتا نہ دیکھ سکتا ہو۔

''رشتہ صرف خون کا نہیں ہوتا......اور......'' وہ جھجک کر چپ ہوگئی۔

''اور......'' اُس نے سنجیدگی سے سوالیہ انداز میں اُسے دیکھا۔

''ڈرتی ہوں کہتے ہوئے......'' وہ دھیمی آواز میں بولی۔ تو اُس شخص نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ اور محظوظ ہو کر اُسے دیکھا۔

''ہوں تو آپ ڈرتی بھی ہیں...... ہاتھ چلانے سے نہیں ڈرتیں...... زبان چلانے سے ڈرتی ہیں یا پھر یہ بھی آپ کی کوئی چال ہے؟''

''چال......؟'' وہ حیران ہوئی۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں دیکھ کر وہ ساکت ہو گیا کتنی دیر اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا...... وہ نروس ہونے لگی۔

''میری ایک بات مانیں گی......؟'' کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آکر بولا۔

''بلکہ اسے میری وارننگ سمجھیں تو زیادہ اچھا ہے...... آپ کے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں...... آئندہ بلا سوچے سمجھے کسی کو ایسے تھپڑ سے مت نوازیے گا...... ضروری نہیں ہر بندہ میری

طرح شریف ہو...... آپ جیسی لڑکی کو سنگین نتائج بھگتنا پڑ سکتے ہیں......''

''آپ جیسی سے کیا مراد ہے آپ کی؟'' وہ ایکدم انکساری بھول کر تن کر بولی۔

''بتا دوں؟'' اُس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ ابھی تک اُسے گھور رہی تھی۔

''آپ جیسی حسین اور پُرکشش......'' اُس نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا تو وہ ایکدم بلش کر گئی۔ ہینڈسم کے لیے یہ نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ وہ ایکدم نظر چرا گیا۔

''تو آپ نے مجھے معاف کر دیا......'' وہ بچوں کی مانند خوش ہو گئی۔

''کیا ہم آپس میں دوستی کر سکتے ہیں؟'' وہ امید بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ڈونٹ پش اِٹ......''

''او کے...... میرا خیال ہے ون اسٹیپ ایٹ ون ٹائم ہی ٹھیک رہے گا۔''

''دوبارہ ملیں گے کہیں نہ کہیں......'' وہ اٹھ کر مسکراتے ہوئے چلی گئی تو اُس نے حیرت اُس کی پشت کو دیکھا۔

''واہ میرے مولیٰ...... کیا خود اعتمادی ہے......'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زیرِ لب مسکرا دیا تھا۔ تبھی اُس کے دوست کسی بات پر بحث کرتے اندر داخل ہوئے۔

''ہائے ہینڈسم......''

ہیلو ہینڈسم......''

''ہمارے درمیان ایک شرط لگی ہے......'' ایک دوست بولا۔

''میرے خیال میں ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر گاڑی میں بیٹھتے ہم نے جس لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہی ہے جس سے تھپڑ والے دن ملاقات ہوئی تھی۔ بلو جینز اور لانگ بلیک شرٹ والی...... آج اُس نے پاکستانی شرٹ اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ میں کہہ رہا ہوں وہی ہے جبکہ عادل کہہ رہا ہے کہ وہ نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک تو کہہ رہا ہوں...... اُس نے ہائی پونی ٹیل کی ہوئی تھی جو کمر تک آتی تھی اور ابھی جسے دیکھا ہے اُس کے تو اسٹیپ میں کٹے بال ہیں...... اور لباس بھی مختلف......''

''اب تم بتاؤ ہینڈسم...... تمہارا کیا خیال ہے...... کیا یہ وہی لڑکی تھی...... آخر اندر سے ہی باہر گئی ہے...... تم نے تو دیکھا ہوگا۔''

وہ جو 'تھپڑ والے دن' کی فریز پر خفا ہو گیا تھا لاتعلق بن گیا۔

''کون سی لڑکی؟ میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا......'' وہ انتہائی معصومیت سے بولا تو وہ دونوں تپ گئے۔

''یار اتنی بے خبری بھی اچھی نہیں ہوتی...... تم نے ہماری فرائیڈ چکن کی شرط کا ستیاناس کر دیا۔''

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ تو وہ من ہی من میں مسکرایا۔ اور جینا کا چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ وہ بھیگی بھیگی کالی سیاہ آنکھیں...... وہ آنسو روکنے کی کوشش میں ضبط سے گلابی چہرہ...... من کی مسکراہٹ لبوں تک آنے لگی تو ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ دل کو سختی سے سرزنش کی

''بھول گئے اتنی جلدی اُس دن کا تھپڑ؟ تمہیں اپنی عزتِ نفس عزیز نہیں ہے...... خبردار جو جھکنے کی معمولی سی کوشش بھی کی...... مانا وہ حسین ہے۔ تمہارا دل اُسے معاف کر دینے کو بے چین ہے۔ اُس میں کوئی ایسی بات ہے جو شاید تمہارے دل کو چھو رہی ہے۔ لیکن......'' اُس نے نفی میں سر جھٹکا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں...... میرا دل اتنا ارزاں نہیں ہے جو ایک بگڑی ہوئی سر پھری لڑکی کے لیے دھڑکنے لگے جسے تمیز چھو کر نہیں گزری۔ جسے اپنے ٹمپر پر ذرا سا بھی کنٹرول نہیں۔''

''اُسے سبق سکھانا انتہائی ضروری ہے...... اسے سکھانا ہی ہوگا کہ دوسروں کی عزت کا خیال کیسے رکھا جاتا ہے...... خود پر کیسے ضبط کیا جاتا ہے۔ جذبات کو کیسے قابو میں کیا جاتا ہے...... اور شاید...... قدرت نے اِس کام کے لیے مجھے چن لیا ہے۔''

پھر یوں ہوا کہ دونوں ہی باقی سب کچھ بھول کر ایک دوسرے کی سوچوں میں رہنے لگے جینا نے تو خود کو کنٹرول کرنے کی ذرا سی کوشش نہیں کی۔ محبت دودھ کے اُبال کی طرح بڑی سرعت سے اُس کے سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ کسی طوفان کی طرح اُسے اپنے ساتھ بہا لے گئی تھی۔ اس منہ زور طوفان میں وہ خود کو کمزور سے تنکے کی مانند بے بس محسوس کر رہی تھی۔ گھنٹوں بیٹھ کر اُسے سوچنے میں بے پناہ لذت ملتی۔ خود فراموشی کی کیفیت' بڑی پُر کیف تھیں...... وہ اپنا تن من سب کچھ ہار چکی تھی اور اسے اپنا بنانے کا پکا ارادہ کر چکی تھی۔ لیکن ہینڈسم نے اس جذبے سے لڑنے کی بے انتہا کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کامیابی اُس کے نصیب میں نہیں تھی۔

کاش وہ تھپڑ اُن دونوں کے درمیان میں نہ ہوتا تو وہ خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کرتا...... لیکن اُس کی عزتِ نفس سیسہ پلائی دیوار کی مانند رستے میں کھڑی تھی۔ اُس کے خیالوں میں ہر وقت جینا کا بسیرا ہوتا لیکن وہ اُسے سبق سکھانا ضروری سمجھتا تھا۔ اُسے اتنی جلدی ذرا سی بات پر ٹمپر لوز کر دینے والی لڑکی کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزارنی تھی۔

لیکن اُس کے خیالوں میں کھوئے رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اُس کے دل کی گہرائیوں میں پلنے والی سوچوں تک اُس کی رسائی نہیں تھی...... اس لیے وہ مطمئن تھا۔ جہاں جینا کے انگ انگ سے اُس کی محبت ظاہر ہوتی تھی۔ جینا کی آنکھیں بولتی تھیں۔ اُن کہی داستان پوری تفصیل سے بیان کرتی تھیں۔ وہاں ہینڈسم نے اُسے اپنے نوخیز و نوزائیدہ جذبات کی ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔

اُن کی تیسری ملاقات شادی کی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ جہاں دونوں ہی کیل کانٹوں سے لیس ہو کر پہنچے تھے...... دونوں ایک دوسرے کی آمد سے بے خبر تھے۔ ہینڈسم اپنے دوستوں کے ہمراہ ہال کے دور دراز کونے میں رکھی میز کے گرد بیٹھا باتوں میں مصروف تھا...... جب اُس کی نظر ایک جگہ جم کر رہ گئی۔ کم خواب کے بیش قیمت چوڑی دار پاجامے پر شیفون کے خوبصورت ڈھیروں کلیوں والے فراک میں...... ہلکا میک اپ کیے...... بالوں کا خوبصورت اسٹائل بنائے وہ جواد خاقانی کا بازو تھامے نازک اندامی سے چلتی ہوئی اسٹیج کی طرف جا رہی تھی۔

''ڈیڈی...... میں اپنی دوست سے مل آؤں؟'' اُس نے بڑے لاڈ سے جھک کر پوچھا۔ اور جازت ملتے ہی تمکنت سے چلتی ہوئی ہال کے بائیں کونے کی طرف بڑھی۔ اُس کے چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ ہینڈسم کا دل بڑے زور سے سینے میں دھڑکا......

تو وہ مشہور بزنس ٹائیکون جواد خاقانی کی صاحبزادی ہے...... تمام دوست اپنی اپنی مصروفیات کی وجہ سے اِدھر اُدھر ہو چکے تھے......

اس لیے وہ آزادی سے بنا کسی مداخلت کے اُسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے دیکھتا رہا۔
جتنی دیر وہ اپنی دوست سے گفتگو کرتی رہی اُس کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اُس کے چہرے سے نہ ہٹیں...... اور شاید یہ ان نظروں کا طلسم تھا کہ اُس نے بے اختیار گردن موڑ کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔
اُس پر نظر پڑتے ہی اُس کی کالی سیاہ آنکھوں میں پہلے تو حیرت سمیٹی اور پھر چہرے پر گلاب کھل اٹھے۔ جینا کی نظریں کسی معمول کی مانند ٹرانس کی حالت میں اُس کے چہرے پر جمی رہیں۔ اور پھر ان قدموں میں جنبش ہوئی...... وہ دھیرے دھیرے اُس کی طرف بڑھنے لگی۔ ہینڈسم کا دل جیسے شیشے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔
''آپ یہاں؟'' وہ بے پناہ مسرت سے بولی۔
''کیوں؟ میرے یہاں ہونے پر پابندی ہے کیا؟'' وہ بھی دلکشی سے مسکرایا۔ حالات پر اُس کا اختیار نہیں رہا تھا...... اور نہ ہی دل اُس کے قابو میں رہا تھا۔
''نہیں...... بلکہ آپ کی موجودگی عین راحت ہے۔'' وہ شوخی سے بولی۔
''کس کے لیے؟'' وہ بھی شرارت سے بولا۔ دل تمام قیود سے آزاد ہو چکا تھا...... سب مصلحتیں کسی کام کی نہیں رہی تھیں۔
''اب یہ بھی بتانا پڑے گا؟'' وہ مسکراہٹ دبانے کی کوشش میں بولی۔
''ظاہر ہے...... ورنہ مجھے پتہ کیسے چلے گا......'' وہ معصوم انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔
''یہاں اتنے سارے لوگ ہیں...... بے پناہ حسین لڑکیاں اور بھی ہیں۔''
''یعنی آپ مجھے بھی اُن میں شامل کر رہے ہیں؟'' وہ تیکھی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔
''ہم شامل کرنے والے کون ہوتے ہیں؟'' وہ تجاہل عارفانہ سے بولا۔
''سورج کو دیکھ کر کس کو بتانا پڑتا ہے کہ یہ سورج ہے......؟''
''اوہ......'' وہ بے اختیار شرما گئی۔ اور یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ جینا کو کسی سے شرمانا پڑا تھا۔ ورنہ وہ تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔
''کیا غلط کہا میں نے؟'' وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
''آپ کی کوئی بات غلط ہو سکتی ہے بھلا...... میں نے تو آپ کو اپنا گرو مان لیا ہے...... لیکن ایک بات ہے...... کیا آپ کی ڈکشنری میں کسی کو بیٹھنے کی دعوت دینے نام کی کوئی چیز موجود نہیں؟''
''اوہ......'' وہ خجل ہو گیا۔
''سوسوری میڈم......''
''جینا...... میرا نام جینا ہے......'' وہ بیچ میں بات کاٹ کر بولی۔
''بیٹھیے جینا......'' اُس نے کھڑے ہو کر کرسی باہر کی۔
''اصل میں اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے...... آپ کو دیکھ کر سب کچھ فراموش کر بیٹھا...... اپنا ہوش بھی نہیں رہا کہ کہاں ہوں...... یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہال میں اور لوگ بھی ہیں...... کچھ ایسا کمال کیا آپ کی جھلک نے۔'' وہ بے خود ہونے لگا۔
جینا ششدر سی اُسے دیکھنے لگی۔ بیٹھنا یاد نہیں رہا۔
''آ...... آپ مذاق کر رہے ہیں؟'' وہ ایکدم سنجیدہ ہو گئی۔ چہرے پر اذیت کے آثار

تھے۔ جیسے اُس کی بات کا یقین آنا انتہائی غیر معمولی بات ہو۔

''مذاق......'' میں بھلا مذاق کیوں کروں گا......'' وہ حیران تھا۔ جینا کرسی پر عین اُس کے سامنے بیٹھ گئی اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''اِس سے قطع نظر کہ میرے دل میں آپ کی کیا جگہ ہے...... میں نہیں سمجھتی آپ نے اُس تھپڑ کو فراموش کر دیا ہے اس لیے......''

ہینڈسم کو یوں لگا جیسے کسی نے اُسے عرش سے فرش پر پٹخ دیا ہو...... وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا......اوہ کتنی بے رحم تھی حقیقت کی دنیا......

اپنی بات کہتے ہی جینا کو احساس ہو گیا تھا کہ اُس نے غلط موقع پر انتہائی غلط بات کہہ دی ہے...... ہینڈسم کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے نمک چھڑک دیا ہے...... اُس نے بری طرح ہراساں ہو کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ بے تاثر تھا۔

''میرا خیال ہے کچھ بھی ہو جائے...... حالات کیسے بھی ہوں...... یہ تھپڑ ہمیشہ ہمارے درمیان رہے گا...... ہمارے زخموں کو تازہ رکھے گا۔'' وہ انتہائی سنجیدگی اور اذیت کے احساس سے بولا پھر وہ ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلتا ہوں......'' اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہال سے باہر نکل گیا۔ جینا ٹوٹتے دل اور بھیگی کالی سیاہ آنکھوں سے اُسے جاتا دیکھتی رہی...... اُسے خود پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔ کتنی بے وقوف ہوں میں آخر تھپڑ کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

☆......☆......☆

پندار کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔ اُنا کو چوٹ لگی تھی۔ عزتِ نفس مجروح ہوئی تھی۔ لیکن محبت کے سامنے سب چیزیں ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہیں...... وہ لاکھ کوشش کے باوجود جینا کو نظر انداز کرنے یا بھول جانے میں کامیاب نہ ہو سکا...... دل میں ہر وقت اُس کی یاد اور آنکھوں میں اُس کی صورت رہنے لگی۔ وہ محبت کا شکار ہو گیا تھا۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا لیکن وہ سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

کس طرح بچ نکلنے کی...... اٹھتے بیٹھتے...... سوتے جاگتے...... بس اُسی کی صورت آنکھوں میں رہتی۔ اُس سے ہوئی ملاقاتوں...... اُس کی باتوں کو وہ خیالوں میں ہزاروں بار دھرا چکا تھا۔ اُن باتوں کو یاد کر کے لبوں پر مسکراہٹ آ جاتی تھی۔

دونوں کی محبت جس طوفانی انداز سے شروع ہوئی تھی۔ اُسی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جینا کو تو اس محبت کا اقرار کرنے میں رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ اُس کے عشق میں پوری طرح ڈوب چکی تھی۔ وہ چاہتی بھی تو اُس سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ چاہتی ہی نہیں تھی۔ ہر وقت بس اُسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی۔

اُس دن کے بعد اُس کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر وہ کتنی بار اُس ریستوران کے چکر لگا چکی تھی۔ لیکن شاید اُس نے جان بوجھ کر وہاں آنا چھوڑ دیا تھا تاکہ جینا سے سامنا نہ ہو سکے۔ جینا کے دل میں درد کی لہر سی اٹھنے لگی۔ اُسے میری کوئی پرواہ نہیں وہ میری وجہ سے یہاں نہیں آنا چاہتا۔

اور میں اُسے اپنا سب کچھ مان چکی ہوں...... اُس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ فضہ سے اُس کی حالت چھپی نہ رہ سکی تو اُس کے پوچھنے پر جینا کو اقرار کرنا پڑا۔ اُسے سب کچھ بتا دیا۔ دل کھول کر سامنے رکھ دیا۔ یوں

بھی اُسے کسی ایسے راز دان کی ضرورت تھی۔ جس کے سامنے دل کا غبار نکال سکے۔ اپنی محبت کی شدتوں کا اقرار کر سکے، ہینڈسم کی باتیں کر سکے۔ اُس کے بارے میں باتیں کرنا اُسے کتنا اچھا لگتا تھا۔ چہرے پر انوکھی روشنی پھیل جاتی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ چمک آجاتی۔ پہلی بار جینا سے اُس کا نام پوچھا تو جینا کے نام بتانے پر وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئی۔ جینا برا مان گئی۔

''یہ بھی کوئی نام ہے بھلا...... کون سے والدین بھلا اپنی اولاد کا یہ نام رکھیں گے......''

''اُس کا اصلی نام یہ تھوڑی ہوگا......'' جینا کو غصہ آگیا۔ اصل میں وہ اتنا ہینڈسم ہے کہ اُس کے دوست اُسے ہینڈسم کہہ کر بلاتے ہیں۔

''اور اصلی نام کیا ہے اُس کا؟'' فضہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولی۔

''کبھی پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا اُس نے...... وہ تو اُس تھپڑ کی وجہ سے ہر وقت ناراض ناراض سا رہتا ہے...... میری بات کا جواب بھی اچھے طریقے سے نہیں دیتا...... اور ابھی ہم صرف تین بار تو ملے ہیں ویسے بھی مجھے اُس کے اصلی نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... اُسے ہینڈسم کہنا ہی اچھا لگتا ہے...... اور میرا خیال ہے یہ نام بہت بجتا ہے اُس پر۔'' جینا کے لبوں پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی اور فضہ سوچ رہی تھی محبت نے جینا جیسی مغرور اور بدتمیز، ضدی اور بگڑی ہوئی لڑکی کو کیسے بدل دیا ہے۔

اُدھر ہینڈسم کے دوست بھی اُس کی بدلی حالت پر حیران تھے...... کئی سوالات اٹھائے...... کئی طریقوں سے پوچھا لیکن ہینڈسم نے اُن کو اپنے جذبوں کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اپنی عزتِ نفس کے معاملے میں وہ بے حد جذباتی واقع ہوا تھا۔ جذبات کی بے توقیری اُسے گوارا نہیں تھی۔ لیکن اُسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ بھی جینا کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے...... پھر آخر اقرار میں کیا چیز مانع ہے......'' اُس کی پُرسوچ نظریں جانے کس چیز پر جمی تھیں۔

''کیا وہ تھپڑ......''

اُس کا رنگ بے اختیار سرخ ہوگیا...... اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنی بے عزتی وہ کوشش کے باوجود نہیں بھول سکا تھا...... بار بار وہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا...... تو وہ لب بھینچ لیتا...... کاش وہ تھپڑ ہمارے درمیان نہ ہوتا تو...... تو...... لیکن محبت کی شدت اپنی جگہ تھی۔ اُس روز خود سے ہار کر وہ دوبارہ اُسی ریستوران میں جانے کا ارادہ کر بیٹھا...... لاکھ وہ اُس سے ناراض سہی......

لیکن اُسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش پر دل مچ گیا تھا...... ریستوران میں اُس نے ایک ایسی میز کا انتخاب کیا جو دور دراز کونے میں تھی اور وہاں روشنی بھی قدرے کم تھی۔ وہ چاہتا تھا اگر جینا وہاں آئے تو وہ اُسے دیکھ سکے لیکن جینا اُسے نہ دیکھ پائے......

لیکن خدا کی قدرت کہ جینا کی نظر دروازے سے اندر آتے ہی اُسی میز کی طرف اٹھی۔ اُسے دیکھتے ہی جینا کے قدم جیسے وہیں جم گئے۔ کیا وہ اتنی خوش قسمت ہو سکتی ہے کہ اُسے اپنے دل کی خوشی سے وابستہ اُس ہستی کا دیدار ہو جائے...... جس کے علاوہ پچھلے کئی ہفتے اُس نے کچھ اور نہیں سوچا تھا۔

وہ خود بھی اُسے دیکھ کر پتھر کا بت بن گیا۔ نظریں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔ اور ہٹانے کی قوت وہ خود میں نہیں پاتا تھا...... ایک نظر میں ہی

اُس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ قدرے کمزور اور پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے اتنی دور سے بھی محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بے خواب راتوں کے غماز تھے۔

''کیا یہ بے خواب راتیں اُس کی وجہ سے تھیں؟''

''کیا اس کمزوری اور بے قراری کی گناہ گار اُس کی اپنی شخصیت تھی؟''

دونوں کی نظروں نے ایک دوسرے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا...... ایک طلسم تھا جو ٹوٹنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا...... ایسے لگتا تھا وہ دونوں اسی طرح اپنی بے قراریوں کی داستان ایک دوسرے کو سنا دیں گے کہ اپنے ساتھ سے گزرنے والے کسی شخص سے ٹکر کھانے پر وہ سنبھلی...... حقیقت کی دنیا میں آ گئی پھر اُس کے قدم جیسے کسی برقی رو کی زد میں آ گئے۔

وہ تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اُدھر ہی آ رہی تھی۔ رستے میں مختلف میزوں پر بیٹھے لوگوں کا اُسے کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ کسی تندخوندی کے پانی کی طرح اپنا رستہ بناتے ہوئے اُس میز تک پہنچی۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھی...... اور میز پر رکھے اُس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ بھیگی آنکھوں سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ آنسو روانی سے اُس کے گالوں پر بہنے لگے تو اُس نے بے اختیار ہو کر اپنا چہرہ اُن ہاتھوں پر رکھ دیا۔ آنسو ہینڈسم کے ہاتھ بھگونے لگے۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر ضبط کر رہا تھا۔ ورنہ اُس کا دل چاہ رہا تھا اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے بتائے کہ اُس کا بھی یہی حال ہے...... وہ بھی اُس کی محبت کے آگے ہار گیا ہے...... اُس کی آنکھوں میں گم ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے...... لیکن یہ ریستوران تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس حالت میں سب کی نظروں میں آ جائیں...... تماشہ بن جائیں......

یہ نہیں تھا کہ وہ بزدل تھا...... لیکن وہ ہر حالت میں خود پر کنٹرول رکھنے کا قائل تھا اور ہمیشہ ہی ایسا کرتا آیا تھا...... اپنا ٹمپر لوز کر دینا یا شتر بے مہار کی طرح بے قابو ہو جانا اُسے پسند نہیں تھا۔ اُسے اپنے کنٹرول پر فخر تھا...... اپنے ضبط پر ناز تھا۔

''جینا......'' اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''پلیز خود پر کنٹرول کرو...... کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟''

''آئی ڈونٹ کیئر......'' وہ چہرہ اٹھا کر آہستہ سے بولی۔

''آپ...... آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔'' اُس کے بھیگے چہرے کی تجلیوں سے مبہوت ہو کر اُسے دیکھتا رہ گیا۔ آنسوؤں اور محبت کے درد نے اِس کے چہرے کو بے انتہا خوبصورت بنا دیا تھا...... انوکھا سوز عطا کیا تھا۔

''بتائیں نا...... آپ کیوں میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں؟'' اُس کی بھیگی آنکھیں حشر برپا کر رہی تھیں۔

''کیا کر رہا ہوں......'' وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

''مجھے اگنور کر رہے ہیں...... مجھ سے چھپتے پھر رہے ہیں؟'' وہ صاف گوئی سے اصل بات پر آ گئی۔ ہینڈسم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اِس کے دلبر باوجود کی طرف دیکھا۔

''ڈرتا ہوں......''

''کس بات سے؟'' وہ بے قراری سے

بولی۔
''کہیں تمہارے سحر میں جکڑا نہ جاؤں......''
''کیا اتنی بری بات ہے یہ...... جو آپ بچتے پھر رہے ہیں؟'' اُس نے ناراضگی سے شکوہ کیا۔
'' اچھی یا بری...... اب تو ہو ہونا تھا ہو چکا......'' وہ مصنوعی مایوسی سے بولا۔
وہ بے ہوش ہونے کو تھی...... پوری آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔
''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' اُس نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔
''خود پر یقین نہیں ہے؟'' اُس نے جینا کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر ہلکے سے دبایا اور پھر چھوڑا ابھی نہیں...... جینا کبھی اُس کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کو دیکھتی اور کبھی اُس کے چہرے کی طرف...... جہاں محبت کی تحریر بڑے واضح الفاظ میں رقم تھی۔
''آپ...... آپ نے میری محبت کو قبول کیا...... میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی......'' اُس کی آنکھیں دوبارہ چھلک گئیں۔
''نہ...... نہ......'' وہ جلدی سے بولا۔
''اب ان قیمتی موتیوں کو یوں نہ لٹاؤ...... میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔''
''اوہ......'' اس کے چہرے پر گلاب کھل اٹھے......
''آپ ان موتیوں کو اپنے حضور میری طرف سے حقیر سا نذرانہ سمجھ لیں۔''
''حقیر...... میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ ہیروں کو پتھر سمجھ لوں...... یہ میرے لیے دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہیں...... آئندہ خیال رکھنا۔''
''اوکے باس......'' اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے سیلوٹ کیا...... وہ کس قدر خوش تھی اُس کا اندازہ اُس کی بے پناہ خوشی سے ہو رہا تھا۔ اور وہ اُسے خوش دیکھ کر اُس پر نثار ہو جانا چاہتا تھا۔ ایسے میں کھانے پینے کا ہوش کسے تھا...... وہ شام دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے...... بیرا ڈرنک رکھ گیا...... لیکن جوں کی توں ایک دوسرے میں کھوئے رہے...... آخر ہینڈسم ہی بولا۔
''میں کل چھ ماہ کے لیے ابروڈ جا رہا ہوں...... ایک کورس بھی کرنا ہے...... اور پھر اپنے کزنز اور دوستوں کے ساتھ سیر و سیاحت بھی......'' وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا...... اُسے احساس تھا کہ یہ خبر اُسے شاک کرے گی۔ اُسے بے پناہ غصہ آئے گا اور یہی ہوا...... وہ ششدر سی اُسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر غصے سے بولی۔
''اور اگر میں آج اِدھر نہ آتی تو آپ مجھے بتائے بغیر ہی جانے والے تھے؟''
'' سوچا تو یہی تھا......'' وہ افسردگی سے مسکرایا۔
''اس طرح میں بھی بچ جاتا قید ہونے سے اور تم بھی بچ جاتیں مجھ جیسے آدمی سے......''
''مطلب......؟'' وہ چمک کر بولی۔
''آپ یہ سب گوارا کر لیتے......''
''تمہارا کیا خیال ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
''آج میں یہاں اس دور دراز ٹیبل پر بیٹھا کس کا منتظر تھا۔ کیا اس لیے بیٹھا تھا؟''
'' منتظر تھے...... اور اگر آج میں نہ آتی تو......'' اُس کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
ایسا نہیں ہو سکتا تھا...... میرے جذبوں میں اتنی کشش تو تھی کہ تم کچے دھاگوں سے بندھی چلی آئیں۔'' وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرایا۔
''آپ خود کو انڈر ایسٹیمیٹ نہ کریں۔ آپ

کی کشش کے دھاگے اتنے کچے نہیں ہیں...... فولاد سے بھی زیادہ مضبوط ہیں...... بس آپ نے کبھی آزمایا ہی نہیں۔'' وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔

''آزماؤں گا...... کسی دن ضرور آزماؤں گا......'' وہ اُس کے جانے کے خیال سے اُداس ہوگئی دل بیٹھا جارہا تھا کچھ بھی نہ بولی۔

''ایک درخواست ہے......''

''آپ درخواست نہیں دیجیے حکم کیجیے......'' وہ شوخی سے بولی۔

''میں ایسی جرأت نہیں کرسکتا...... بارگاہ حسن میں درخواست ہی دی جاتی ہے...... حکم کی گنجائش کہاں......'' وہ بھی شرارتی انداز میں بولا۔

''حسن خود ہی آپ کو یہ حق دے رہا ہے۔'' وہ مزید شوخ ہوئی۔

''میں نے اپنے ایک دوست کے گھر کینڈل لائٹ ڈنر کا انتظام کرنا ہے۔ اگر تم آنے کا اقرار کرو تو......''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے...... وائلڈ ہارسز بھی مجھے کل آنے سے نہیں روک سکتے...... آپ ایڈریس بتائیں۔'' ہینڈسم نے ایڈریس بتایا تو اُسے صحیح معنوں میں ہٹ ہوا کہ وہ اُس سے دور جارہا ہے۔

''ویسے بہت ظالم ہیں آپ......'' اُس نے شکایتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

''آج ہی مجھے زندگی کی نوید سنائی اور آج ہی جدائی کا پروانہ ہاتھ میں تھما رہے ہیں...... مجھ پر بالکل ترس نہیں آیا آپ کو؟''

''ابھی تو مجھے خود ترس آرہا ہے...... تم سے دور اتنا عرصہ کیسے رہ پاؤں گا؟'' وہ بھی اُداس ہوا اتنے خوبصورت اقرار پر وہ سرشار ہوگئی۔ محبت پاش نظروں سے اُس کی طرف دیکھا وہ تو اُس کے چہرے بھی کھلتے گلابوں اور دوری کی وجہ سے زرد چنبیلیوں کی دھوپ چھاؤں میں کھویا ہوا تھا۔

''مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے...... کچھ آرڈر کریں۔'' جینا نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ہاں...... میرے لیے بھی تم اپنی پسند سے آرڈر کردو......''

کھانے کے بعد دونوں کل پانچ بجے ملنے کے وعدے پر جدا ہوئے۔ جینا کو زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی وہ سرشاری گھر پہنچی...... ڈیڈی لاؤنج میں ہی ٹہل رہے تھے۔

''اتنی دیر کہاں لگادی...... میں اتنا انتظار کررہا تھا۔''

''خیریت......'' وہ ٹھٹکی۔ جواد اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔

''تم میرے دوست جہانگیر کو تو جانتی ہو...... اُس کا بیٹا عالی آج کل ایک کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان آیا ہوا ہے...... اُسے زیادہ دن کراچی میں ہی لگ گئے۔ اس لیے اُس کے پاس وقت بہت ہی کم ہے...... وہ کل ہی اسلام آباد پہنچ رہا ہے...... اور اُس روز کی فلائٹ سے واپس امریکہ جارہا ہے...... دونوں فلائٹس کے درمیان صرف دو تین گھنٹے ہیں...... اس لیے گھر نہیں آسکتا...... تم ایسا کرو کل چھ بجے اُسے ایئرپورٹ کے قریبی ریسٹوران میں ملاقات کرلو...... میں چاہتا ہوں تم کم از کم ایک دوسرے کو دیکھ تو لو......''

''کیوں ڈیڈی؟ ایسی بھی کیا ایمرجنسی ہے......'' وہ کنفیوز لہجے میں بولی۔

''بیٹا میں چاہتا ہوں...... ہماری دوستی مستقبل میں رشتہ داری میں بدل جائے...... آف کورس

تمہاری مرضی شامل ہوگی اس میں...... لیکن مجھے مکمل یقین ہے کہ تم عالی جیسے پختہ کردار کے انسان کو ضرور پسند کرو گی۔ وہ امریکہ میں بہت اچھا اور قابل ڈاکٹر ہے...... ماں باپ نے بہت اچھی پرورش کی ہے اور مجھے اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے ایسے ہی نوجوان کی ضرورت ہے...... تم سمجھ گئی ہونا؟''

''لیکن ڈیڈی......'' اُس کا دل بیٹھ گیا......

''کل تو میری بہت اہم اپائنٹمنٹ ہے جو میں کسی صورت کینسل نہیں کر سکتی......'' وہ بھرپور احتجاجی انداز میں بولی۔

''ویل...... تمہیں ہر صورت وہ کینسل کرنی پڑے گی ڈارلنگ......'' جواد نے اُسے پیار سے اپنے ساتھ لگایا۔

''تمہاری ملاقات اس ملاقات سے اہم کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ تمہیں عالی سے ہر قیمت پر ملنا ہے۔ یہ تمہارے مستقبل کا سوال ہے...... کل چھ بجے ریستوران پہنچ جانا...... عالی تمہارا منتظر ہوگا۔''

جواد عجلت میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ انہیں ایک بہت ضروری میٹنگ کے لیے تیار ہونا تھا...... جینا گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔ ڈیڈی اپنا آرڈر سنا کر چلے گئے۔ یہ تو طے تھا کہ اُسے عالی سے ملنے نہیں جانا تھا۔ اُسے ہر حالت اور ہر قیمت پر کل ہینڈسم سے ملنا تھا۔ کتنے مہینوں کی ریاضتوں اور بے خواب راتوں کا ثمر ملا تھا اور پھر وہ چھ ماہ کے لیے جا بھی رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تقدیر کی ستم ظریفی ہی تو تھی کہ ابھی آج اُس نے محبت کا اقرار کیا تھا اور کل ہی لمبے عرصے کے لیے جا رہا تھا۔

''چھ ماہ...... اوہ پورے چھ ماہ وہ اُسے نہیں دیکھے گی۔ چھ ماہ یہ آنکھیں اُس کے دیدار کو ترسیں گی۔

''اوہ خدایا...... اُس دوسرے معاملے کا کیا کیا جائے۔ یہ عالی جانے کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑا۔ اُسے بھی ضرور کل ہی آنا تھا۔ اور وقت بھی لگ بھگ وہی تھا۔ اُسے ہر حالت میں اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا تھا۔ اُس نے فضہ کا فون ملایا اور اُسے اپنا مسئلہ بتایا۔ فضہ کچھ دیر سوچتی رہی۔

''کیا عالی نے تمہیں دیکھا ہوا ہے؟''

''نہیں تو...... بس ڈیڈی نے اُسے بتا دیا ہے کہ میں کس قسم کا اور کون سے رنگ کا لباس پہن کر آؤں گی۔''

''تو سمجھو تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔''

''کیسے؟''

''تم اپنی جگہ کسی اور کو بھیج دو...... اپنا مذکورہ لباس اُسے پہنا دو...... عالی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور نہ ہی انکل جان پائیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن کون جائے گا میری جگہ...... تم تو جا نہیں سکتیں...... تمہارا قد مجھ سے کافی چھوٹا ہے...... اور پھر برگر کھا کھا کر تم نے اپنا وزن اتنا بڑھا لیا ہے میرا لباس تمہیں تو پورا نہیں آ سکتا۔''

''ہے ایک لڑکی میری نظر میں......'' فضہ کھنکتی آواز میں بولی۔

''کون......؟''

''زارا......''

''زارا؟ وہ نواب زادی......؟'' جینا چیخی۔

''ہاں...... اُس کی ہائٹ بھی تمہارے مطابق ہے۔ تمہاری طرح دبلی اور متناسب جسم کی مالک ہے...... تمہارا ڈریس اُسے پرفیکٹلی فٹ آئے گا۔ یوں بھی وہ ڈرامہ سوسائٹی کی چیئر پرسن ہے......

بہترین اداکارہ کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہے۔ ذہین بھی ہے عالی کو اعتماد سے ہینڈل کر سکتی ہے۔ عالی کو ذرا سا شک بھی نہیں ہوگا۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے..... لیکن وہ کبھی نہیں مانے گی۔'' جینا کو یقین تھا۔

''کیوں نہیں مانے گی۔''

''تم جانتی ہو اُس کی فیملی کو..... اُن کے نظریات کو..... خاندانی لوگ ہیں۔ کبھی اجازت نہیں ملے گی اُسے کسی اجنبی مرد سے ریستوران میں ملنے کی.....'' جینا مایوسی سے بولی۔

''تو تمہاری صلاحیتیں کب کام آئیں گی؟ اپنی پاورز..... اپنا چارم استعمال کرو۔ اپنی محبت کا واسطہ دو..... تھوڑی بہت منتیں کرو..... آئی تھنک ہینڈسم سے ملنے کے لیے تم اتنا تو کر ہی سکتی ہو..... اُسے کوئی پُرکشش آفر کرو..... یا اپنی مظلومیت اپنی محبت کی داستان ایسے رنگ میں پیش کرو کہ اُسے رحم آ جائے تم پر..... یو نو Beauty In Distress ہمیشہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔''

زارا کو اس کام کے لیے راضی کرنا کسی پُرخطر پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے کے مترادف تھا۔ فون پر تقریباً دو گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ اپنی نو خیز محبت کے واسطے دینے پڑے۔ اپنی ڈرامائی صلاحیتوں کو آزمانے کا لالچ دینا پڑا..... ایک مصیبت میں پڑی دوست کی مدد کرنے کی درخواست دینی پڑی۔

زارا کے لیے اُس کی بات ماننا انتہائی مشکل تھا۔ بابا جانی اور امی جان سے جھوٹ بولنا..... اُن کی آنکھوں میں دھول جھونکنا..... اور سب سے بڑھ کر کسی اجنبی مرد سے رات کے اندھیرے میں ملنا..... یہ الگ بات تھی کہ ریستوران بے پناہ روشن تھا۔ پُر رونق تھا۔ کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔

لیکن بابا جانی اور امی جان کو بے خبر رکھنا اُس کی فطرت کے خلاف تھا۔

لیکن جینا نے اتنی منتیں کیں..... اپنے مقصد کے لیے اپنے پیار کے لیے اتنی التجائیں کیں کہ وہ اُسے نظر انداز نہ کر سکی۔ پھر جینا کی دس ہزار کی آفر.....''

اگلے روز جینا نے بذاتِ خود زارا کی امی جان کو فون کر کے اُسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ منت سماجت کی..... امی جان بمشکل راضی ہوئیں۔ زارا کو صرف ایک ڈیڑھ گھنٹہ قیام کرنا تھا..... زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔

جینا نے بذاتِ خود اُسے اپنا لباس پہن کر تیار کروایا..... دونوں ایک ہی گاڑی میں گھر سے نکلیں۔ جینا رستے میں اتر گئی۔ جہاں ہینڈسم اُس کا منتظر تھا۔ اور زارا ڈرائیور کے ساتھ آگے روانہ ہوگئی۔ سارا رستہ وہ بے چین اور مضطرب رہی..... وہ سیدھی سادھی اصولوں پر قائم رہنے والی لڑکی کبھی اس قسم کی سچویشن میں ملوث نہیں ہوئی تھی۔

لیکن آج خود ہی اپنے اصول توڑنے پر خود سے شرمندہ تھی۔ بابا جانی اور امی جان سے شرمندہ تھی۔ لیکن جینا کی خاطر مجبور ہوگئی تھی۔ اور پھر اس میں واحد تسلی بخش بات وہ دس ہزار روپے تھے۔ اب شاید وہ شہری کے لیے وہ بائیک خرید سکے جس کی وہ اتنی خواہش رکھتا تھا۔

جینا آج پورے دل سے تیار ہوئی تھی۔ اپنا خوبصورت ترین سوٹ پہنا تھا..... اور چہرے پر محبوب سے ملنے کی خوشی کچھ اپنی الگ سی دلکشی پیدا کر رہی تھی۔ ہینڈسم نے اُسے دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ کتنی دیر اُس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ جینا کے چہرے پر اُس کے اس طرح

دیکھنے سے شفق کی لالی بکھری جارہی تھی۔ محبت نے کیسے اُسے یکسر بدل ڈالا تھا۔ ہینڈسم نے ایک گلستان کے سامنے گاڑی روک لی یہ وہی جگہ تھی جہاں گلاب اور یاسمین کے پھول موسم بہار میں اپنی بہار دکھایا کرتے تھے۔ لیکن آج سب زرد تھا۔

''تھوڑی دیر کے لیے باغ میں بیٹھے ہیں، پھر ڈنر پر چلیں گے۔''

''جو مرضی حضور کی۔'' وہ شوخی سے مسکرائی۔

دونوں ایک پتھر کے بینچ پر بیٹھ گئے۔ ہینڈسم نے جینا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک برقی رو تھی جو جینا کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اُس نے بے اختیار ہینڈسم کی طرف دیکھا۔ اور پھر جیسے نظریں ہٹانا بھول گئی۔ یہ وہ طلسماتی جذباتی لمحے تھے جن کے لیے جینا ترستی رہی تھی۔ لیکن اج ہی اُس کے چلے جانے کا خیال تیر کی طرح دل میں لگا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ہینڈسم بے قرار ہوگیا۔

''کیوں...... کیا ہوا...... ان خوبصورت آنکھوں میں آنسو...... میرے صبر کا امتحان لے رہی ہو؟'' ہینڈسم کا دل درد سے لبریز ہوگیا۔ جینا سے جدائی کا خیال اُسے بھی اُداس کررہا تھا۔ لیکن وہ آخری لمحوں میں اُس کے ہنستے ہوئے چہرے کا تصور ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔ جینا کے آنسوؤں میں اور بھی تیزی آ گئی۔ ہینڈسم نے بے قرار ہوکر اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا...... اور اُس کے آنسو اپنی ہتھیلیوں پر روک لیے۔

''پلیز جینا...... مجھے تمہارے رونے سے بہت تکلیف ہورہی ہے۔ میں ہمیشہ تمہیں مسکراتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور اسی حسین مسکراہٹ کا تصور ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ ورنہ وہاں ہمیشہ مضطرب رہوں گا۔ پلیز ہنس دو...... میری خاطر۔'' اُس نے التجائیہ انداز میں جینا کی طرف دیکھا تو وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ دھوپ چھاؤں کے اس حسین امتزاج پر ہینڈسم کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حسن کی شان میں کوئی گستاخی کر بیٹھتا۔ اُس نے جینا کا چہرہ چھوڑ دیا۔ اور ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ گھوم کر چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ وہ اصول پرست انسان تھا۔ اور اپنے اصول اُسے بے حد عزیز تھے۔ شادی سے پہلے وہ کسی قسم کی گستاخی کا قائل نہ تھا۔ جینا پریشان ہوکر کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا...... ناراض ہوگئے۔'' وہ بے چین ہوگئی۔

''نہیں تو......'' وہ مسکرایا۔

''پھر کوئی بات کریں نا...... پھر جانے کب موقع ملے...... اتنے لمبے عرصے کے لیے جارہے ہیں۔ اور آپ کو پتہ ہے میں کتنی مشکل سے آئی ہوں آج۔''

''کیوں؟ میرا خیال تھا تم پر اس قسم کی پابندیاں نہیں ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن آج ایک خاص بات تھی......'' جینا یاد کرتے ہوئے مسکرائی اور پھر آہستہ آہستہ قصہ اُسے کہہ سنایا۔ ہینڈسم سب سن کر دم بخود رہ گیا یہ تو اُس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ جینا کا کوئی اور امیدوار بھی ہوسکتا ہے۔ وہ پریشان گم صم سا بیٹھا تھا۔

وہ چھ ماہ کے لیے جارہا تھا۔ پورے چھ ماہ...... اور اگر اُس کی غیر موجودگی میں جینا کے ڈیڈی نے جینا کے بارے میں کوئی اور فیصلہ کردیا۔ اُس کی شادی کسی اور سے کردی تو؟ وہ

بے پناہ فکر مند ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے اُس کی سانسیں رُکنے لگی ہوں...... اُسے جانے سے پہلے جینا کو اپنے نام کر کے جانا چاہیے تھا۔ تا کہ بعد میں کوئی خطرہ نہ رہے...... لیکن اب تو کوئی وقت نہیں تھا دس گھنٹوں کے بعد اُس کی فلائٹ تھی۔ وقت پر پہنچنا ضروری تھا...... ورنہ کورس کے شرکاء سے اُس کا نام کاٹ دیا تھا۔ محبت کرنے والے بھی عجیب ہوتے ہیں...... ایک چھوٹی سی بات دل میں ہزاروں خدشات کو جنم دیتی ہے اور پھر یہ سلسلہ رُکتا نہیں آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے...... جینا کو کھو دینے کا خوف اُس کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ جینا حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟ اتنے ٹینس کیوں ہو رہے ہیں؟''

ہینڈسم نے بے اختیار اُسے کندھوں سے مضبوطی سے تھام لیا۔

''اگر میرے بعد تمہارے ڈیڈی نے تمہیں کسی اور کے نام کر دیا تو......'' وہ سختی سے بولا۔

'' فکر نہ کریں......'' اُس کے خدشات پر مسرور وہ مسکرائی۔

''جینا اتنی کمزور نہیں ہے کہ کوئی زبردستی اُس کے ساتھ کچھ بھی کر سکے۔ اور پھر ڈیڈی تو بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے...... وہ میری خواہش کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔''

لیکن ہینڈسم کے اضطراب میں کمی نہیں آئی۔

''میں نے محبت کرنے والے والدین کو عزت کے نام پر اولاد کو شادی پر مجبور کرتے ہوئے کئی بار دیکھا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ایسے وقتوں میں جب وہ اپنی خواہش اپنی اولاد پر مسلط کرنا چاہتے ہیں تو اُن کی محبت دور کہیں سو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میں برداشت نہیں کر سکوں گا......'' ہینڈسم کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جینا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

اُس کے لیے اُس کے جذبات میں کتنی شدت تھی۔ یہ بات جہاں اُسے غرور عطا کر رہی تھیں وہیں ہینڈسم کی حالت پر تشویش بھی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا...... آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟''

''ایسا ہو سکتا ہے......'' ہینڈسم زور دے کر بولا۔

''اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' جینا دم بخود اُسے دیکھ رہی تھی۔ کتنی دیر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے...... صاف ظاہر تھا کہ ہینڈسم تذبذب کا شکار تھا۔ اُس نے جینا کو کندھوں سے پکڑ کر بینچ پر بٹھا دیا۔ خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور بے حد سنجیدگی سے بولا۔

''تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی ہو نا؟'' اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے...... یقیناً......'' وہ حیران حیران اُسے دیکھ رہی تھی۔

''کتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟''

''میرے پاس کوئی آلہ نہیں ناپنے کے لیے......'' جینا اذیت زدہ لہجے میں بولی۔

''لیکن......''

''لیکن کیا؟'' وہ نرم لہجے میں بولا۔

''میں آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں...... کچھ بھی......'' وہ پورے یقین کے ساتھ بولی۔

''کچھ بھی......؟''

''ہاں کچھ بھی......'' وہ بے پناہ سنجیدہ تھی۔

''پھر سوچ لو......''

''سوچنے کی گنجائش نہیں ہے...... میں نے کہا نا میں آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں...... آپ ابھی اسی وقت آزما سکتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں

چٹانوں کی مضبوطی تھی۔

''کیا تم ابھی اسی وقت مجھ سے شادی کرسکتی ہو؟''

جینا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... وہ حیرت سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''تو وہ دعوے غلط تھے۔'' وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔

''نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے...... لیکن ایسی کون سی ایمرجنسی آپڑی ہے۔''

''میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا...... اور میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ میرے جانے کے بعد کچھ نہ کچھ ہوجائے گا...... میں رُک بھی نہیں سکتا...... ورنہ اپنے بابا کو تمہارے گھر ضرور بھیجتا...... میرے پاس وقت بہت کم ہے...... اس لیے ابھی جواب چاہیے۔ کیا تم ابھی مجھ سے شادی کرسکتی ہو۔''

''ہاں...... لیکن اتنی جلدی کیا ہے؟''

''یعنی تمہیں اعتراض ہے۔'' وہ چپ ہوگیا۔

''نہیں...... میں تیار ہوں......'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''اور تمہارے ڈیڈی...... اُن کا کوئی خیال نہیں تمہیں؟''

''مجھے آپ کی سمجھ نہیں آرہی......؟'' جینا کنفیوز ہوگئی۔

''آخر آپ چاہتے کیا ہے؟''

''میں ابھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... اپنے اصولوں کے خلاف پہلی بار کچھ کررہا ہوں...... اپنے بابا کی اجازت کے بغیر...... تمہارے ڈیڈی سے بات کیے بغیر...... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... کیونکہ میرے پاس وقت نہیں ہے اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا...... میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ اگر میں یونہی چلا گیا تو تمہیں کھودوں گا...... لیکن کیا تمہارے ڈیڈی......''

''آپ میرے ڈیڈی کی فکر نہ کریں...... وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں...... میرا مسئلہ سنیں گے...... تو مجھے معاف کردیں گے...... اور پھر صرف چھ ماہ کی تو بات ہے...... واپس آکر آپ اپنے بابا کو لے کر ہمارے گھر آجانا...... کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا......'' اس وقت اُسے صرف ایک خیال تھا کہ کسی طرح ہینڈسم کے بے قرار دل کو قرار نصیب ہوجائے۔ اتنی محبت کرتی تھی وہ اُس سے کہ اُسے ذرا سا غم زدہ اور پریشان دیکھنا اُس کی برداشت سے باہر تھا۔

کورٹ میرج کے بعد وہ ہلکا پھلکا ہوگیا۔ بات بات پر مسکرارہا تھا۔ سکون اور اطمینان اُس کی ہر حرکت سے ظاہر ہورہا تھا...... اور وہ اُس کی خوشی میں خوش تھی۔ اُس کے روشن پُرسکون چہرے سے اُس کے دل میں ہزاروں دیے ایک ساتھ جل اٹھے تھے۔ کورٹ سے سیدھے وہ اُس دوست کے گھر آگئے جہاں اُس نے جینا کے لیے کینڈل لائٹ ڈنر کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ دونوں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے' موم بتی کی روشنیاں دونوں کے چہروں کو بے حد خوبصورت احساس دے رہی تھیں۔ ہینڈسم نے محبت سے چھلکتی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور اُس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا۔

''مان گئے تمہاری محبت کو...... تم واقعی میرے لیے زندگی کا سب سے نایاب تحفہ ہو...... کوئی شک نہیں کرسکتا تمہاری محبت پر...... میرا نام نہیں جانتی...... میرے خاندان کا پتہ نہیں اور میری محبت میں اتنا بڑا قدم اٹھالیا...... مجھے ناز ہے تم

پر...... لیکن پتہ ہے قربانی میں نے بھی دی ہے...... اپنے اصولوں کی قربانی...... بابا کو بتائے بغیر اُن کی اجازت لیے بغیر...... اپنے گھر والوں کو اپنی اتنی بڑی خوشی میں شریک کیے بغیر شادی کر بیٹھا۔

میں نے اس بات کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا...... لیکن تمہیں کھونے کے خوف نے میرے اصولوں کی دھجیاں بکھیر دیں۔''

''لیکن ایک احساس تو ہے نا کہ تم اب میری ہو...... صرف میری...... تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا...... میرے چھ ماہ وہاں خوف کی حالت میں نہیں گزریں گے۔ چھ ماہ بعد میں اپنے بابا کو لے کر آؤں گا اور دھوم دھام سے شان و شوکت سے ہماری رخصتی ہوگی۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' وہ آخر میں دھیمی آواز میں بولا۔ شاید دل میں انجانی سی خلش تھی اپنے اصولوں سے انحراف کی خلش...... لیکن اُس نے اس خلش کو اپنی خوشی پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ جینا نے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اس معمولی خلش کی بھنک بھی پڑے۔

دونوں سرشار تھے۔ دونوں کسی خوبصورت طلسم کا شکار تھا۔ دونوں کی نظریں بول رہی تھیں۔ ساری گفتگو کر رہی تھیں۔ کھانا برائے نام ہی کھایا گیا۔ دونوں تنہائی اور ایک دوسرے کی حسین موجودگی کو انجوائے کرتے رہے۔ یہ احساس کسی قیمتی انعام سے کم نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ہوگئے ہیں۔ انہوں نے جو چاہا وہ پالیا۔ یہاں تک کہ جانے کا وقت آ گیا۔

''میں وہاں جا کر انٹرنیشنل موبائل لوں گا۔ اور تمہیں کال کروں گا...... ہم روزانہ ڈھیروں باتیں کیا کریں گے۔ حالِ دل سنایا کریں گے۔ تم میرے سپنے دیکھنا اور میں تمہارے سپنے دیکھوں گا۔ یہاں تک کہ چھ ماہ گزر جائیں گے اور میں واپس آ کر تمہیں رخصت کروا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔''

جینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو ہینڈسم بے قرار ہو گیا۔

''نہیں رونا نہیں...... پلیز...... میں جاتے ہوئے تمہاری مسکراہٹ ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔''

''میں بھی کچھ یاد رکھنا چاہتی ہوں...... ایک خواہش ہر میری......''

''تمہاری خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے......'' اُس نے ہتھیلیوں سے اُس کے آنسو صاف کیے۔

''میں ایک بار آپ کے سینے سے لگنا چاہتی ہوں...... آپ کے بازوؤں کے لمس کا احساس اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں......'' وہ روتے روتے اُس کے سینے سے لگ گئی۔ ہینڈسم کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اُس کے بازو بے اختیار اُس کے گرد سمٹ گئے۔ لمحوں میں ہی وہ برقی رو کے زیر اثر آ گئے۔

اصول...... قانون اور کنٹرول سب جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ اور جب وہ نازک وقت گزرا تو جینا سرشار تھی جبکہ ہینڈسم اُس کی طرف دیکھے بغیر ہی فوراً وہاں سے نکل گیا۔ جیسے اگر وہ کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہا تو خود کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اُس نے اپنا کنٹرول کھو دیا تھا۔ حالات کے دھارے کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اپنے فخر اور غرور کو تار تار کر دیا تھا۔ اور یہ اُس کے لیے کسی طرح بھی قابل معافی نہیں تھا۔

زندگی میں دوسری بار اُس نے اپنے اصول

توڑے تھے اور یہ دونوں اصول توڑنے والے واقعات ایک ہی دن میں چند گھنٹوں کے اندر اندر رونپذیر ہوئے تھے۔

جینا کے پلان میں بھی یہ سب شامل نہیں تھا۔ آج شام جب وہ گھر سے نکلی تھی تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ واپس آئے گی تو اُس کی حیثیت بدل چکی ہوگی اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ہینڈسم اُسے شادی کی پیشکش کردے گا۔ وہ بھی اُسی دن اور اُسی وقت' اُسے علم تھا کہ عالی کے واقعے اور پھر چھ ماہ منظر سے غائب رہنے نے اُسے ایک لحاظ سے خوفزدہ کردیا تھا۔ اُسے جینا کو کھودینے کا خوف تھا۔

شاید یہ اس لیے تھا کہ ایک تو وہ جینا کو اپنے وجود کی پوری شدت سے محبت کرنے لگا تھا اور دوسرے وہ اُسے جانتا نہیں تھا۔ وہ جینا کی شخصیت کے اس پہلو سے ناآشنا تھا کہ وہ کسی قیمت پر اپنے ساتھ زبردستی نہیں ہونے دے گی۔ ورنہ شاید وہ اپنے کردار اور اپنے اصولوں کے مطابق اس قدر جلد بازی نہ کرتا۔ لیکن اُسے کھونے کا خوف تو جینا کو بھی تھا۔ تبھی تو اُس نے اس پیشکش کو غنیمت جانا اور فوراً اقرار کرلیا۔ لمحے بھر کو ڈیڈی کا خیال آیا۔ لیکن اس نے اپنے فائدے اور مقصد کی خاطر فوراً جھٹک دیا۔

ڈیڈی کو منانا اُس کے لیے مشکل کام نہیں تھا اور ممی کی مرضی' غصے یا شاک کی اُسے پرواہ نہ تھی۔ ہینڈسم بھی باوجود عجلت کے تھوڑا حیران اور متذبذب تھا۔

''تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا...... کہ میں اصل میں کون ہوں...... میرا نام کیا ہے اصل میں...... میری مالی حیثیت...... میرا خاندان...... میری ذات پات......''

''نہیں......'' وہ مضبوط انداز میں بولی تھی۔ ''مجھے صرف اس وقت اس شخص کا فرق پڑتا ہے یہ بہ قائم ہوش و حواس میرے سامنے کھڑا ہے...... مجھے صرف آپ سے دلچسپی ہے۔ آپ سے محبت ہے...... آپ ہی میری زندگی ہیں...... اور آپ کے ساتھ میرا مرنا جینا ہے...... آپ کچھ بھی ہیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑا...... محبت ان سب باتوں کو نہیں مانتی۔''

''ہوسکتا ہے میں بہت غریب ہوں...... میں ایک بیوی تک افورڈ نہ کرسکتا ہوں۔''

''دولت میرے لیے کبھی اہم نہیں رہی...... اور میرے پاس اس کی کمی نہیں ہے کہ میں اس بارے میں سوچوں......''

''ظاہر ہے...... جواد خاقانی کی بیٹی کو دولت کے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''آپ جانتے ہیں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''یقیناً...... اُس روز شادی کے موقع پر تمہیں تمہارے ڈیڈی کے ساتھ دیکھا تھا اور تمہیں اُن کو ڈیڈی کہہ کر مخاطب کرتے بھی دیکھا تھا...... ہوسکتا ہے......'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''ہوسکتا ہے میں تم سے تمہاری بے پناہ دولت کے لیے ہی شادی کررہا ہوں۔''

جینا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اور پھر بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا...... میں آپ کو جان چکی ہوں...... میری محبت اتنی معمولی اور اتنی خود غرض نہیں ہوسکتی۔''

ڈنر کے بعد جو ہوا وہ بھی اُن کے پلان میں شامل نہیں تھا۔ لیکن جینا آزاد خیال اور لاپرواہ تھی...... وہ تو خوشیوں سے سرشار سب بھولے

بیٹھی تھی۔ صورتِ حال کی گھمبیرتا اور پیچیدگی کا اُسے احساس ہی نہ تھا۔ جب وہ نشے کی اس کیفیت سے نکلی تو وہ جا چکا تھا۔ پہلے تو وہ حیران رہ گئی۔ جاتے جاتے مل کر بھی نہیں گیا...... پھر عادت کے مطابق اُس نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا...... دیر ہو رہی ہوگی۔

لیکن آج وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ اُسے چھ ماہ کے لیے جانا تھا۔ وہ اُس کی نئی نویلی دلہن تھی۔ دلہن بھی وہ جس سے اُس نے محبت کہ وجہ سے عجلت میں شادی کی تھی۔ جاتے ہوتے اُسے اپنی دلہن کو جذباتی انداز میں خدا حافظ کہنا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اس اور یہ سوچ آج اُس کے ذہن میں آئی تھی۔ اُس رات کے بعد نہ وہ خود نظر آیا تھا اور نہ ہی کبھی کال کیا...... تو کیا اُس نے اُسے دھوکا دیا...... کیا اُس نے اُس تھپڑ کا بدلہ لیا...... کیا اُس نے واقعی اُس سے بے پناہ دولت کی وجہ سے شادی کی ہے...... اور کسی مناسب وقت کے انتظار میں ہے اپنی چال چلنے کے لیے...... اوہ اُس نے ایزی چیئر کی بیک سے سر ٹیک دیا اور آنسو پوری شدت سے اُس کے گالوں کو بھگونے لگے۔

''ہینڈسم...... تم نے مجھے برباد کر دیا...... تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا...... لیکن اس کم بخت دل کا کیا کروں جو آج بھی تمہارے نام پر دھڑکتا ہے...... آج بھی صرف تمہیں چاہتا ہے۔''

ماہا جو ابھی ابھی فواد سے لمبی محبت بھری گفتگو کر کے آئی تھی۔ دکھی دل لیے وہاں کھڑی رہ گئی۔ اُس کی بیٹی درد کی جس کیفیت سے گزر رہی تھی...... ماہا کی ایک ہی خواہش تھی۔ کاش وہ اُس کا درد لے کر اُسے خوشیاں فراہم کر سکے۔

☆......☆......☆

محبت روشنی ہے تو اُس کے کسی پہلو میں تاریکی بھی چھپی ہے...... یہ تاریکی محبت کا حصہ نہیں ہے لیک محبت کرنے والے جذبات کی رو میں اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اُسے خود پر ناز تھا...... اپنے کردار پر فخر تھا۔ اپنے کنٹرول اور ضبط پر غرور تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ وہ محبت کر بیٹھا...... جہاں محبت ہو وہاں کھونے کا خوف دل کے کسی کونے میں ہمیشہ موجود رہتا ہے...... اور وہ رات جو اُس کی خوشیوں کی معراج بننے والی تھی۔ اُس رات وقت قیامت کی چال چل گیا۔

وہ اپنے باپ کا سب سے لاڈلا بیٹا تھا۔ اُن کی رائے لیے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا...... اس کے ہر فیصلے میں اُن کا مشورہ اور قبولیت کی سند شامل ہوتی تھی اور شادی تو ایک ایسا قدم ہے جو اُس نے اپنے باپ اور خاندان کے باقی لوگوں کو شامل کیے بغیر کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا...... لیکن یہ چند ماہ میں وہ جینا کی محبت میں اتنا آگے نکل گیا...... اُس میں اتنی شدت آ گئی تھی کہ جب اُس نے عالی کا ذکر کیا اور اُسے بتایا کہ وہ کیا چال چل کے آئی ہے۔ اُس کے ڈیڈی کے کیا ارادے اور خواہشات ہیں...... وہ اپنے اصول اپنے نظریات سب بھول گیا۔ اُس کے دل میں بس ایک ہی بات رہ گئی۔ جینا کو کھو دینے کا خوف...... جینا کی محبت کا اُسے پہلے دن سے یقین تھا لیکن اُس کی شخصیت کے بے شمار پہلو اُس کی نظروں سے اوجھل تھے۔

وہ انہیں جاننا چاہتا تھا۔ شادی سے پہلے اُس کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت نے مہلت ہی نہیں دی...... اُس نے کئی والدین کو اپنی عزت کا واسطہ دے کر لڑکیوں کی

شادی اپنی خواہشات کے مطابق کرتے دیکھا تھا۔ ماؤں کو دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دیتے دیکھا تھا۔ باپوں کو اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر لڑکی کو مجبور کر دینے کے قصے سنے تھے۔ اور اُس کے پاس تو وقت ہی نہیں تھا جانا بھی ضروری تھا......

وہ ایک قابل ڈاکٹر تھا اور حکومت اُسے مزید کورسز کے لیے باہر بھیج رہی تھی۔ سنہری موقع تھا' وہ گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ کھونا تو وہ جینا کو بھی نہیں چاہتا تھا...... اُسے کسی چیز کی قربانی تو دینا تھی۔ تو اُس کے اصول و نظریات قربانی کی راہ میں آ گئے۔ کسی بہتر چیز کے لیے اصول میں تھوڑی سی لچک پیدا کرنے میں کیا حرج ہے...... اُس نے جینا سے شادی کر لی...... وہ شرعی طور پر اُس کی بیوی تھی رسم دنیا بھی تھی۔ موقع بھی تھا اور دستور بھی......

پھر بھی اُس نے پکا فیصلہ کیا تھا کہ رخصتی ہونے تک وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ جینا کی دوشیزگی کا احترام کرے گا۔ ایسا کوئی قدم بھی جذبات کی رو میں آ کر نہیں اٹھائے گا کہ اُسے خود اپنی نظروں میں اور جینا کو اپنے گھر والوں کی نظروں میں شرمندہ ہونا پڑے...... لیکن جینا کی معمولی سی خواہش رد کر دینا اُس کے بس میں نہ تھا...... اور پھر وہ خود بھی تو اُس کے محبوب وجود کو بازوؤں کے حلقے میں لے کر اُس کے دلنشین وجود کی سنہری یادیں ساتھ لے جانا چاہتا تھا...... جو چھ ماہ اُس کے جینے کا سہارا بن سکیں...... لیکن شاید وہ بھول گیا تھا کہ آگ اور پیٹرول کا میل برف کے گلیشیئر نہیں بلکہ آگ کے الاؤ کے جنم کا باعث ہوتا ہے......

اُس نے خود پر کنٹرول کرنے کی بہت کوشش کی لیکن جینا شاید اُس موڈ میں نہیں تھی...... وہ بھی انسان ہی تھا۔ بہکنا لازم تھا...... لیکن طوفان کے خاتمے کے بعد وہ جیسے اپنی ہی نظروں میں گر گیا...... ایسا گرا کہ اُسے کچھ یاد نہیں رہا...... اُسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ نئی نویلی دلہن کو خدا حافظ کہے بغیر چلا گیا تو وہ کیا سوچے گی...... اُس نے اپنا بریف کیس اور بیگ اٹھایا اور گھر سے نکل گیا......

سیدھا ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ شرمندہ تھا...... خود سے اور خود سے زیادہ جینا سے...... وہ کیا سوچتی ہو گی میرے میں......

اگر وہ جاتے جاتے جینا کی کیفیت دیکھ لیتا تو احساسِ جرم کی شدت شاید کم ہو جاتی...... لیکن اُس کی شرمندہ نظریں جینا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکیں...... خود پر لعنت بھیجتے ہوئے اُس نے لمبا سفر طے کیا...... وہ سفر جو جینا کی خوشگوار یادوں کی وجہ سے جلد کٹ جانا چاہیے تھا...... وہ احساسِ جرم کی وجہ سے تکلیف دہ حد تک لمبا ہو گیا...... وہاں جا کر اُس نے موبائل تو خرید لیا لیکن اُس سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکا...... فون ملاتا اور نمبر پورا ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیتا...... کسی دوست سے بھی بات نہیں کی......

اپنے گھر بھی کم کم رابطہ رکھا...... اپنے کردار اور اپنے نفس کی کمزوری پر دل خون کے آنسو روتا تھا...... کتنا ناز تھا اُسے اپنے ضبط و کنٹرول پر...... اور جب اُن کے امتحان کا وقت آیا تو وہ ریت کی بھربھری دیوار ثابت ہوئے۔ پہلے قدم پر ہی وہ ہار گیا...... دل بے پناہ اذیت کا شکار تھا۔ جینا زندگی تھی اُس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اُس سے معافی مانگنے کی خواہش رکھتا تھا۔ لیکن اُس سے بات کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ وہ کمزور تھا یا بزدل تھا۔ دل نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی۔ دماغ نے بہلاوے

دیے۔ کئی تاویلیں پیش کیں...... وہ شرعی طور پر تمہاری بیوی ہے۔ تمہارا اُس پر پورا حق تھا...... تم نے جو کیا وہ گناہ نہیں ہے......

اگر یہ گناہ نہیں ہے تو پھر میرا دل کیوں بے چین اور مضطرب ہے...... مجھے قرار کیوں نہیں ہے...... یہ پاکستان ہے...... مغربی معاشرہ نہیں ہے۔ یہاں رخصتی سے پہلے صرف نکاح کے نام پر ایسی باتوں کی اجازت نہیں ہوتی...... اور جینا کو بھی یقیناً ایسی توقع نہیں ہوگی مجھ سے...... میں یوں اُس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے چوروں کی طرح اُسے نظر انداز کر کے گھر سے نکل گیا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ اتنا عرصہ فون بھی نہیں کیا...... وہ تو یقیناً مجھے دھوکے باز سمجھتی ہوگی۔ مجھے اُسے اپنے اُس قدم کی توجیہہ پیش کرنی چاہیے۔ لیکن کیا توجیہہ دوں گا کہ سوری میں بہک گیا تھا......؟ معاف کرنا میں بھی عام مرد ثابت ہوا۔

''اُف خدایا...... اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا...... وہ چھ ماہ اُس نے کس اذیت میں کاٹے...... اپنی آگ میں جلتا رہا...... اوپر سے کام کا بوجھ...... وہ خود سے اور اپنے جذبات سے لڑتے لڑتے ادھ موا ہو گیا تھا۔ خود کو سزا دیتا رہا...... جینا سے بات نہ کی...... جینا کے لیے بھی تو یہ سزا ہوگی۔ لیکن اُسے کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔ کسی دوست سے اس واقعہ کے بارے میں بات کرنا وہ اپنی عزتِ نفس کے خلاف سمجھتا تھا...... دوست تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ جینا سے محبت کرنے لگا ہے اُس سے شادی بھی کر چکا ہے اور...... اور......''

ایک آدھ بار اُس نے جینا کے گھر کے پی ٹی سی ایل نمبر کو ڈائل کیا۔ لیکن کسی کے اٹھانے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔ جینا کے موبائل پر کال کرنے کی ہمت نہ کر سکا اُس سے بات کرنا آسان نہیں تھا۔ اور اس معاملے پر فون پر بات کرنا اور بھی مشکل تھا...... اسی طرح چھ ماہ گزر گئے' وہ واپس آ گیا۔ وہ تنہائی کی سزا کاٹ چکا تھا۔ ہر دم اپنا محاسبہ کر کے خود کو لعنت ملامت کرتا رہا تھا۔

لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ وہ جینا سے بہ نفسِ نفیس مل کر سب باتوں کا حساب دے...... اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کی معافی مانگے...... چوڑیاں پہننے کی بجائے مرد بنے اور اپنے اقدامات کی ذمہ داری اٹھائے۔ اپنے کیے کی سزا بھگتے اپنی غلطیوں کی تلافی کرے...... وہ جینا کے گھر کبھی نہیں گیا تھا...... لیکن جواد خاقانی ایک مشہور و معروف شخصیت تھے اُن کے گھر کا پتہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ہمت کر کے وہاں پہنچ گیا۔ گیٹ پر بیٹھا چوکیدار اُسے دیکھتے ہی آگے بڑھا۔

''کس سے ملنا ہے صاحب جی؟''

''مجھے جینا سے ملنا ہے......'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

چوکیدار کو ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ ہمیشہ سے جینا کی سہیلیاں اور دوست آتے رہتے تھے۔

''پر بی بی تو گھر میں نہیں ہے......''

''کب تک آجائیں گی؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کچھ پتہ نہیں صاحب...... بیگم صاحبہ کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں...... ٹائم تو لگ جائے گا۔ اُدھر سے اُن لوگوں کو کسی دوست کے گھر بھی جانا ہے۔''

''اچھا......'' وہ مایوس ہو گیا۔

''ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا۔''

''آپ کا کیا نام بتاؤں صاحب......؟''
چوکیدار مودب انداز میں بولا۔
''کچھ نہیں...... کچھ بتانے کی ضرورت نہیں...... میں پھر آؤں گا تو اپنا تعارف خود ہی کرالوں گا۔'' وہ مایوس لوٹ آیا۔ اسپتال میں بے پناہ رش اور مصروفیات کے باعث دو تین روز تک جانے کا موقع نہیں ملا...... چوتھے روز وہ پھر وہاں موجود تھا۔

چوکیدار اُسے پہچان کر قریب آیا۔
''آپ نے دیر کردی صاحب جی...... آج آپ پھر بی بی سے نہیں مل سکتے۔''
''کیوں؟ خیریت۔'' وہ پریشان ہوگیا۔
''بی بی تو چلی گئیں باہر کے ملک...... انہوں نے وہیں داخلہ لے لیا ہے...... اب تو جانے کب آئیں۔''
''باہر کے ملک؟ داخلہ......؟ یہ تم کیا کہہ رہو خان؟'' اُس کی پریشانی عروج پر تھی۔
''بس یہ بی بی کی خواہش تھی۔ بی بی بہت اُداس رہتی تھی۔ ایک دم چپ سی ہوگئیں۔ انہوں نے باہر داخلہ لینے کی خواہش کی تو صاحب فوراً مان گئے۔ بہت محبت کرتے ہیں بی بی سے کوئی بات نہیں ٹالتے۔''
وہ گم سم کھڑا رہ گیا۔
''باہر کون سے ملک گئی ہیں تمہاری بی بی؟'' وہ بے چینی سے بولا۔
''ہم کیا جانیں صاحب...... ہم تو اپنے پاکستان کو جانتے ہیں بس...... اور ملکوں کا ہمیں کیا پتہ؟''
''کوئی اور گھر میں ہے جس سے بات کی جاسکے۔''
''صاحب تو بی بی کے جاتے ہی اپنے کاروباری دورے پر چلے گئے۔ بیگم صاحبہ بھی ملک سے باہر چھٹیاں گزارنے گئی ہیں۔ ان بڑے لوگوں کو تو آپ جانتے ہیں۔ پیسہ ہاتھ میں ہو تو خرچ کرنے کے ہزاروں طریقے...... بڑی بیگم صاحبہ ہوتی تھیں ہمیشہ گھر میں...... اب تو وہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ بی بی روتے ہوئے اس گھر سے گئی ہیں...... اُن کا دل تو اسی گھر میں اٹکا تھا...... لیکن بڑے صاحب نے مجبور کیا کہ اس طرح دل بہلا رہے گا۔''
چوکیدار باتونی تھا اُسے باتیں کرنے کے لیے کوئی شخص ملا تو وہ کچھ سوچے سمجھے بنا بولتا ہی جارہا تھا۔ لیکن ہینڈسم کی دنیا ویران ہوچکی تھی۔
وہ یقیناً اس سے مایوس ہوکر چلی گئی۔ چھ ماہ تک کال نہیں کیا۔ تو وہ اُسے دھوکے باز اور بے وفا نہ سمجھتی تو کیا کرتی۔ خدایا مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوگئی۔
ایک کے بعد دوسری غلطی...... کچھ بھی تھا کال کرنا فرض بنتا تھا۔ چاہے وہ ناراض ہوتی غصے میں اُسے کچھ بھی کہہ دیتی...... لیکن اسے بے وفا اور دھوکے باز تو نہ سمجھتی۔
''اب میں کیا کروں...... اُسے کہاں ڈھونڈھوں...... اُسے کیسے اپنی محبت اور وفا کا یقین دلاؤں...... ہاں خان...... کیا تم جانتے ہو کتنے عرصے بعد لوٹیں گی؟'' اُسے ایکدم خیال آیا تو پوچھ بیٹھا۔
''صاحب جی دو سال تو لگ جائیں گے۔ شاید بیچ میں چھٹیوں کے لیے آجائیں۔''
''دو سال......'' وہ بے یقینی سے بولا۔
''جی صاحب جی...... سب یہی کہہ رہے تھے۔ لیکن کیا پتہ جلدی بھی آسکتی ہیں۔'' وہ مایوسی سے پلٹا...... دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''صاحب جی آپ نے پھر اپنا نام نہیں بتایا؟''

''کیا کرو گے نام جان کر......'' وہ تلخی سے بولا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر زن سے رخصت ہوگیا۔ اور آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ نامراد تھا۔ ہر ماہ چکر لگاتا تھا......لیکن گوہر مقصود نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ اور اُس کے لیے صرف اور صرف وہ خود قصوروار تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک کر ماضی سے نکل کر اپنے حال میں آ گیا...... بڑی بھابی تھیں۔

''شاہو......کل سے اپنے کمرے میں بند ہو...... بابا بہت فکر مند ہیں...... چلو لنچ تیار ہے آ جاؤ۔''

شاہ زیب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر باہر نکل آیا کھانے کی میز پر سب موجود تھے۔ دونوں بڑے بھائی بھابیاں، بھتیجے اور بابا جان سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بچے آپس میں نوک جھوک کرتے ہوئے قہقہے بکھیر رہے تھے۔ بس چپ تھے تو بابا جان......

اُسے واقعی افسوس ہوا......اپنے مسائل میں اُلجھ کر اُس نے اُن کے بارے میں سوچا ہی نہیں...... اور ابھی تو اُسے اُن کو ایک اور بڑی بات کے لیے منوانا تھا۔

''بابا جان لگتا ہے آپ دوائیاں باقاعدگی سے نہیں لیتے...... دیکھیں تو کتنے کمزور ہو رہے ہیں...... کیوں بھائی جان میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''بابا جان ایکدم ٹھیک ہو جائیں گے۔ اگر تم اُن کی شادی والی بات مان لو......'' بڑے بھائی شرارت سے بولے...... تابندہ مسکراتے ہوئے پلیٹ پر جھک گئیں۔

''ہاں چاچو...... سب سے بڑا بھتیجا عمران شرارت پر آمادہ تھا۔ اب ہمیں چاچی چاہیے۔''

''تو چاچی تو ہے نا...... عالیہ چاچی...... تمہاری چاچی ہے نا......'' وہ مسکرایا۔

''ہمیں چھوٹی چاچی چاہیے۔'' کامران بولا۔

''اب ان بچوں کی خواہش تو تمہیں پوری کرنی پڑے گی برخوردار...... جلدی سے چاچی کا انتظام ہو جانا چاہیے۔'' بابا جان سب بھول کر بول اُٹھے۔

اُن کی خواہش پوری ہوگی اور آپ کی خواہش بھی ہم ضرور پوری کریں گے۔ شادی کریں گے...... خوب دھوم دھام اور شان و شوکت کے ساتھ......لیکن اُس کے لیے ہماری ایک شرط ہے۔''

سب کھانا بھول کر اُن کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''ہمیں دو سال کا عرصہ چاہیے...... دو سال بعد جو آپ سب کی مرضی وہی ہوگا۔'' وہ ڈرتے ڈرتے سب کو دیکھنے لگا۔

''دو سال؟'' بابا شاک میں تھے۔

''دو سال؟'' بھائی حیران تھے۔

''پورے دو سال؟'' بھابیاں انہیں حیرت سے دیکھنے لگیں۔ بچوں کے چہرے لٹک گئے۔

''پوری بات سن لیجیے پہلے......'' شاہ زیب نرمی سے بولے۔

''بات دراصل یہ ہے کہ میرے اسپتال والے مجھے دو سال کے لیے مزید اسپیشل ٹریننگ کے لیے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔ اور میں یہ سنہری

اور تابناک موقع گنوانا نہیں چاہتا...... واپس آؤں گا تو جوسب کا دل چاہے کیجیے گا۔''
''لیکن تم شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے کر بھی تو جا سکتے ہو......'' بابا بولے۔
''واہ بابا جان...... یہ بھی خوب کہی آپ نے......'' شاہ زیب مسکرا کر بولا۔
''آپ تو جانتے ہیں وہاں کی ٹریننگ کس قدر سخت ہوتی ہے۔ اپنے آرام کے لیے وقت نہیں ملتا تو بیوی کی دلداری کے لیے وقت کہاں سے لاؤں گا...... ایسے میں ہر وقت لڑائی اور ناراضگی کی صورت حال رہے گی۔ میں ٹریننگ پر توجہ دے سکوں گا کیا؟ اور یوں بھی میں نے ایک اور فیصلہ کرلیا ہے۔''
''اب وہ بھی بتا دیں حضور والا......'' شاہ نواز بولے۔
''میں چاہتا ہوں جب تک میری ٹریننگ مکمل ہو...... بابا جان اپنی خواہش کے عین مطابق یہاں کلینک بنوالیں...... اُسے تمام مشینوں اور ڈاکٹری آلات سے مزین کرلیں۔ میں اُن کی خواہش کے مطابق اس شہر کے لوگوں کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔ جن لوگوں کے درمیان ہمیشہ رہا ہوں۔ اُن کا قرض انہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔ اُن کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں...... اور میں سمجھتا ہوں اگر میں باہر سے اپنی ٹریننگ مکمل کر کے آؤں گا تو بہتر طریقے سے اُن کا علاج کرسکوں گا۔''
''اور جو اسپتال تمہیں باہر بھیج رہا ہے...... اُسے چھوڑ دو گے؟'' بابا بولے۔
''نہیں بابا...... اتنا احسان فراموش نہیں ہے آپ کا بیٹا...... انہیں بھی وقت دوں گا اور کلینک میں بھی کام کروں گا...... اور......'' وہ مسکرا کر تھوڑا رُکا۔
''اور شادی بھی کروں گا......'' سب ہنس دیے بابا سنجیدہ تھے اُن کی پُرسوچ نظریں شاہ زیب کے چہرے کو اپنی نظروں کے احاطے میں لیے ہوئے تھیں۔
''تو پھر اجازت ہے بابا جان......''
''اجازت ہے بابا کی جان......'' وہ جذباتی ہوگئے۔
''تم جاؤ اور سرخ رو لوٹو اور خدا تمہیں اُس مقصد میں بھی کامیاب کرے جس کی وجہ سے تم شادی سے فی الحال کترا رہے ہو۔''
وہ ششدر بابا کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ باپ کے دل میں کتنی گہرائی اور آنکھوں میں وسیع تجربے کی جھلک تھی۔ شاہ زیب کی نظریں جھک گئیں۔
''آپ میرے لیے دعا کیجیے بابا...... خدا مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے...... اور میں سب کی نظروں میں سرخرو ہوسکوں۔''
''میری دعائیں تو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہی ہیں...... اور اب اُن دعاؤں میں ایک اور اَن دیکھی ہستی بھی شامل ہوگئی ہے۔ خدا کرے تمہاری مراد تمہیں مل جائے۔'' اُس نے خلوص دل سے آمین کہا اور سکون کا سانس لیا۔ اب وہ یکسوئی سے ہر قیمت پر جینا کو ڈھونڈے گا۔ اور اُس کے دردِ دل کا ازالہ کرسکے گا۔ اسے مہلت مل گئی تھی۔ اور جسم کا رواں رواں اُسے ہی پکار رہا تھا۔

☆......☆......☆

(ٹھیک دو سال بعد)

ماہا نے ناشتے کی میز پر بریڈ پر مکھن اور جیم لگا کر جواد خاقانی کے سامنے رکھا اور کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔ اب وہ جواد کا ہر کام خود اپنے

ہاتھوں سے کرتی تھی اور جواد بھی اسی میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ جینا والے حادثے نے اُن کو یکسر بدل دیا تھا۔ اُن کا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ عرش سے فرش پر آ گئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک نارمل انسان کے روپ میں ڈھل گئے۔ جس کے دل میں دوسروں کے لیے درد ہوتا ہے۔ ملازمین کے ساتھ بھی اُن کا رویہ مشفقانہ ہو گیا۔

اور ماہا کو تو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔ محبت نے اُس کے لیے اپنے دروازے کھول دیے تھے۔ جواد نے اگلی پچھلی ساری کسریں نکال دی تھیں۔ بڑے عجز سے اُس سے معافی مانگی تھی۔ اور ماہا تو اُن سے محبت کرتی تھی۔ وہ انہیں اس روپ میں کیسے برداشت کرتی۔

''نہیں جواد...... آپ مجھ سے معافی نہ مانگیں۔ آپ میرے شوہر ہیں...... آپ کا بہت حق ہے میرے اوپر...... مجازی خدا ہیں میرے...... اس لیے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے اچھے نہیں لگتے۔ آپ نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا مجھے وہ محبت دے دی جو میرا حق ہے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

جواد اُس کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ بس ایک پھانس سی چبھی تھی اُن کے دل میں جینا کی صورت میں...... اُن کی لاڈلی نازوں پلی بیٹی...... اُس روز (سوا دو سال پہلے) جو اس گھر سے نکلی تھی تو پھر واپس یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ در و دیوار اُس کی آواز اور اُس کے وجود کے لیے ترس رہے تھے۔ لیکن اُس کی طرف سے مسلسل انکار تھا۔

''میں اجالا کو لے کر وہاں نہیں آ سکتی ڈیڈی...... مجھے آپ کی اور اپنے سارے خاندان کی عزت بہت عزیز ہے...... میں اس عزت پر ذرا سی آنچ بھی نہیں آنے دوں گی۔ میں پہلے ہی آپ کو دکھ دے چکی ہوں...... اور نہیں دے سکتی...... میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں ڈیڈی...... ممی سے بھی بہت محبت کرتی ہوں۔ اب جبکہ میں ماں کی محبت سے روشناس ہو گئی ہوں تو آپ کا درد صحیح معنوں میں سمجھنے لگی ہوں...... ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔''

اُس کی خواہش پر جواد خاقانی نے مری میں اُسے بہت خوبصورت فلیٹ خرید کر دیا تھا۔ رانی کو زبردستی ساتھ بھیجا تھا۔ وہ تو وہاں کے کسی ملازم کو رکھنے کو تیار نہیں تھی کہ بات کھل جانے کا خدشہ تھا۔ لیکن اس معاملے میں جواد نے اُس کی ایک نہیں سنی تھی، بات اعتبار کی تھی۔ مقامی ملازمہ پر انہیں اعتبار نہیں تھا جبکہ رانی قابل اعتبار تھی۔ وقت آنے پر اپنی وفاداریوں کا ثبوت دے سکتی تھی۔

چوکیدار کے لیے انہوں نے اپنے چوکیدار دلاور خان کو وہاں بھیج دیا تھا اور اپنے لیے دلاور خان کے بھائی شہباز خان کو اُس کے گاؤں سے بلوا لیا تھا۔ دلاور خان پر انہیں بے پناہ اعتماد تھا۔ اور وہاں اُس فلیٹ میں اُن کی دو بے حد قیمتی ہستیاں رہتی تھیں۔ جن کی حفاظت بے حد ضروری تھی۔ لیکن جب جب وہ جینا کے بارے میں سوچتے دل پر ٹھیس لگتی۔ اُس نے اپنی غلطی کی سزا خود ہی تجویز کر لی تھی اور پورے صبر سے اُس پر عمل پیرا تھی۔

ماہا ہنستے مسکراتے ہوئے دنیا جہاں کی باتیں کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ناشتہ بھی کر رہی تھی۔ لیکن جواد کی پلیٹ پر نظر پڑی تو وہ جوں کی توں پڑی تھی۔ انہوں نے سینڈوچ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ سوچوں میں گم سم اُن کے چہرے پر درد کی

انوکھی کیفیت تھی، ماہا کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''کیا بات ہے جواد؟ کیا سوچ رہے ہیں؟''

وہ جانتی تھی اُن کی سوچیں کہاں گھوم رہی ہوں گی۔ پھر بھی پوچھ بیٹھی۔

جواد چونکے...... لبوں پر پھیکی سی ہنسی آئی پھر بے پناہ سنجیدہ ہوگئے۔

''میں بھی کتنا بدقسمت ہوں ماہا...... خدا نے مجھے کتنی نعمتیں عطا کی تھیں۔ لیکن میں اپنے تکبر اور بے وقوفی سے کسی کی قدر نہ کرسکا۔ آج میں اس مقام پر ہوں کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں...... میں چاہوں بھی تو جینا کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کا درد نہیں سمیٹ سکتا۔''

''آپ ان باتوں کے بارے میں کیوں سوچتے ہیں جو آپ نہیں کرسکتے...... یا جو آپ کے پاس نہیں ہیں۔'' ماہا نے اُن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔

''اُن چیزوں کے بارے میں سوچیے جو آپ کے اختیار میں ہیں۔ جینا کے واقعے نے آپ کو ایک اچھے انسان میں بدل دیا ہے...... آپ اپنی ذات سے ہٹ کر سوچنے لگے ہیں۔ آپ غریبوں کی مدد کرتے ہیں کتنے ہی نادار خاندانوں کے لیے مسرت اور اطمینان کا باعث ہیں...... آپ کو اتنی دعائیں ملتی ہیں فکر نہ کریں۔ یہ دعائیں کسی دن رنگ لائیں گی۔ عرش تک پہنچیں گی آپ کی آنکھیں اور دل کو ٹھنڈک عطا ہوگی۔ جینا کو ضرور خوشیاں نصیب ہوں گی۔'' جواد نے ممنون اور محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

''تم ہمیشہ ٹھیک وقت پر ٹھیک بات کرکے میرے دل کو سکون عطا کرتی ہو...... میں کتنا کم ظرف تھا۔ میں نے زندگی کے اتنے سارے سال گنوادیے۔ برباد کردیے تمہارے بغیر......

اور آج میری وجہ سے میری عزیز بیٹی وہاں تنہا زندگی گزار رہی ہے۔ خود کو سزا دے رہی ہے؟''

''پھر وہی بات......'' ماہا محبت سے بولی۔

''یہ سمجھ لیں کہ ہر کام خدائی حکم سے ہوتا ہے۔ اور اُس میں خدا کی کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے۔ انشاء اللہ اچھا وقت بھی ضرور آئے گا۔ مجھ پر یقین رکھیں۔''

جواد کی سوچیں تو کہیں اور ہی بھٹک رہی تھیں۔ اُن کے لیے یہ بات انتہائی اذیت ناک تھی کہ جینا اب اس گھر میں نہیں آسکتی۔ اور اس کے لیے وہ خود کو قصور وار سمجھتے تھے۔ اگر وہ جینا کو ماہا سے جدا نہ کرتے۔ وہ بھی اُس کی تربیت میں حصہ دار ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ وہ تو سارا دن بزنس کے جھمیلوں میں گھر سے باہر رہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جینا کی پیدائش پر ماہا سے حساب برابر کرنے کے لیے انہوں نے اپنا آفس گھر میں ہی شفٹ کرلیا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اور اُسے ماہا سے دور کرنے کا مقصد پورا ہوگیا تو وہ پھر سے اپنے کاروبار میں پوری طرح انوالو ہوگئے۔ یوں بھی جینا اب بڑی ہوگئی تھی۔

اُس کا اپنا ایک حلقہ قائم ہوگیا تھا۔ اُن دوستوں میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی تھیں انہیں جینا کے لڑکوں سے دوستی کرنے پر اعتراض بھی نہ تھا۔ وہ اُسے خود اعتمادی اور روشن خیالی سے بھرپور لڑکی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ رات کو تھوڑی دیر سے گھر آتی تو ماہا بے چین ہوجاتی کئی بار اُن سے کہہ چکی تھی کہ اُسے اتنی آزادی نہ دیں۔ لڑکوں سے میل جول نہ رکھنے دیں لیکن وہ ماہا کی ضد میں اُسے کچھ نہ کہتے۔

''یہ ضد......؟''

یہ ضد آخر کیوں تھی وقت کے ساتھ ساتھ ماہا

نے خود کو بدل لیا تھا۔ اُن کی مرضی کے مطابق ڈھالنے میں بہت محنت کی تھی۔ اُن کی بے اعتنائی کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی۔ تعلیم مکمل کی تھی۔ اپنی گرومنگ کے لیے ڈھیروں کورسز جوائن کیے تھے۔ اس کا نتیجہ انتہائی شاندار رہا تھا۔ تنا شاندار کہ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ اُس کی محبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن کبھی تسلیم نہیں کیا۔

وہ اُن کے اعلیٰ طبقے کی کسی بھی عورت سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ بلکہ درد نے اُس کی شخصیت کو ایسا سوز عطا کیا تھا جس نے اُسے بے پناہ کشش کا مالک بنا دیا تھا۔

اُن کا دل اُس کی طرف کھینچا تھا لیکن اَنا اور تکبر آڑے آ جاتے...... بھلا وہ اُس لڑکی کے سامنے جھک جائیں۔ ہار نان لیں جو گاؤں میں بھینسوں کو چارہ ڈالتی تھی۔ برتن مانجھتی تھی اور اُپلے تھاپتی تھی۔ وہ بھول جاتے تھے کہ اُن کا خمیر بھی اُسی گاؤں سے اٹھا تھا۔ اُن کی ماں بھی یہی کچھ کرتی تھی۔ لیکن جب آنکھوں کے سامنے غرور و تکبر کا پردہ تنہا ہو تو پھر حقیقتیں چھپ جاتی ہیں۔

اُس کی کشش انہیں اُس کے پاس جانے پر مجبور کر دیتی...... لیکن وہ ہمیشہ غصے اور غیض و غضب کے پردے میں چھپ کر ہی اُس کے قریب گئے تھے۔ اور پھر فواد کے گود لینے کے واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ وہ جب اُس کے قریب ہونے کو تھے...... وہ گھر سے چلی گئی تھی۔ اُن سے پوچھا تک نہیں...... اُن دنوں تو اماں اُس کی ڈھال بن جایا کرتی تھیں۔ اُن سے پوچھے بنا چلے جانے پر وہ کبھی اُسے معاف نہ کر پائے اور جب وہ فواد کے ساتھ واپس آئی تو وہ اور غضبناک ہو گئے اُن سے پوچھے بغیر وہ کسی بھی بچے کو کیسے اڈاپٹ کر سکتی ہے۔ وہاں بھی اماں مدد کو موجود تھیں۔ اُن کے درمیان دوریاں اور بڑھ گئیں۔

فواد انہیں زہر لگنے لگا...... اُس کا زور زور سے رونا اُن سے برداشت نہ ہوتا اور یہ بات اُن کو اور بھی آگ لگا دیتی کہ اب ماہا کو کسی بات کی پرواہ نہ رہی تھی۔ وہ فواد میں اس طرح گم ہو گئی کہ کسی اور کا ہوش نہیں رہا۔ تب اُن کی انتقامی فطرت نے اُسے فواد سے دور کرنے کے لیے اپنے سارے کام سونپ دیے۔ وہی کام جن کو ہتھ لگانے سے انہوں نے اُسے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ وہ اُس کی کہانی جانچنے کے لیے گاؤں تک ہو آئے ماسی جیواں سے بھی ملے...... جب وہ اُس کے گھر پہنچے تو وہ گھر سے باہر بنی قبر پر پانی چھڑک رہی تھی۔ ماسی جیواں نے انہیں بتایا کہ یہی اُس بدقسمت بیوہ کی قبر ہے جو بچے کو جنم دے کر موت کے منہ میں چلی گئی۔ ماہا چونکہ وہاں موجود تھی۔ تو وہی اُس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ بعد میں وہ اُس سے اتنی مانوس ہو گئی کہ اُس سے جدا ہونا مشکل ہو گیا۔

تب میں نے ہی اُسے مشورہ دیا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتی پہلے تو وہ حیران رہ گئی کہ یہ خیال اُس کے دل میں کیوں نہ آیا۔ پھر تمہارے بارے میں سوچ کر وہ پریشان ہو گئی کہ تم تو اس کی اجازت کبھی نہ دو گے۔

میں نے ہی اُسے مشورہ دیا کہ تم جوادی کی اماں کو ساتھ ملاؤ...... تب کہیں جا کر اُسے سکون آیا...... لیکن تم نے اُس کے ساتھ اچھا نہیں کیا...... اولاد کی جدائی کیا ہوتی ہے...... شاید تم کبھی جان سکو......''

اور بے شک وہ جان گئے تھے۔ حالانکہ جینا

اُن سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب چاہتے اُس سے مل سکتے تھے۔ لیکن وہ چاہتے تھے وہ اس گھر میں آئے۔ یہاں کے در و دیوار اُس کی ہنسی کی آواز کو ترس گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے یہاں اُجالا کی قلکاریاں گونجیں...... انہوں نے جینا کو معاف کر دیا تھا کیونکہ وہ یہی سمجھتے تھے کہ جینا کے اس قدم میں جینا سے زیادہ اُن کا قصور ہے...... اور وہ ٹھیک ہی تو تھی۔ انہیں وہ خط آج تک نہیں بھولا تھا جو اُس نے ڈاک کے ذریعے انہیں بھیجا تھا وار جسے پڑھ کر مرد ہوتے ہوئے بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''جان سے پیارے ڈیڈی......

مجھے شاید آپ کو خط لکھنے یا آپ کو مخاطب کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ میں نے آپ کا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔ آپ کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ لیکن میں فرشتہ نہیں ہوں...... انسان ہوں...... اور غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے محبت کو خود پر اُس طرح حرام نہیں کر لیا تھا جس طرح آپ نے خود کو محبت دو قدم دور ہوتے بھی اُس سے دور رکھا۔ نہ صرف خود سے دور رکھا بلکہ مجھ سے بھی دور رکھا۔ مجھے اُس محبت سے محروم رکھا جس کی دنیا مثالیں دیتی ہے۔ آپ نے مجھے اُس الوہی جذبے کا مزہ ہی نہ چکھنے دیا۔ اور باقی باتیں تو اُس کے ساتھ ہی آتی ہیں نا...... میری تربیت میں بہت بڑا خلا تھا۔ مجھے اچھے برے کی تمیز کروانے والا کوئی نہ تھا۔ ممی پھر بھی کوشش کرتیں مجھے سمجھانے کی لیکن میں اُن سے یوں دور بھاگتی جیسے مجھے کانٹے چبھ جائیں گے۔ آپ کے پاس اچھائی اور برائی کا درس دینے کا وقت کہاں تھا۔ یوں بھی آپ دونوں کا رویہ دیکھ کر مجھے غلط اور ٹھیک میں تمیز کہاں سے آتی؟ آپ کے رویے نے تو مجھے انتقام لینا ہی سکھایا...... ممی سے بدتمیزی کرنا ہی سکھایا...... زندگی کے اسرار و رموز اور پیچیدگیاں میں کہاں سے سیکھتی۔ قدم قدم پر بچھائے گئے انسانی جالوں سے کس طرح بچتی...... پھر مجھے محبت ہو گئی۔ یہ سچی محبت ہے ڈیڈی...... یہ آج بھی قائم ہے...... میں نے محبت سے آپ کی طرح منہ نہیں موڑا...... آپ تو ساری عمر محبت سے دور بھاگتے رہے...... اور میں محبت کے پیچھے بھاگتی رہی۔ ڈیڈی میرا یقین کریں اُس دن جو کچھ بھی ہوا وہ ہم نے ترتیب نہیں دیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ سے چھپ کر شادی کروں گی۔ یا آپ کی مرضی کے بغیر رشتہ ازدواج میں چوروں کی طرح منسلک ہوں گی۔ لیکن میرے پاس شاید کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں اپنی محبت کو کھونا نہیں چاہتی تھی...... اُس دن جو کچھ بھی ہوا وہ پلینڈ نہیں تھا جو ہونا تھا ہو گیا...... مجھے جو سزا ملنا تھی مل گئی۔ لیکن اس کا ایک آؤٹ کم ایسا ہوا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

میں نے وہاں ممی کو دیکھا' جانا اور اُن کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ وہ بالکل ویسی نہیں ہیں جیسی آپ مجھے بتاتے رہے ہیں۔ اُن سے زیادہ دلکش نفیس' سلیقہ مند اور محبت کرنے والی ہستی اس سے پہلے میری نظروں سے نہیں گزری اور مجھے دکھ ہے...... مجھے آپ پر غصہ ہے کہ آپ نے پورے انیس سال مجھے اُس جنت سے محروم رکھا۔ اس جنت کی موجودگی میں جینا شاید ویسی نہ ہوتی جیسی کہ اب ہے اور آپ کو حیران کن اور مزے کی بات بتاؤں ڈیڈی...... اس تھوڑے سے عرصے میں ہی اُن کی قربت نے جینا کو بدل دیا ہے...... اب جینا پہلے جیسی جینا نہیں رہی...... اور اس کا

کریڈٹ ممی کو جاتا ہے...... پلیز ڈیڈی میری بات مانیں اور محبت جو آپ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر ہے جسے آپ ہاتھ بڑھا کر چھو سکتے ہیں...... خود کو اور مجبور نہ کریں اُس سے دور رہنے پر...... ممی کو اُن کا حق دیں...... وہ محبت دیں جس کے لیے وہ اتنا عرصہ تڑپی ہیں...... کیونکہ اس ساری جنگ میں اُن کا کوئی قصور نہیں ہے میں آج بھی آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں ڈیڈی...... لیکن یہ شکایت شاید ہمیشہ میرے دل میں رہے گی کہ آپ نے مجھے میری جنت سے جدا کر دیا تھا۔''

وہ یہ خط پڑھ کر روئے تھے...... اپنی پوری زندگی کا محاسبہ کیا تھا۔ اپنی غلطیوں اور خود غرضیوں کو تسلیم کیا تھا...... اور خدا کی قدرت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے تھے کہ کس طرح ایک واقعہ پوری زندگی پر محیط خیالات اور نظریات کو بدل دیتا ہے...... کس طرح غرور و تکبر سے تنی گردن کو جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے...... پتھر کی طرح سخت دل کو گداز کر دیتا ہے...... ماہا کے لیے دل میں محبت موجود تھی۔ اُسے قبول کرنے میں کوئی دشوار نہیں تھی۔ اور ماہا تو فوراً اُچھل جانے والی ہستی تھی۔

اُس نے تو اُن کے معافی مانگنے سے پہلے ہی دل سے انہیں معاف کر دیا تھا۔ زندگی اُس کی وجہ سے خوبصورت ہو گئی تھی۔ بس ایک ہی خلش تھی۔ جینا کی خوشیاں کہاں سے حاصل کریں۔

جینا نے ماہا کو اپنی داستانِ محبت سنا دی تھی وہ محبت میں سب قربان کر دینے پر یقین رکھتی تھی۔ اُس نے اُس لڑکے سے کچھ بھی نہ پوچھا اور کورٹ میرج پر تیار ہو گئی۔ صرف اور صرف اُسے سکون و اطمینان مہیا کرنے کے لیے وہ تو اتنی خوش تھی کہ کاغذات پر سائن کرتی چلی گئی۔

یہ بھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کاغذات میں اُس کا اصل نام کیا لکھا ہے......

کاغذات اُس لڑکے نے اپنے بریف کیس میں رکھ لیے تھے اور جینا سے کہا تھا جاتے ہوئے جینا کی کاپی اُسے دے کر جائے گا تا کہ اُس کے پاس ثبوت موجود ہو اگر اُس کے ڈیڈی اُس کی شادی کہیں اور کرنا چاہیں لیکن واپسی پر جانے کیا ہوا وہ اتنی عجلت میں رخصت ہوا کہ کاغذات جینا کو دینا بھول گیا...... یا شاید اُس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہو...... تا کہ جینا کے پاس اُس کے مکر کا کوئی ثبوت نہ رہے......

شروع سے ہی اُس کا ارادہ جینا کو دھوکہ دینے کا ہو...... کئی بار اُن کا دل چاہا وہ لڑکا اُن کے سامنے آئے اور وہ اُس کو قتل کر دیں جس نے اُن کی لاڈلی بیٹی کی زندگی برباد کر دی تھی...... لیکن حسرتیں یوں ہی تو پوری نہیں ہو جاتیں۔

انہوں نے بے دلی سے چائے کا کپ اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا...... چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی بدمزہ سا منہ بناتے ہوئے واپس میز پر رکھ دیا۔

''ٹھنڈی ہو گئی...... آپ ایک منٹ انتظار کریں ابھی گرما گرم چائے کا کپ حاضر ہو جاتا ہے......'' وہ فوراً اٹھی۔

''کُک سے کہہ دو نا...... تم میرے پاس بیٹھو۔'' انہوں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ جانتے ہیں آپ کے لیے کام کر کے مجھے روحانی خوشی ملتی ہے...... آپ بس ایک منٹ انتظار کریں۔'' وہ نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گئی اور تھوڑی دیر بعد چھم سے واپس آ گئی۔

''لیجیے جناب چائے حاضر ہے......'' اُس نے مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کپ اُن کے سامنے رکھا اور روٹھے انداز سے بولی۔

''آپ اپنی خوراک کا بالکل خیال نہیں رکھتے..... جناب مجھے آپ بالکل ٹھیک ٹھاک اور صحت مند چاہئیں.....اور چہرے پر ذرا مسکراہٹ لائیے..... صحت کا بڑا شاندار نسخہ ہے۔'' وہ زبردستی انہیں ہنسانے اور بہلانے کی کوشش کررہی تھی لیکن یوں لگ رہا تھا کوئی حیلہ کارگر نہیں ہورہا تھا۔

''جینا کومس کررہے ہیں؟ اجالا یاد آرہی ہے؟'' وہ دردمندی سے بولیں۔

''اوہ جواد میں کیا بتاؤں آپ کو اتنی پیاری پیاری باتیں کرتی ہے..... کہ کیا بتاؤں؟ دل خوش ہوجاتا ہے سن کر..... دل چاہتا ہے زور سے بھینچ لوں..... لیکن ڈرتی ہوں رونے نہ لگ جائے..... اب تو جب بھی میں جاتی ہوں 'نانو' کہہ کر بھاگ کر لپٹ جاتی ہے بہت پیاری ہے ماشاءاللہ..... شی از دی موسٹ بیوٹی فل بے بی ان دس ہول ورلڈ مجھے تو لگتا ہے پوری کی پوری اپنے باپ پر گئی ہے..... کوئی بھی نقش تو جینا سے نہیں لیا اُس نے..... بس اسٹائل تھوڑی جینا کی طرح ہے..... ورنہ.....'' وہ کہیں کھو سی گئیں۔

گھنگھریالے خوبصورت براؤن بالوں..... بڑی بڑی پُرکشش براؤن آنکھیں..... اور اپنے گلابی رنگ کی وجہ سے وہ دل میں اتر جاتی تھی۔ پھر اوپر سے باتیں کرنے کا دلنشین بچوں والا توتلا انداز جینا تو ہر دم اُس پر نثار ہوتی رہتی ہے۔

''آپ بہت مس کررہے ہیں نا جینا کو..... تو چلتے ہیں ایک چکر مری کا لگا آئیں؟''

''بھول گئیں..... آج فواد کے اسکول میں ایوارڈ کی تقریب ہے اور ہمارے بیٹے نے کئی ایوارڈ وصول کرنے ہیں۔''

''اوہ ہاں..... میں کیسے بھول گئی.....'' اُس کی آنکھیں بے تحاشا چمک اٹھیں۔

بے اختیار ہی وہ ماضی کے ایک خاص حصے میں پہنچ گئی۔ جب وہ جینا کے ساتھ آزاد کشمیر میں تھی تو جواد وعدے کے مطابق اُس کے ہاسٹل جایا کرتے تھے..... ایک بار اُس نے فون کیا تو فواد کی خوشی سے بھرپور آواز کانوں میں آئی۔

''ماما آج تو کمال ہی ہوگیا.....''

''کیا ہوا؟''

''آج ڈیڈی آئے تھے مجھ سے ملنے..... اور پتہ ہے کیا..... وہ پہلے والے ڈیڈی نہیں تھے نہ ہی مجھے غصے سے گھورا اور نہ ہی ڈانٹا..... بلکہ میری اسٹڈیز کے بارے میں پوچھتے رہے میرے ٹیچرز سے بھی ملے..... جب سب ٹیچرز نے میری بہت تعریفیں کیں تو حیران رہ گئے وہ شاید سمجھتے تھے کہ میں نالائق بچہ ہوں۔''

فواد کی خوشی سے وہ بے انتہا خوش ہوگئی۔ آخر جواد بدلنے لگے تھے۔ وقت بہت ظالم چیز ہے..... سارا دبدبہ سارا طنطنہ ایک ہی کروٹ میں رخصت ہوجاتا ہے۔

فواد سے وہ روزانہ ہی فون پر بات کرتی تھی تاکہ وہ اُداس نہ ہو اور تنہائی محسوس نہ کرے۔ دو ہفتوں کے بعد فواد کے پاس ایک اور حیران کن خبر تھی۔

''ماما گیس واٹ ..... ڈیڈی مجھے میرے سامان سمیت گھر لے آئے ہیں۔ وہ کہنے لگے جب گھر موجود ہے تو ہاسٹل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے..... ڈرائیور روزانہ تمہیں چھوڑ آئے گا.....اور پتہ ہے کیا؟'' وہ بے پناہ پُرجوش ہورہا تھا۔

''کیا میری جان.....؟'' اُس کی اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ڈیڈی پڑھائی میں بھی میری مدد کرتے ہیں..... آج وہ کہہ رہے تھے میں بہت الون ہوں یار کیوں نہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کمپنی دیا کریں..... باتیں کیا کریں۔''

''رئیلی..... دیٹس گریٹ.....''

''دیٹس ناٹ گریٹ ماما..... دیٹس سپر..... آئی ایم سو ہیپی ..... ہم دونوں ڈنر کے بعد بہت ساری باتیں کرتے ہیں۔ ڈیڈی مجھے دنیا کے متعلق بہت سی باتیں سمجھاتے ہیں.....

ایک دن کہنے لگے۔

''یار غور کرتا ہوں تو تم بالکل اپنی ماما کی طرح لگتے ہو..... ماما شاید وہ آپ کو بہت مس کرتے ہیں..... اس لیے کہہ رہے تھے.....'' وہ شریر ہونے لگا۔

ماہا حیران رہ گئی۔ دل خوشی سے بھر گیا۔ دل چاہا خوشی سے پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ لیکن جینا کی وجہ سے خود کو کنٹرول کرنا پڑا.....

''خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' جواد آہستہ آہستہ فواد کو قبول کرنے لگے ہیں۔

''خدایا یونہی میری مدد کرتا رہنا..... مجھے تو بس تیرا ہی آسرا ہے.....'' وہ ماہا سے بھی اُداس ہو رہا تھا۔ روزانہ اُس سے پوچھتا کہ آپ کب آ رہی ہیں۔ میں آپ کو مس کرتا ہوں..... لیکن ڈیڈی کی وجہ سے یہ کمی پوری ہو جاتی ہے۔''

ایک روز وہ بے حد خوش تھا۔

''ماما..... آج ہم بالنگ کے لیے گئے..... میں نے ڈیڈی کو تین بار ہرایا۔ ڈیڈی حیران تھے کہنے لگے یار میں تو اپنے زمانے میں چیمپئن رہا ہوں..... تم نے مجھے بھی ہرا دیا۔''

''جب میں نے بتایا کہ میں اپنے اسکول میں ٹینس اور بولنگ کا چیمپئن ہوں تو بہت خوش ہوئے اسی خوشی میں مجھے آئس کریم کھلانے لے گئے۔ ماما آئی لو یو بٹ یو نو آئی لو ڈیڈی ٹو..... پہلے تو مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ اتنے اچھے ہیں..... اٹ از فن ٹو بی وِد ہم..... ماما آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟.....''

''نہیں بیٹا..... میں کیوں مائنڈ کرنے لگی ایکچو یَلی آئی ایم سو ہیپی فار یو.....''

''او کے ماما پھر کل بات کریں گے..... اصل میں ہم کچن میں جا کر ایک ڈش ٹرائی کرنے لگے ہیں۔''

ماہا حیران رہ گئی۔ جواد اور کبھی کچن میں جائیں..... ایسا اُس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ کیا وہ بہت زیادہ لونلی فیل کر رہے ہیں..... کیا وہ جینا کو مس کر رہے ہیں اس لیے فواد کے قریب ہو رہے ہیں..... یا پھر وہ واقعی اُس سے محبت کرنے لگے ہیں۔

اُس کی موجودگی کی وجہ سے اُس سے مانوس ہونے لگے ہیں۔ جو بھی تھا..... اور جو کچھ بھی ہو رہا تھا اچھا ہی ہو رہا تھا..... خدا کے ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے.....شاید یہ سب اس لیے ہوا کہ میں جینا کے قریب ہو جاؤں اور جواد اور فواد ایک دوسرے کے قریب آ جائیں.....اور پھر ہم چاروں ایک حقیقی فیملی بن جائیں..... جہاں سب ایک دوسرے سے محبت کریں۔'' اس روز پھر فواد پُر جوش اور بے انتہا خوش تھا۔

''ماما اسکول میں سالانہ پیرنٹس ٹیچر میٹنگ ہے..... مجھے بہت فکر تھی کہ آپ تو یہاں ہیں نہیں میرے ساتھ کون جائے گا۔ لیکن میں حیران رہ گیا جب ڈیڈی وقت پر تیار ہو کر باہر آئے اور حیرت بولے۔

(..... جاری ہے.....)

افسانہ

فرح انیس

ملال عمر بھر کا ہے

رباب کو جب یہ اندازہ ہوا کہ گھر سے بھاگی لڑکی
کی کوئی عزت نہیں ہوتی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی

وہ بالکونی میں کھڑی محویت سے آتے جاتے لوگوں کو تک رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو۔'' ارسل کی آواز پر وہ ڈر کے اچھل گئی اور اپنے پیچھے کھڑے ارسل کو دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کے اس طرح ڈرنے پر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں...... میں بس سوچوں میں گم تھی اور آپ اچانک سے آئے تو میں ڈر گئی۔'' وہ ہنس کر کہہ کر اندر کچن کی جانب چل دی۔ وہ بھی اس کے پیچھے آ گیا۔

''کیا کر رہی ہو؟'' اس کو کچن میں مصروف دیکھ کر بولا۔

''رات کے کھانے کے لیے تیاریاں۔'' وہ شوخی سے اس کی جانب دیکھ کر بولی۔

''چلیں آپ اب آفس جائیں اور پلیز رات جلدی گھر آ جایئے گا۔''

''جی میں آ جاؤں گا رات کوئی تیاری کی ضرورت نہیں ہم باہر ڈنر کریں گے اور اپنی شادی کی پہلی سالگرہ کو یادگار بنائیں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''جو حکم جناب کا۔'' اِس کی بات پر وہ مسکرا کر آفس کے لیے سی آف کرنے لگی۔

☆......☆......☆

''کیسا لگ رہا ہے رباب۔'' اِس وقت وہ دونوں شاندار سے ریسٹورنٹ میں بیٹھے اپنی شادی کی پہلی سالگرہ منا رہے تھے۔ وہ موم بتی کی لو کو پکڑتے ہوئے اپنی محبوب بیوی کو دیکھنے لگا۔ جو کالے رنگ کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھی؛ جس پر سفید نگوں کا نفیس کام بنا ہوا تھا۔ شانوں پر دوپٹہ پھیلائے خوبصورت براؤن بالوں کو کندھے پر ایک جانب ڈالے ہلکے ہلکے میک اپ میں غضب ڈھا رہی تھی۔ ارسل کے سوال پر وہ چاکلیٹ کیک کا ایک چھوٹا سا پیس اُٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''میں بیان نہیں کر سکتی اس وقت میری کیا

فیلنگز ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں اس وقت ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔'' وہ خوشی سے لبریز لہجے میں بولی۔

''تھینکس ارسل......''

''Its My Pleasure'' وہ ایک ادا سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا اس کے انداز پر رباب بے ساختہ ہنس دی۔

☆......☆......☆

گھڑی رات کے تین بجا رہی تھی مگر نیند رباب کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ کھڑکی میں کھڑی آج رات کے ڈنر کو سوچ رہی تھی۔ وہ تھک کر وہیں کاؤچ پر بیٹھ گئی اور بیڈ پر سوئے ہوئے ارسل کو دیکھنے لگی۔ خوبرو سا ارسل اس کی اولین چاہت' جس کو پانے کے لیے اس نے ساری دنیا سے ٹکر لی تھی۔ وہ ارسل کو دیکھتے ہوئے ماضی کی تلخ یادوں میں کھوگئی۔

☆......☆......☆

''اس کو کیا ضرورت تھی موبائل لانے کی۔'' وہاب چیختا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں بیڈ پر بیٹھی رباب اپنا اسکول کا ہوم ورک کررہی تھی اور وہیں قریب صوفے پر بیٹھی حسنہ رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ وہاب کے چیخنے پر دونوں ماں بیٹی اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

''کیا ہوگیا وہاب؟'' حسنہ بیٹے کو دیکھ کر بولی۔

''امی میں پوچھ رہا ہوں رباب کے پاس موبائل آیا کیسے؟'' وہاب کے بولنے پر رباب بول پڑی۔

''بھائی میں نے اپنی پاکٹ منی سے لیا ہے اور میں اتنی بھی چھوٹی نہیں' میٹرک کی اسٹوڈنٹ

ہوں۔ میری سب فرینڈز کے پاس موبائل ہیں۔'' رباب دھیمے لہجے میں بولی۔ رباب کی بات پر وہاب غصے سے آگے بڑھا اور اس کی ڈریسنگ ٹیبل سے موبائل نکال کر کمرے سے چلا گیا۔ وہ ماں کو شکایتی نگاہوں سے دیکھنے لگی اور سر جھکا کر بہتے آنسوؤں کو صاف کرنے لگی۔ حسنہ سمجھ گئی کہ یہ اُن کی بہو کی لگائی ہوئی آگ ہے۔ کیونکہ اُن کی بہو عائشہ اور حسنہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ رباب کے پاس موبائل ہے۔

وہ ٹیرس پر کھڑی تھی۔ موسم ابر آلود ہو رہا تھا لگ رہا تھا کسی بھی وقت بادل برسنے لگیں گے۔ وہ چپس کھاتے ہوئے موسم کو انجوائے کر رہی تھی۔

''کس کو دیکھ رہی ہو؟'' وہاب کی آواز پر وہ ڈر کے اچھل گئی۔

''بھائی میں نے کس کو دیکھنا ہے۔'' وہاب کی بات پر رباب ناراضگی سے بولتے ہوئے سامنے روڈ کی جانب دیکھنے لگی۔

''چلو اندر شرم نہیں آتی ٹیرس پر کھڑی ہو' عورت ذات ہو' ہمارے ہاں کے مرد اتنے بے غیرت نہیں کہ اپنی عزت کا نظارا سب کو کرنے دیں۔'' وہ خشمگیں نگاہوں سے اُسے دیکھتا ہوا بولا۔ اس کے انداز پر وہ آنسو پیتی ہوئی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

اندر کمرے میں وہ کھڑکی سے سر ٹکائے برستی بارش کو حسرت سے دیکھنے لگی۔ حسنہ بیٹی کو یوں کھڑا دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔

کیا کہتی کسی سے' نہ شوہر اپنا تھا نہ بیٹے اپنے تھے۔

حسنہ اور احمد علی کے تین بیٹے تھے سب سے بڑا رجب جو سعودی عرب میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ مقیم تھا۔ اس سے چھوٹا وہاب جس کی دو ماہ پہلے شادی ہوئی تھی پھر عامر تھا۔ جو یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور سب سے چھوٹی اور اکلوتی بیٹی رباب تھی جس نے ابھی میٹرک کیا تھا اور اب کالج میں تھی۔ احمد علی اور ان کے تینوں بیٹے پڑھے لکھے تھے۔ بظاہر ان کا گھرانا اچھا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا لگتا تھا مگر یہ رباب اور حسنہ جانتی تھیں کہ ان کے گھر کے مرد کس قدر شکی مزاج ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ رباب کو اپنی زندگی بھی خود پر تنگ محسوس ہوتی۔ وہ باپ بھائی کے شکی رویے سے بہت عاجز ہو چکی تھی۔ انٹر کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اسے کافی پاپڑ بیلنے پڑے۔ ان ہی دنوں رباب کی پھوپو نے حسنہ سے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے روحیل کے لیے رباب کا ہاتھ مانگا۔ روحیل پڑھا لکھا خوبرو لڑکا تھا۔ مگر رباب کو اپنے خاندان کے ہر مرد سے نفرت اور چڑ ہوگئی تھی۔ اس کو لگتا تھا اس کے خاندان کا ہر مرد ہی شکی ہے۔ اس نے روحیل سے خود بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے بتا دیا کہ وہ مر جائے گی پر اس سے شادی نہیں کرے گی۔ روحیل جو رباب کو اپنی اولین چاہت بنائے بیٹھا تھا اس کے انداز پر اس کے اندر کچھ ٹوٹ کر رہ گیا۔

یونیورسٹی میں ماسٹر کا فائنل ایئر تھا اور اب احمد علی چاہتے تھے کہ رباب کی پڑھائی مکمل ہوتے ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔ ان ہی دنوں رباب کی ارسل سے نیٹ پر دوستی ہوگئی۔ وہ اس دوستی کو دوستی رکھنا چاہتی تھی۔ مگر ارسل اس دوستی کو مضبوط تعلق بنانا چاہتا تھا۔ رباب جانتی تھی ایسا کبھی نہیں ہوسکتا اس کی اس بات سے گھر میں ایک کہرام آ جائے گا۔ مگر ارسل بضد تھا اس نے اپنی امی اور بہن کو رباب کے گھر رشتے کے لیے بھیجا۔ احمد علی کے پوچھنے پر کہ آپ رباب کو کیسے

جانتی ہیں۔ جس پر بڑا سوچ کر انہوں نے جواب دیا تھا کہ رباب میری بیٹی کی دوست ہے کیونکہ انہیں ارسل نے سب سمجھا دیا تھا۔ ان کے اس جواب پر احمد علی آپے سے باہر ہو گئے کہ آپ کا بیٹا ایک نمبر کا بے غیرت ہے۔ بہن کی دوستوں پر نظر رکھتا ہے۔ ارسل کی ماں بولتی رہ گئیں کہ میرے بیٹے نے آپ کی بیٹی کو نہیں دیکھا مجھے آپ کی بیٹی پسند ہے مگر انہوں نے دونوں ماں بیٹی کی بے عزتی کر کے انہیں گھر سے نکال دیا۔ حسنہ ایک کونے میں کھڑی لب کاٹتی اور آنسو پیتی رہ گئی۔ رباب کے سر پر ایک جنون سوار ہو گیا تھا ارسل کے نام کا۔ اس کو بہت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا اپنے باپ کے رویے کی وجہ سے۔ اس کے باپ نے اس کی بات کہیں اور طے کر دی تھی مگر ایک رات خاموشی سے رباب ارسل کے پاس چلی گئی اور نکاح کر کے دونوں کچھ دن بعد دبئی چلے گئے۔ یہ انسانی فطرت ہے جس چیز کو جتنا دبایا جاتا ہے وہ اتنا ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وقت بہت حسین گزر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے شادی کے دس سال گزر گئے مگر رباب اور ارسل اب تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔

کبھی کبھی رباب اولاد کے لیے بے بسی سے رو پڑتی مگر ارسل اسے بہت محبت سے سمجھایا کرتا تھا کہ یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ جب اس کا حکم ہو گا ہو جائے گی۔ ارسل کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ آج بھی اس سے ایسی ہی محبت کرتا تھا۔ وہ ابھی بھی اس کے لیے ویسا ہی جنونی تھا۔ رباب اپنے نصیب پر جتنا شکر کرتی کم تھا مگر اولاد کی کمی اسے بے چین کر جاتی تھی۔

شادی کے اوائل دنوں میں وہ اکثر ڈر جاتی تھی۔ ارسل کو دیکھ کر اس کو یہی خوف لاحق ہوتا تھا کہ کہیں ارسل بھی اس کے باپ اور بھائی جیسا نہ ہو۔ مگر شادی کے دس سال بیت جانے کے بعد بھی ارسل اس کی سوچ سے زیادہ اچھا نکلا۔ رباب اپنے کیے گئے فیصلے پر مطمئن تھی۔

☆......☆......☆

پچھلے ایک ہفتے سے ارسل کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس نے آفس سے چھٹی لی ہوئی تھی۔ رباب کچن کا کام نمٹا کر اندر کمرے کی جانب گئی۔ جہاں ارسل سو رہا تھا۔ گھڑی پر نگاہ پڑی تو گھڑی ڈیڑھ بجا رہی تھی۔ وہ تیزی سے ٹیرس کی جانب بھاگی اور وہاں جا کر سامنے بنے اسکول کو دیکھنے لگی، تھوڑی دیر میں اسکول کا گیٹ کھلا اور ایک تیس بتیس سال کی عمر کا مرد نکلا۔ ایک تین سے چار سال کی عمر کے بچے کی انگلی پکڑے۔ وہ کس قدر محویت سے ان کو دیکھ رہی تھی کہ ارسل کے آنے کی بھی اُسے خبر نہ ہو سکی۔

''کیا دیکھ رہی تھیں؟'' ارسل کی آواز پر اس کی محویت ٹوٹی۔

''کچھ نہیں ایسے ہی۔'' وہ آنکھ میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے بولی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے نوٹ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے رباب اس سے ناشتے کا پوچھتی ارسل کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور رباب کے چہرے پر نقش چھوڑ گیا۔ رباب حق دق ارسل کی جانب دیکھنے لگی۔

''تمہیں شرم نہیں آتی تم پچھلے ایک ہفتے سے اس مرد کو دیکھ رہی ہو۔'' ارسل کی بات پر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگی۔ اس کو لگا اس نے سننے میں کوئی غلطی کر دی ہو۔ شادی کے بعد سے وہ جس لمحے سے خوفزدہ ہوتی تھی وہ آج شادی کے دس سال بعد آیا تھا۔ ارسل کی بات پر اسے لگ رہا تھا جیسے وہ تپتے صحرا میں کھڑی ہو۔

رباب تھکے تھکے قدموں سے اندر کمرے کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

شادی کے دس سال میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ دونوں کے درمیان پچھلے دو ہفتوں سے خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو رباب کے طلاق کے مطالبے نے توڑا تھا۔ ارسل رباب کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔ اس کو رباب سے اس مطالبے کی توقع نہ تھی۔ ارسل طلاق دینے پر راضی نہ تھا مگر رباب کی ضد تھی کہ اس کو طلاق چاہیے۔ کچھ بھی تھا رباب ارسل کی چاہت تھی۔ وہ اس کو چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہ تھا۔ وہ جانتا تھا اگر اس نے طلاق دے دی تو وہ کہاں جائے گی کیونکہ وہ اپنی واپسی کی تمام کشتیاں جلا کر ارسل کے ساتھ آئی تھی۔ رباب کے ماں باپ مرچکے تھے اور بھائی رباب سے ملنے پر راضی نہ تھے۔ ارسل نے اکثر راتوں کو اُسے اپنے رشتوں کے لیے روتا دیکھا تھا۔

''رباب میری بات سنو۔'' وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی کہ وہ اس کے برابر آ کر کھڑا ہوگیا۔

''جی بولیے۔'' وہ وہیں کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''کیا تم مجھے معاف کردو گی۔'' رباب اس کی بات پر اُسے چپ چاپ دیکھنے لگی۔ اس کو خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔

''رباب کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتیں۔''

''معاف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ارسل صاحب...... طلاق لے کر میں جاؤں گی بھی کہاں؟'' وہ زخمی ہنسی ہنس دی۔

''میں تو ہوں ہی قصوروار میری ہی ساری غلطیاں ہیں۔'' اس کی بات پر وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

''میری غلطی یہ تھی کہ میں گھر سے بھاگی۔ بھلا گھر سے بھاگنے والی لڑکی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ اس کو تو اس کا شوہر بھی عزت نہیں دیتا۔'' وہ ارسل کی جانب دیکھ کر استہزائیہ انداز میں بولی۔

''اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں تھا اگر میرے گھر کا ماحول ایسا نہ ہوتا تو میں کیوں باہر محبت ڈھونڈتی۔ اگر مجھے میرے گھر میں اعتبار ملتا تو میں اس طرح بے اعتبار تھوڑی ہوتی۔ جس شخص کو میں دیکھتی ہوں اس سے میرا بہت گہرا اور پرانا رشتہ ہے ارسل صاحب' ارسل رباب کی بات پر اس کو دیکھنے لگا۔ وہ شخص کوئی اور نہیں میرا ماں جایا میرا بھائی عامر تھا۔ اس کی گود میں میرا بھتیجا یعنی میرا خون تھا۔ اس کی گود میں اس کے بیٹے کو دیکھ کر میرے اندر کی مامتا روتی تھی کہ اگر میرا بھی بچہ ہوتا تو تم بھی اس کو یوں اسکول چھوڑ کے آیا کرتے۔'' رباب کی بات پر ارسل کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔

''میں طلاق لے کر جاتی بھی کہاں؟ نہ کوئی ٹھکانہ نا کوئی اپنا' ماں باپ ناراض ہی چلے گئے مجھ بدنصیب سے' بھائی راضی نہیں۔ ایک تم تھے ارسل جس کو دیکھ کر میں جیتی تھی جس کو دیکھ کر رب کا شکر کرتی تھی مگر آج وہ اعتبار جو تم نے مجھے ان دس سالوں میں بخشا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ تمہارا شک ان دس سالوں کی محبت کو کھا گیا۔ وہ روتی ہوئی بولی۔

''اب شاید وہ بات نہ رہے جو پہلے تھی۔ میں نہیں جانتی کہ کتنا وقت لگے گا سب صحیح ہونے میں اعتبار کے آئینے میں بال آ گیا ہے ارسل۔''

وہ یہ کہہ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور کمرے سے باہر چلی گئی ارسل کو زندگی بھر کا ملال دے کر۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

اُم مریم

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے

عورت کی عزت نفس پر لکھی گئی ایک خوبصورت تحریر جو اس کو مشین سمجھنے والے مردوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے

حوریہ کمال سمیت وہ چار بہنیں تھیں۔ بڑی تینوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ چونکہ تینوں ہی خوبصورتی اور حسن میں بے مثال تھیں جبھی بی بی جان نے دامادوں کا چناؤ کرتے ہوئے حسن کو خصوصی اہمیت دی تھی۔ تینوں داماد ہی ماشاء اللہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھے۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے بلکہ بہت اچھے خاندان سے تعلق بھی رکھتے تھے۔ اب شادی کی باری حوریہ کمال کی تھی اور حوریہ جو بہنوں کے بقول صرف نام کی حوریہ تھی اور بی بی جان اور بابا جان نے جانے کیا سوچ کر اُس کا نام حوریہ رکھ دیا تھا۔ سانولی رنگت کے ساتھ حوریہ نام مذاق بنانے والی بات نہیں تھی تو کیا تھا۔

جبکہ بی بی جان حسین وجمیل بیٹیوں کو نپٹا کر اب اُس کی طرف سے خاصی فکر مند رہنے لگی تھیں۔ باعث تشویش بات یہی تھی آخر اتنی دبتی ہوئی رنگت کے ساتھ اسے کون بیاہنے آئے گا؟"

بڑی دونوں تو مشکل تعلیم مکمل کر پائی تھیں کہ شادی ہوگئی بلکہ چھوٹی تو دوران تعلیم ہی اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ جبکہ یہ حوریہ تھی گریجویشن تک کر چکی اور کسی نے ابھی تک آ کر پوچھا تک نہیں تھا۔ مایوسی کے ساتھ ہر گزرتے دن کے ساتھ گھبراہٹ بھی بی بی جان کو گھیرتی جا رہی تھی۔ البتہ بابا جان اس فکر سے آزاد تھے۔ انہیں اپنی یہ چھوٹی اور نازک سی بیٹی کچھ زیادہ ہی عزیز تھی جس کی وجہ اس کی یہ کمی کی وجہ سے بھی وہ اس کے لیے زیادہ حساس تھے۔ اکثر و بیشتر اس کے اس احساس کو کم کرنے کی کوشش کرتے کو غیر محسوس انداز میں اُس کی خوبیوں کو اجاگر کرتے رہتے۔

کبھی اس کے لانبے گھنیرے بالوں کی ستائش تو کبھی اس کے سانولے چہرے پر چھپی ملاحت ومعصومیت کے تاثر کی سمت بی بی جان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کرتے۔

"ہماری حوریہ کے چہرے پر جو نکھار ہے یہ اُس کے خوبصورت دل اور بے ریا فطرت کی عطا ہے۔"

تب بی بی جان اسے ایک نگاہ تکتیں تو شریک حیات کی بات پر ایمان لے آتیں مگر لوگ تو اس خالص پن معصومیت کے نہیں رنگ و روپ کے مداح تھے جبھی تو ابھی تک اس کا ایک بھی رشتہ نہیں آیا تھا۔

وہ ٹھنڈا سانس بھرتیں اور دل ہی دل میں اس کے اچھے نصیب کے لیے دعا گو ہو جاتیں۔ یقیناً اُن کی دن رات مانگی گئی دعائیں مقبول ہوئی تھیں۔ بڑی آپا کے توسط سے آنے والی وہ سوبر سی خاتون حوریہ کو دیکھتے ہی گویا فریفتہ سی ہو گئیں۔ انہیں بھی حوریہ کے چہرے کی وہی معصومیت اور ملاحت بھا گئی تھی جس کے متعلق بابا جان اکثر کہا کرتے تھے مگر بی بی جان کبھی یقین نہ کر پائیں مگر شائستہ بیگم کی زبانی سنا تو ایمان لانا پڑا۔

☆......☆......☆

رشتے کی بات طے ہوئی تو بڑی آپا کے ساتھ آپی اور اپیا دونوں اپنے اپنے میاؤں کے ساتھ شہیر کو دیکھنے گئیں۔ اور واپسی پر اُن کی گفتگو میں سب سے زیادہ ذکر شہیر کی غیر معمولی خوبصورتی کا تھا۔ منگنی کی تقریب کے لیے تینوں بہنیں اپنے بچوں سمیت اکٹھی ہوئیں تو شہیر کی ذات موضوعِ گفتگو ٹھہری۔

''بھئی میں تو مان گئی حوریہ کے نصیب کو' بی بی جان کے تینوں داماد کیا کم تھے کہ یہ چوتھے شہیر ملک نکلے۔ یقین کرو میں تو اسے پہلی بار دیکھ کر گنگ سی ہو گئی تھی۔''

یہ آپا تھیں جو اس بات پر خاصی مغرور رہنے لگی تھیں کہ حوریہ کے لیے اتنا اچھا بر وہی ڈھونڈ لائی ہیں۔ تینوں داماد اگر ایک سے بڑھ کر ایک تھے تو بیٹیاں بھی تو کم حسین نہیں تھیں۔ آپ نے اتنا خوبصورت لڑکا ڈھونڈتے وقت حوریہ کی عام سی شکل و صورت کو کیوں اگنور کر دیا تھا۔

اپیا نے اپنے مخصوص اکل کھرے انداز میں ناک چڑھا کر کسی قدر نخوت سے کہا تو آپی نے بے اختیار ٹھوکا دے کر گویا کچھ فاصلے پر بیٹھی حوریہ کی موجودگی کا انہیں احساس دلانا چاہا تھا جس کا چہرا اس بات پر ایکدم دھواں دھواں سا ہو گیا تھا۔ مگر اپیا پر ذرا جو اثر ہوا ہو۔ مکھی اڑانے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولیں۔

''ہاں تو غلط بات تھوڑا ہی کر رہی ہوں...... اسے خود بھی تو علم ہے کہ وہ کتنی عام سی شکل صورت کی مالک ہے۔'' پھر مزید گوہر افشانی کرتے ہوئے اسی بے حس سے انداز میں بولی تھیں۔

''بھئی اگر لڑکا خود اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے تو فطری سی بات ہے ویسی ہی بیوی کی خواہش بھی ہو گی یہ بھی عین ممکن ہے محترم ہماری فیملی کی خوبصورتی سے دھوکہ کھا گیا ہو کہ حوریہ بھی ایسی ہی ہو گی۔''

اپی اکی زبان کی دھار ہمیشہ کی طرح بہت بے دردی سمیت حوریہ کے دل کو چیر گئی۔ ضبط سے سرخ پڑتے چہرے سمیت وہ ہونٹ بھینچے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اپیا اس قسم کی باتیں اکثر کیا کرتیں اور بڑے دھڑلے سے...... بقول ان کے وہ سچی اور کھری بات کرنے کی عادی تھیں۔ اور انہیں اپنی یہ عادت بہت پسند بھی تھی۔

''تمہیں نہیں لگتا کل کلاں کوئی خرابی ہو تو نقصان تب زیادہ ہو گا......'' اپیا بہت سفاکانہ رائے مانگ رہی تھیں۔ حوریہ کی قوتِ برداشت نے جواب دیا تو آہستگی سے سب کے بیچ سے اٹھ گئی آنسو اک بار پھر اس کے گال بھگوتے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

اپیا کی باتوں کی تلخی بہت دنوں تک اس کے اندر سے نہیں نکل سکی۔ منگنی کے بعد شادی میں

زیادہ ٹائم نہیں تھا۔ اس کے سسرالیوں کو شادی کی جلدی تھی۔ یوں بھی بابا جان نے ہر قسم کی چھان بین کے بعد ہی ہاں کی تھی۔ جبھی زیادہ تاخیر انہوں نے بھی مناسب نہیں سمجھی۔ اگلے چند دنوں میں ہی گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں بہت سے کام تھے۔ جوڑوں کی ٹنکائی، فرنیچر کپڑوں کے علاوہ اور لاتعداد چیزیں جو خریدنا تھیں۔ تقریباً ہر روز ہی بازار کا چکر لگتا اور یہ سب کام آپا کے ہی سپرد تھے۔ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد معمول کے کام نپٹاتی اور رات گئے جب سونے کو لیٹتی تو نا چاہتے ہوئے بھی کتنے ہی روپہلے خواب آپ ہی آپ آنکھوں میں اتر آتے...... ایسی ہی صبحوں شاموں کے بیچ اس کی شادی کا دن بھی آن پہنچا۔

بے حد اسٹائلش پنک کامدار لہنگے میں میچنگ کے زیورات اور میک اپ کے بعد مکمل تیاری کے بعد جب اسے آئینے کے سامنے لایا گیا تو ایک پل کے لیے وہ خود بھی متحیر سی اپنی یہ چھب دیکھتی رہ گئی۔ ہمیشہ سادہ رہنے والا اس کا چہرا اس سج دھج کے ساتھ گویا ایک دم جگمگا اٹھا تھا۔

اس کے عروسی لباس پر بھی خاص پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آپی اس کے لیے میرون یا ریڈ کلر پسند کر رہی تھیں جبکہ اپیا کا خیال تھا یہ کلر اس کی سانولی رنگت پر سوٹ نہیں کرے گا۔ اسپیشلی میرون کلر تو بالکل نہیں یہ کون سا بہت گوری چٹی ہے کہ ہر رنگ میں سج جائے۔'' اُن کا بات کرنے کا وہی مخصوص انداز تھا جو وہ حوریہ کے لیے بطورِ خاص اپنا چکی تھیں۔

جبکہ حوریہ کو ذاتی طور پر پنک کلر پسند تھا اور جانے کیسے اس نے یہ اظہار بھی کر ڈالا اپیا تو پیچھے پڑ گئیں تھیں اس کے......

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا...... پنک کلر پہن کر مذاق اڑوانا ہے؟ پتہ بھی ہے یہ صرف بے تحاشہ گوری رنگت والوں پر ہی جچتا ہے۔''

اُن کے لہجے میں موجود تضحیک اور تمسخر کے احساس نے حوریہ کی پیشانی سلگا ڈالی تھی۔ کچھ بھی مزید کہے بنا وہ پھیکی رنگت سمیت وہاں سے چلی گئی تھی۔ اب یہ اللہ جانے کہ آپا کو خیال آیا تھا یا پھر بی بی جان تک یہ بات پہنچی تھی کہ اس سے اگلے ہی دن بہت ہی اسٹائلش قسم کا پنک لہنگا اس کے لیے لایا گیا تھا۔ اب جبکہ وہ پارلر سے گھر لائی گئی تو جہاں اپیا اسے دیکھ کر ایک پل کو ہونق ہوئی تھیں وہاں بی بی جان نے بے ساختہ اس کی نظر اتاری تھی۔ مگر اپیا نے بہر حال اپنی کھسیاہٹ کچھ اس طرح سے دور کی تھی۔

''ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں کا کمال ہے...... جبھی تو اپنی حوریہ بھی آج پہچانی نہیں جا رہی...... اب خدا کرے شہیر کی آنکھوں پر اس کا آج کا یہ روپ ایسا چڑھے کہ بعد کی اصلیت فراموش ہی کر دے۔''

وہ دل جلانے والی مسکراہٹ سمیت کہتی اپنے بیٹے کی پکار پر کمرے سے چلی گئیں۔ نکاح کے بعد جب اسے شہیر کے مقابل لا کر بٹھایا گیا تو اس کا دل اتنی سرعت سے دھڑک رہا تھا گو پسلیاں توڑ کر باہر آ گرے گا۔

ایک دو بار اس نے گھونگھٹ کی چلمن سے نگاہ اٹھائی تو شہیر کو دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ بلاشبہ وہ ان تمام تعریفوں سے کہیں بڑھ کر شاندار تھا جو بی بی جان یا تمام بہنیں اس کی کر چکی تھیں۔

☆......☆......☆

جس قدر خلوص اور پیار سے اسے مانگا گیا تھا اس کا سسرال میں استقبال میں اس سے کہیں

بڑھ کر والہانہ محبت اور چاہت سے کیا گیا۔ شہیر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اسی وجہ سے اسے بھی اسی لحاظ سے اہمیت سے نوازا گیا۔ ڈرائیو روے سے ان کے بیڈروم کے راستے تک کو پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ مووی کیمروں کی چکا چوند نے اس کا دمکتا ہوا روپ مزید جگمگا ڈالا۔ جب اسے شہیر کے کمرے تک پہنچایا گیا تو کچھ دیر تلک مختلف رسموں کی ادائیگی ہوتی رہی۔ پھر اس کی تھکن کے خیال سے ماما (شہیر کی والدہ) نے لڑکیوں کو کمرے سے باہر بھیج دیا اُن کا اندازِ گفتگو اتنا دھیما اور مشفقانہ تھا کہ کسی کے مائنڈ کرنے کی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔ حوریہ نے اس احسان پر ممنون و مشکور نگاہوں سے انہیں تکا تو انہوں نے اپنائیت بھری مسکان سمیت جھک کر پہلے اس کی پیشانی چومی پھر دعاؤں سے نوازنے کے بعد دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔

''شہیر اکلوتا ہونے کی وجہ سے کچھ موڈی اور اگریسو سا ہو گیا ہے۔ تمہاری طبیعت میں جو سادگی معصومیت اور دھیما پن ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے شہیر کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے کہ اسے سمجھدار اور کول نیچر لڑکی ہی سوٹ کرتی تھی۔ مجھے یقین ہے تم اسے بہتر طریقے سے سنبھال لو گی۔ میری تمام دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ چلی گئیں جبکہ حوریہ اُن کی بات کو سمجھنے کی کوشش میں کس قدر اُلجھ گئی تھی۔

صرف خوبصورت ہی نہیں موصوف مغرور بھی بے حد ہیں۔ اونہہ پتہ نہیں کیا سمجھ رہا تھا خود کو ٹھیک سے بات بھی نہیں کی۔''

شہیر کو دیکھ کر آنے کے بعد اپیا نے جو پہلا تبصرہ کیا تھا وہ یہی تھا۔ اُن کا غصہ دیکھ کر بھی حوریہ نے تب اس بات کو اس لیے بھی اہمیت نہیں دی تھی کہ اسے اپیا کے مزاج سے آگاہی تھی کہ وہ ہر بات کا منفی پہلو ہی مدِ نظر رکھا کرتی تھیں پھر اب تو مقابل تھا بھی حوریہ کا حوالہ......

مگر اب اسے ایکدم سے اپیا کی بات یاد آئی تو بے چینی کا احساس رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا کہ کچھ اسی قسم کے الفاظ آپی نے بھی کہے تھے تھوڑی سی ردوبدل کے ساتھ مگر دبے ہوئے انداز میں بی بی جان کے سب سے چھوٹے داماد کی پرسنالٹی جتنی امپریسو ہے اس سے کہیں بڑھ کر پراوڈ ہے۔ مجھے تو اس کا انداز بھی عجیب محسوس ہوا یوں جیسے یہ سب مارے بندھے مجبوراً کر رہا ہو۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کے خیالات کا تسلسل بکھر گیا۔ انزنٹی کی مسحور کن مہک کے ماحول میں چھاتے ہی وہ سر اونچا کر کے دیکھے بنا بھی جان سکتی تھی آنے والا کون ہو سکتا ہے۔ اس کی دھڑکنوں میں ایکدم بھونچال سا اٹھ کھڑا ہوا جو پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ دروازہ لاک ہونے کی ہلکی آواز ابھری اس کے بعد جامد خاموشی چھا گئی۔ حوریہ دھڑکتے دل سمیت گھبراہٹ آمیز تجسس کے ہمراہ اس کی منتظر تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ہمراہ انتظار طویل ہوا تب اس نے لرزتی پلکوں کی جھالریں اُٹھائیں تو اسے صوفے پر نیم دراز پوری توجہ سے اپنی سمت تکتے پاکر دھک سے رہ گئی۔ بلیک ٹو پیس میں اس کی صرف بائٹ ہی نمایاں نہیں ہو رہی تھی اس کی شفاف دمکتی رنگت بھی بہت جچ رہی تھی۔ سرخ ٹائی ڈھیلی ہو کر گلے میں جھول رہی تھی کوٹ گود میں دھرا تھا اور ہونٹوں کے درمیان سلگتا ہوا سگریٹ حوریہ اس سے زیادہ اس کا جائزہ نہیں لے پائی۔ معاً وہ اٹھا اور چلتا ہوا اس کے نزدیک آ گیا۔

انرٹی کی مہک اس کے حواسوں پر چھا گئی۔ اس کی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا کہ حوریہ بے اختیار دہل کر اپنی جگہ سمٹ گئی۔

''ہر عام سی سوچ رکھنے والی لڑکی طرح تم بھی میری طرف سے کسی تعریف کی منتظر ہوگی؟'' بھاری گھمبیر دلفریب لہجہ اس کے آس پاس گونجا...... اس نے جھکا ہوا سر مزید جھکا لیا۔

''لیکن سوری میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے...... نا ہی میں تمہیں کوئی رونمائی گفٹ دوں گا کہ میں نے ایسا کوئی تکلف ضروری خیال نہیں کیا۔''

اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگشت شہادت رکھ کر اس کا چہرہ اٹھا کر بغور تکتا ہوا وہ عجیب سے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ حوریہ اس کی قربت کی تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں سختی سے میچ گئی۔

''بہت شوق تھا ماما کو تمہیں بہو بنانے کا...... بہت خوش ہیں وہ اپنے اس کارنامے پر اور شاید تم بھی...... چچ چچ...... تمہاری تو یہ خوشی بہت عارضی ثابت ہوگی اور ماما بھی پچھتائیں گی۔''

معاً وہ ایکدم رکا پھر اس کی سمت جھک کر رازداری سے سرگوشی میں بولا تھا۔

''سنو! ابھی میں جیسا بھی ریلیشن تم سے قائم کروں اسے ماما سے ضرور شیئر کرنا پوری جزئیات کے ساتھ......'' حوریہ کے اعصاب کو جھٹکا لگا اس نے ایکدم پوری آنکھیں کھول کر تحیر سے اسے دیکھا تو وہ اس کی پھٹی پھٹی سی آنکھوں میں جھانک کر اطمینان سے مسکرایا تھا۔

''آف کورس انہیں بھی پتہ چلے کہ جیت کر ہارنا کیسا ہوتا ہے اور ہارنے والے کیسے جیت جایا کرتے ہیں۔'' حوریہ کو یہ مبہم بات سمجھ نہیں آ سکی تھی وہ سمجھ بھی نہ سکی تھی کہ شہیر نے اٹھ کر لائٹس آف کر دی تھیں۔

☆......☆......☆

اگلی صبح اس کے لیے تمام تر خوبصورتی کے باوجود بے حد بھیانک ثابت ہوئی تھی۔ باتھ لینے کے بعد وہ ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر دھندلائی ہوئی نظروں سمیت اپنے نوچ کھسوٹے عکس کو تکنے گئی تھی۔ گزشتہ رات کے متعلق وہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کی سہاگ رات ہی تھی، جبکہ اسے تو اپنا آپ کسی دلہن یا سہاگن سے زیادہ لوٹ کا مال زیادہ لگا تھا۔ وہ اگر چاہتی تب بھی کسی سے اس شرمناک سلوک کے متعلق کچھ نہ کہہ پاتی۔ جیسا رویہ وہ اس کے ساتھ روا رکھ چکا تھا۔ اس کے متعلق سوچ کر ہی حوریہ کی روح کانپ رہی تھی۔ شہیر کے اس انتہائی سفاکانہ اور منافقانہ رویے کی وجہ جو بھی تھی حوریہ کے لیے یہ تصور ہی بے حد ہولناک تھا کہ وہ آنے والی راتوں میں بھی اگر اس قسم کی درندگی کا مظاہرہ کرنے والا ہے تو وہ کیا اس کا یہ ظلم برداشت کر پائے گی؟

دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی زور سے اپنی جگہ اچھل گئی۔ تیزی سے دھڑک اٹھنے والے دل پر ہاتھ رکھے وہ اس سوچ میں پڑ گئی۔ کیا اسے دروازہ خود کھولنا چاہیے؟ جبکہ دستک بدستور ہو رہی تھی۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو وہ ضرور اٹھتا یقیناً وہ سو رہا تھا۔ اس کا جی نہیں مانا کہ نگاہ پھیر کے اسے ایک نظر بھی دیکھے آہستگی سے اپنی جگہ چھوڑ کر آگے بھی اور دروازہ کھول دیا۔ ماما تھیں جنہوں نے مسکرا کر سب سے پہلے اس کی پیشانی چومی تھی پھر سلام میں پہل کی۔

وہ انہیں دیکھ کر اتنا گھبرائی کہ سلام کا خیال ہی نہ آیا کھسیا کر انہیں سلام کا جواب دیا تھا۔

''تیار ہوگئیں تم اچھی بات ہے ایسا کرو بیٹا!

شہیر کو بھی جگا دو...... تمہارے گھر والے ناشتہ لے کر آ گئے ہیں۔ اس کے نکھرے دھلے دھلائے سراپے پر نگاہ ڈال کر وہ بے حد طمانیت سے بولیں حوریہ سر جھکائے ہاتھ مسلتی رہی ۔ اس کے اضطراب کو انہوں نے پایا تھا اور چونک گئی تھیں۔

''کیا ہوا بیٹا! اتنی چپ کیوں ہو؟''

وہ جیسے ٹھٹک کر اس کی شکل سے کچھ اخذ کرنے لگیں۔ حوریہ کا دل بھر آیا۔ ہونٹ کانپنے لگے اس کا جی چاہا ایک پل کی تاخیر کے بنا انہیں ان کے بیٹے کی درندگی کا تمام قصہ بنا ڈالے مگر ایسا تو شاید وہ عمر بھر بھی نہ کر پائی۔ کیسے کن الفاظ میں کہتی وہ اتنی بے حجاب ہی نہ تھی۔ اس سے قبل کہ ماما کچھ مزید سوال کرتیں آپا اور آپی ملازمہ کی معیت میں وہیں چلی آئیں۔ ماما انہیں باتیں کرنے کا مشورہ دیتیں اور ناشتہ یہیں بھیجنے کا کہتیں کمرے سے چلی گئیں۔ شہیر ہنوز سو رہا تھا مگر آپا وغیرہ کی آوازوں پر کچھ دیر بعد ہی ڈسٹرب ہو کے اٹھ بیٹھا۔ اور اگلے ہی لمحے سپاٹ چہرے سمیت بغیر سلام دعا رسمی علیک سلیک کے اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔

اور حوریہ جو بڑی دقتوں سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ شہیر کی اس بداخلاقی کے مظاہرے پر جیسے پھر سے بکھرنے لگی۔

جبکہ آپا کی سوالیہ نگاہیں تحیر سمیٹے اسی پر آن ٹھہری تھیں جو سر جھکائے ہونٹ سختی سے بھینچے بیٹھی تھی۔ حوریہ شہیر کا رویہ تمہارے ساتھ کیا تھا؟

آپا کے سوال پر حوریہ کا متغیر چہرہ ایکدم سے سفید پڑ گیا۔ اسے لگا جیسے اسے کسی نے بیچ بازار عریاں کر ڈالا ہو۔

''رونمائی میں کیا ملا؟''

آپی کا دھیان اس کی سمت نہیں تھا۔ وہ اس کے زیورات دیکھ رہی تھیں۔ حوریہ کے پاس اُس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔

''ارے حوریہ! یہ کیا ہوا ہے؟'' معاً اُس کا دوپٹہ سرکا تھا اور آپا کی زیرک نگاہ سے اس کی گردن کا وہ زخم چھپ نہیں پایا تھا جو رات شہیر کی وحشت کی ایک علامت بن کے ٹھہر گیا تھا۔ حوریہ تو متوحش ہوئی آپا کی بھی جان ہوا ہو گئی تھی۔ ہزار ہا احتیاط کے باوجود وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ آنسو پلکوں کی باڑیں پھلانگ بھی نہ پاتے تھے کہ اس نے ایکدم خود کو کنٹرول کر لیا۔ عیاں ہونے کی صورت میں جو وضاحتیں طلب کی جاتیں اُن کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

''ک...... کچھ نہیں کچھ بھی نہیں......''

وہ کچھ اس طور پر متوحش ہوئی کہ گردن کے گرد دوپٹے کی بکل مارتے ہوئے بے اختیار پیچھے سرک گئی۔

''کیسے کچھ نہیں اِدھر آؤ' دیکھوں تو کیا ہوا ہے؟'' آپا کو یکایک بہت ساری تشویش نے آن لیا۔ حوریہ کو جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

''کچھ نہیں ہے نا آپا کہا ہے نا۔ رات زیورات اتارے بغیر سو گئی تھی۔ نیکلس گلے میں چبھنے سے نشان بن گیا۔

جس طرح اُس نے نظریں چرا کر کہا تھا اس پر آپا کا شک مزید گہرا ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے مگر جانے کیا سوچ کر اس کا پیچھا لینے کی بجائے بس معمولی سا ہی اسے ڈانٹنے پر اکتفا کیا تھا۔

''کیا ضرورت تھی زیورات سمیت سونے کی خیال کرنا چاہیے تھا اب بچی تھوڑا ہی ہو تم کہ اس قسم کی لاپرواہی کی؟ ذرا بتاؤ دلہن کو ایسی بے احتیاطی کرنی چاہیے؟''

اسی پل شہیر دروازہ کھول کر تولیے سے سر کے

گیلے بال خشک کرتے ہوئے کمرے میں آ گیا۔ آپا کی بات پر اس نے قدرے ٹھٹک کر پہلے انہیں پھر حوریہ کو دیکھا اور اگلے لمحے نارمل تاثرات کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کی سمت بڑھ گیا۔ اور جب ناشتے کے وقت وہ دونوں کمرے میں اکیلے ہوئے شہیر نے اس کے برابر نشست سنبھالتے ہوئے بہت گہری نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے متبسم لہجے میں کہا تھا۔

''بہت سمجھداری کا مظاہرہ کیا تم نے ورنہ میرا تو کچھ نہ بگڑتا تم ضرور بے چاری مشہور ہو جاتیں۔'' اسکی مہکی مہکی نم زلفوں سے کھیلتے ہوئے وہ اس پل اپنے گھناؤنے روپ کے ہمراہ اتنا برا لگا تھا کہ دل ایکدم ہر شے سے اچاٹ ہوا تو ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ بھی واپس رکھ کر اپنے اور اس کے بیچ فاصلہ بڑھا دیا۔ جبکہ شہیر نے خوب اچھی طرح سے ناشتہ کیا تھا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد وہ اٹھ کر ایک بار پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ حوریہ کو جتنی اُلجھن اس کی موجودگی سے تھی اس سے کہیں بڑھ کر خود پر اٹھتی اس کی نظروں اور ان نظروں سے چھلکتی مسکراہٹ سے ہو رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو یا اسے غائب کر دیتی نہیں تو خود کہیں اس کی پہنچ سے دور بھاگ جاتی۔ ماما کو کتنی مایوسی ہو گی جب انہیں پتہ چلے گا کہ وہ اپنی کوشش میں بری طرح ناکام ہو چکی ہیں۔

اسکی طنزیہ آواز پر حوریہ کا ضبط بالآخر چھلک گیا وہ آنسوؤں کو بہنے سے کسی طور بھی روک نہیں پائی تھی۔

☆......☆......☆

ولیمے کی تقریب ٹھیک ٹھاک رہی تھی۔ ڈل گولڈن کلر کے برائیڈل ڈریس میں وہ کل سے کہیں بڑھ کر دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس کا سوگوار سا حسن اس رنگ میں بے حد دلفریب ہو رہا تھا۔ شہیر تو تھا ہی خوبصورت وائٹ پینٹ کوٹ میں ملبوس اپنی ٹھٹک دینے والی مردانہ وجاہتوں کے ہمراہ وہ سب میں ممتاز اور نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اونچے اونچے قہقہے حوریہ کے اندر وحشت کو جنم دیتے رہے۔ تقریب کے اختتام پر جب بی بی جان نے رسم کے مطابق اسے ساتھ لے جانا چاہا تو شہیر نے خود انکار کر دیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس کا لہجہ جتنا بے لچک تھا اس سے بڑھ کر بے لحاظ مگر حوریہ نے جو بات شدت سے نوٹس کی وہ ماما کا اطمینان تھا۔ بظاہر وہ شہیر کی اس بدتمیزی پر خفت کا شکار ہو کر وضاحتیں پیش کرتیں کسی قدر ازالے کی کوشش کرتی رہیں مگر اُن کے انداز کی طمانیت ایسی تھی جسے کوئی بھی محسوس کر سکتا تھا۔ بی بی جان اور بابا جان کو اس کی بہنوں سمیت اس اطمینان اور تسلی کے ہمراہ انہوں نے رخصت کر دیا تھا کہ کل شہیر خود حوریہ کو لے کر اُن کی طرف لازماً آئے گا جبکہ حوریہ کے دل پر عجیب سا بوجھ آ ٹھہرا تھا۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے منہ ہاتھ دھو کر میک اپ صاف کرتے وہ مسلسل بابا جان اور بی بی جان کے متعلق سوچ کر ہی افسردہ ہوتی رہی۔

''اچھا کیا کہ آج آپ اپنے اصلی روپ کے ہمراہ ہی میری منتظر ہیں مسز حوریہ کمال!'' اس تمسخرانہ آواز پر وہ اپنے خیال سے چونکی جانے کب وہ اندر چلا آیا تھا۔ وہ گھبرا کر سیدھی ہو بیٹھی اور دوپٹہ درست کیا۔

''میں فریش ہو لوں تب تک تم ایک کپ اسٹرانگ چائے کا بنا لاؤ میرے لیے......''

کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکتا ہوا وہ خود واش روم میں جا گھسا۔ ناگواری کی شدید لہر حوریہ کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ لب بھینچے وہ اپنی

جگہ بیٹھی رہی تھی یہاں تک کہ وہ باتھ لے کر سلیپنگ گاؤن میں پھر سے کمرے میں آ گیا۔
گولڈن براؤن مخملیں گاؤن میں اس کا تند مند فریش سراپا اس کے سامنے تھا وہ گیلے بال پیشانی سے جھٹک کر سگریٹ سلگا رہا تھا حوریہ نے نگاہ کا زاویہ بدل ڈالا۔
''وہاں کیوں بیٹھی ہو اتنے فاصلے پر؟ یہاں آؤ نا میرے پاس......'' بلاوہ خاص تھا مگر حوریہ کا وجود جیسے مفلوج ہو گیا۔ گزشتہ رات کا سلوک ایسا ہرگز نہیں تھا کہ کوئی اچھا تصور یا احساس اسے چھو کر گزرتا بلکہ وہ سہم کر اپنی جگہ سمٹ سی گئی۔
جبکہ دوسری سمت وہ یقیناً اس کا منتظر تھا اسے اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر وہ جیسے آپے سے باہر ہونے لگا۔
''سنا نہیں تمہیں کیا کہا ہے میں نے؟ یہاں آؤ۔''
وہ بولا نہیں ایک طرح سے دھاڑا تھا۔
حوریہ نے سراسیمگی کی کیفیت میں اسے دیکھا۔ اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں غایت درجے کی غضبناکی تھی جو اس کے رہے سہے حواس بھی چھین کر لے گئی۔ شہیر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس تک آیا اور جھپٹنے کے انداز میں اسے دبوچ لیا۔ حوریہ کو لگا تھا جیسے اس کے وجود سے کوئی مگرمچھ لپٹ گیا ہو۔
☆......☆......☆
اس کا انداز کل سے بھی زیادہ شدید اور سفاکانہ تھا۔ روتے اور التجائیں کرتے حوریہ کے حواس ساتھ چھوڑ گئے مگر اسے رحم نہیں آیا تھا۔ شدتِ گریہ سے اس کی آنکھیں نہ صرف صبح سوجھی ہوئی تھیں بلکہ بے تحاشا سرخ بھی ہو رہی تھیں۔ کل کی طرح آج اس نے آئینے میں دکھائی دیتے اپنے عکس سے نگاہ نہیں ملائی۔ ماما نے اس کے متورم چہرے کو تشویش زدہ نگاہوں سے تکا ضرور تھا مگر کچھ کہنے سے گریز کیا تو اس کا شکوہ اُن کی طرف سے کچھ اور بڑھ گیا۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا بستر پر لیٹی آنکھیں موندے بس اپنے نصیب سے شاکی ہوتی رہی۔
''کیا سانولی رنگت اس کا ایسا عیب تھی جس کی کڑی سزا بچپن سے لے کر اب تک وہ سہتی آ رہی تھی؟'' اسے یاد تھا بہت بچپن سے اسے اپنی اس کمی کا احساس ہو گیا تھا۔ لوگوں کے وہ تبصرے جو اسے اس کے والدین یا بہنوں کے ہمراہ اسے دیکھ کر بے دریغ کیے جاتے۔ بہت سے لوگ اس بات کو ماننے پر تیار نہ ہوتے کہ وہ اُن کی بیٹی یا بہن ہے۔ جب یقین آ جاتا تو حیرت کا اظہار ضرور کیا جاتا۔
''اچھا......یقین تو نہیں آتا...... یہ کس پر چلی گئی؟ آپ کے گھر میں تو ماشاء اللہ سب گورے چٹے حسین ہیں۔'' اس وقت اس کے گھر کے سبھی افراد کا رویہ مختلف ہوتا۔ بی بی جان اس سوال پر چپ سی ہو جاتیں۔ ایسی خاموشی جس میں شرمندگی اور مجرمانہ احساس چھلکا کرتا۔
بہنیں یا تو ہنس پڑتیں یا کاندھے اُچکا کر لاپرواہی سے کہتیں۔
''پتہ نہیں ہمارے تو ننھیال ددھیال میں دور دور تک کالی رنگت کسی کی نہیں ہے۔'' وہ بڑے آرام سے اس کی سانولی رنگت کو کالی میں بدل دیتیں اور انہیں کبھی احساس تک نہ ہوتا ایسے لمحے حوریہ کے ننھے سے دل پر کیا بیت گئی ہے۔ ہاں البتہ بابا جان کا رویہ بالکل برعکس ہوتا وہ اسے لپٹا کر پیار کرتے اور جواب میں اس کی کسی نہ کسی خوبی کو بیان کرنا شروع کر دیتے۔
وہ چار سال کی تھی جب اپیا کے ساتھ پہلی بار

اسکول گئی تھی۔ وہاں اس قسم کی دل شکن باتوں کو سننے کے بعد بی بی جان سے واپسی پر لپٹ کر اس نے روہانسی ہوکر کہا تھا۔

''دیکھ رہی ہیں بی بی جان! اپیا کی ساری سہیلیاں مجھے کلو پری کہہ کر چھیڑتی رہیں۔ کیا میں سچ مچ کالی ہوں؟''

''مجھ سے کیا پوچھتی ہے نصیب جلی! جھوٹ تو نہیں کہتیں...... کسی نے تیری اپیا کو نہ کہہ دیا۔''

بی بی جان جو اس قسم کی باتوں سے اکثر کلستی رہتی تھیں اس روز نہ جانے کیوں اس کے سامنے ضبط کھو کر گویا پھٹ پڑیں۔ حوریہ کو اُن کی باتوں کی تو اتنی سمجھ نہیں آئی لیکن ان کے چیخنے اور رونے پر ضرور حواس باختہ ہوگئی۔ اگر اس پل بابا جان وہاں آکر اسے اپنے بازوؤں میں نہ لے لیتے تو شاید وہ بھی بی بی جان کی طرح ہی پھپک کے رونے لگتی۔

''بابا جان نے پہلے اِدھر اُدھر کی مگر خوبصورت باتوں سے پہلے اسے بہلایا تھا پھر بی بی جان کو سرزنش کی تھی اور بی بی جان جو پہلے ہی دل برداشتہ تھیں ایک بار پھر آنسو بہانے لگیں۔

''آپ کا کیا خیال ہے مجھے احساس نہیں ہے۔ مگر یہ لوگ بہت بے حس ہیں مجھے لگتا ہے یہ بچی کو احساس کمتری کا شکار کر کے چھوڑیں گے۔''

''لوگ بے حس ہیں آپ بے حس مت ہوں بیگم صاحبہ! پھر رنگت کا ماند ہونا کوئی خامی نہیں ہے کہ ہم اسے کسی کمتری میں مبتلا کر ڈالیں۔ پلیز بی کیئر فل نیکسٹ ٹائم......''

بی بی جان بابا جان کی بات سمجھ گئیں اور آئندہ بے حد احتیاط کی مگر یہ احتیاط اُن کی تینوں بڑی بیٹیاں نہ کر سکیں تھیں جنہیں اپنے حسن کا پورا پورا احساس تھا۔ جبکہ اپیا تو خاص طور پر کہ وہ بابا جان کی بے حد لاڈلی رہ چکی تھیں۔ تیسرے نمبر کی اولاد تھیں اور حوریہ سے پہلے تمام تر محبت اور خصوصی توجہ کی عادی ہوگئی تھیں اور چونکہ حوریہ اُن کی پیدائش سے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی تو بابا جان کی توجہ اچانک سے کم ہوتی محسوس کر کے بہت بچپن سے ہی حوریہ کے لیے رقابت کے جذبات محسوس کرنے لگیں۔ جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہی چلے گئے۔

یہ اُن کا نصیب تھا کہ حوریہ سانولی رنگت کی وجہ سے بے حد حساس تھا اور بابا جان کو اُس کی حساسیت کا پورا احساس یوں یہ توجہ اور محبت گہری ہوتی گئی اپیا کی نفرت بھی بڑھتی چلی گئی۔ پتہ نہیں وہ اس بات کو کیوں قبول نہ کرسکیں کہ حوریہ نے اُن کی محبت چھینی نہیں ہے بلکہ اس نے اپنا حصہ اپنا حق وصول کیا ہے۔ بس وہ اسے غاصب سمجھ کر اپنے رویے اپنی نفرت میں خود کو آج تلک حق بجانب سمجھتی تھیں۔

بچپن میں جو اس کی رنگت سانولی لگتی تھی نوجوانی کے نکھار نے اس میں جو نکھار جاذبیت اور دلکشی پیدا کی تھی وہ بہت خاص تھی۔ اپنی سانولی رنگت کے باوجود وہ اتنی اٹریکٹو لگتی کہ اکثر اس کی بہنوں کی موجودگی میں بھی ملنے دیکھنے والے اس کی بے ساختہ تعریف کر جاتے اور یہی چیز اپیا سے بالکل ہضم نہیں ہوتی تھی۔

پھر اس کے لانبے گھنیرے بے تحاشا سیاہ اور لمبے بال بھی اسے تمام بہنوں سے ممتاز رکھتے۔ سونیا (اپیا) کو اس سے اس اضافی خوبی سے بہت جیلسی محسوس ہوتی کہ ان کے اپنے بال نہ صرف کرلی تھے بلکہ بہت ہلکے بھی تھے۔ اور وہ اپنی یہ جلن کسی نہ کسی صورت حوریہ پر اکثر نکالتی رہتی تھیں۔ اس وقت وہ چاروں بہنیں آٹھ بجے کا

ڈرامہ دیکھنے کے لیے ٹی وی لاؤنج میں ضرور اکٹھتی ہوا کرتی تھیں۔ جب ٹی وی پر رنگ گورا کرنے والی کسی کریم کا اشتہار چلنے لگا۔ ان دنوں آپا اور آپی کی بات طے ہو چکی تھی۔ عنقریب شادی بھی متوقع تھی۔ حوریہ تب فرسٹ ایئر میں تھی اور اپنی اسائنمنٹ تیار کر رہی تھی ڈرامے میں وقفہ آیا تو اس نے پھر سے فائل کھول لی۔

''حوریہ تم یہ والی کریم استعمال کر کے دیکھو..... ہوسکتا ہے قدرت کو تم پر کچھ رحم آجائے اور تم اپنے نام کی کچھ لاج رکھ سکو۔'' اپیا نے بڑا تاک کر نشانہ لگایا تھا قلم حوریہ کے سرد پڑتے ہاتھوں میں ساکن ہو گیا۔ وہ سن بیٹھی اپیا کی سمت دیکھتی رہ گئی تھی۔ جب اس کی متغیر رنگت پر ترس کھا کر آپا نے انہیں گھر کا تھا۔

''بری بات سونی اس طرح نہیں کہتے.....

پھر اس میں اس کا قصور ہی کیا ہے؟'' اپیا نے تمسخر سے سر اثبات میں ہلایا تھا پھر بظاہر ہمدردی سے بولی تھیں۔

''بھئی اس میں مائنڈ کرنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے..... میں نے اسے بہن سمجھتے ہوئے ایک مشورہ دیا ہے۔'' حوریہ نے حسبِ سابق ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر اپنی فائل اور کتابیں سنبھالیں اور سرعت سے وہاں سے اٹھ گئی وہ آنسو بہا کر مزید خفت نہیں سمیٹنا چاہتی تھی صرف یہی نہیں اس قسم کے اور کئی واقعات تھے جنہوں نے نہ صرف اس کی شخصیت کو پُر اعتماد نہیں ہونے دیا تھا بلکہ وہ خود پر سہہ جانے اور گھٹ کر جینے کی عادت ہو چلی تھی۔ گو کہ جب وہ کالج میں آئی تو بہت ساری لڑکیوں نے متعدد بار اس کی معصومیت اور نزاکت کی تعریف کی تھی۔ مگر وہ کبھی بھی اس لیے یقین نہ کر سکتی کہ بچپن کی اپنی ذات کے حوالے سے سنے گئے کمنٹس اسے یہ تسلیم کرنے ہی نہیں دیتے تھے۔ کالج کے بعد یونیورسٹی میں آنے کے بعد اُس کا اعتماد دھیرے دھیرے بحال ہو گیا تھا کہ کبھی کسی نے دوبارہ یہ احساس نہیں دلایا کہ وہ کسی سے کم ہے یا خوبصورت نہیں ہے۔

اپیا سمیت تینوں بہنیں بھی بیاہی گئی تھیں مگر اس کا یہ اعتماد شہیر ملک نے ایک بار پھر اس سے چھین لیا تھا ایک بار پھر وہ احساس کمتری بے مائیگی کے احساس سے مغلوب ہو چکی تھی۔ اس نے بہت ہی افسردگی اور مایوسی کی کیفیت میں سوچا تھا۔

اپیا ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ واقعی مجھ جیسی عام سی لڑکی کی شادی شہیر جیسے خوبرو شخص کے ساتھ نہیں ہونی چاہیے تھی۔

☆......☆......☆

شہیر کی کچھ قریبی رشتہ دار لڑکیاں ابھی وہیں تھیں جو اسے زبردستی کمرے سے نکال کر لان میں لے آئی تھیں۔ موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر لان میں گزارنے کے بعد جب شام رات کا لبادہ اوڑھنے لگی تو وہ لوگ ماما کے کہنے پر اندر لاؤنج میں آ گئیں۔ باتوں میں وقت گزرنے کا احساس نہ ہو سکا۔ وہ سب ہی بے حد سلجھی ہوئی نفیس طبیعت کی لڑکیاں تھیں۔ کھانے لگنے کی اطلاع کے ساتھ ملازمہ نے ماما کا بلاوا بھی پہنچایا جو کھانے کی ٹیبل پر اُن کی منتظر تھیں۔ جب وہ ان کے ہمراہ ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو ربیعہ نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہہ دیا تھا۔

''بھابی آپ تو شہیر بھائی کے ساتھ کھانا چاہیں گی نا؟'' وہ کیا جواب دیتی کچھ گھبرا کر ماما کو دیکھنے لگی۔

''وہ تو اپنے دوست کے ساتھ نکلا ہوا ہے...... آنے میں دیر بھی ہوسکتی ہے تب تک حوریہ بھوکی تو نہیں رہ سکتی۔''

ماما نے بات سنبھال لی تھی وہ سر جھکائے کھانے کے بجائے چمچ سے کھیلتی رہی۔

''مجھے لگتا ہے بھابی واقعی ہی شہیر بھائی کو مس کررہی ہیں۔'' ثنا نے ہنس کر کہا اور وہ چونکی پھر جھینپ سی گئی۔ اور محض اُن کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ منہ میں ڈال کر کھانے کا تاثر دیتی رہی۔ کھانے کے بعد ربیعہ نے ملازمہ سے کافی کی فرمائش کی اور ایک بار پھر وہ لوگ لاؤنج میں آبیٹھیں کہ ٹی وی پر پاکستان اور انڈیا کا میچ براہِ راست دکھایا جارہا تھا۔ حوریہ کو دلچسپی نہیں تھی مگر مروتاً اُن کے ساتھ بیٹھی رہی۔ ملازمہ اُن کی کافی لے کر آگئی تھی جب پورٹیکو میں اس نے شہیر کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنا تھا اس کے پورے وجود پر ایک کپکپی سی چھانے لگی۔ اگلے ہی کچھ لمحے میں وہ وہاں چلا آیا تھا کہ یہیں سے گزر کر سیڑھیوں سے اسے اپنے کمرے تک جانا تھا۔

''ہائے گائز......'' وہ ان سب پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر جیسے مروت نبھاتے ہوئے بولا۔

''آیئے شہیر بھائی آپ بھی میچ سے لطف اندوز ہوں...... ساتھ میں کافی کی آفر بھی ہے۔''

ربیعہ نے خوشدلی سے کہا تو جواباً وہ فی الفور انکار کرگیا۔

''نو تھینکس تھکا ہوا ہوں آرام کروں گا۔''

ربیعہ کی بات کا جواب دیتے اس کی نگاہ دونوں ہتھیلیوں میں بڑا کافی کا بھاپ اڑاتا مگ تھامے نظریں جھکائے بیٹھی حوریہ پر پڑی تو ایک پل کو حیران نظر آیا۔

''آگئے بیٹا! کھانا کھاؤ گے؟''

''نو میں کھا چکا ہوں...... آپ بس ایک گلاس گرم دودھ بھجوا دیجیے۔'' وہ کہتا ہوا سیڑھیوں کی سمت بڑھ گیا جب ماما کی ناگواری سی آواز پر اچنبھے سے رکا اور پلٹ کر دیکھا جو کہہ رہی تھیں۔

''اگر باہر کھانے کا پروگرام تھا تو حوریہ کو بھی لے جاتے...... نئی نویلی دلہن ہے کیا سوچے گی ایسے سلوک پر......''

''آپ کی بہو صاحبہ کسی قسم کے سلوک پر بھی شاید کچھ نہیں سوچتیں سو ڈونٹ یو وری۔'' وہ بہت شدید موڈ میں بہت غصے سے بولتا حوریہ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈال کر کسی قدر طنز سے کہتا سیڑھیاں پھلانگ گیا۔ حوریہ نے ایک دم اپنی پیشانی جلتی محسوس کی۔ پتہ نہیں ان تینوں لڑکیوں نے بھی شہیر کی بات سنی تھی یا نہیں اس کا وجود وہیں بیٹھے بیٹھے سن ہونے لگا۔

اس کا دل چاہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے شرمندگی ایسی کہ اس کا رونے کو دل چاہنے لگا۔ میچ ختم ہوگیا لڑکیوں نے کسی قدر حیرت سے اسے جسے دیکھا مگر منہ سے کچھ کہے بغیر آپس میں ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہیں۔ وہ جو کچھ مرضی اس کے بارے میں سوچتیں مگر آج حوریہ نے تہیہ کرلیا ہوا تھا اس شیطان صفت انسان کے سوجانے کے بعد ہی کمرے میں جائے گی۔

ربیعہ نے چینل بدل دیا تھا۔ اب وہ تینوں کوئی میوزک کنسرٹ جو لائیو دکھایا جارہا تھا انجوائے کررہی تھیں۔ جب شب خوابی کے لبادے میں ایک بار پھر شہیر سیڑھیوں پر برآمد ہوا۔

''شہلا تم لوگ ابھی تک سوئی کیوں نہیں ہو؟ یار میری بیوی پر کیوں قبضہ جما کر بیٹھی ہو تم

لوگ......'' اس کے شائستہ لہجے میں مذاق کا ہلکا سا رنگ تھا۔ حوریہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اسے اپنی پلاننگ فیل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تو ایک دم سہم گئی۔

''سوری بھائی بس جا رہے ہیں ہم......''
شہلا کے ساتھ ربیعہ وغیرہ بھی اگلے ہی لمحے اٹھیں تھیں اور لاؤنج سے نکل گئیں۔ جبکہ حوریہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

''یہاں چھپ کر بیٹھنے سے تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ مجھ سے بچ جاؤ گی تو بہت غلط خیال ہے محترمہ......'' وہ اس کے پاس آ کر کسی قدر حقارت سے بولا تھا۔ حوریہ کے ڈر خوف پر ایکدم ہی بہت ساری نفرت کا احساس غالب آ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر بے خوفی سے اسے دیکھا پھر ہونٹ سکوڑ کر بولی تھی۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے آپ سے ڈرنے کی...... سمجھے آپ؟'' اس کے بدلے ہوئے لب و لہجے نے شہیر کو چونکا دیا اس نے ٹھٹک کر اس کے سرد مہر اور ناگوار تاثرات جانچے تھے پھر پھنکار کر بولا تھا۔

''اندر چلو پھر بتاتا ہوں......'' اُس کا لہجہ مشتعل تھا۔

''میں خود کو آپ کی درندگی کا شکار بنانے کو آپ کے آگے پیش نہیں کر سکتی۔ خریدا نہیں ہے بہرحال آپ نے مجھے۔'' اس کا انداز قطعی دو ٹوک اور بے خوف تھا اور یہی انداز شہیر کو آپے سے باہر کر گیا تھا۔

''ہاؤ ڈیئر یو!'' اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور ایک زناٹے کے ساتھ اس کے چہرے پر جا پڑا وہ یقیناً لڑکھڑا کر گرتی اگر جو وہ بروقت اسے شانوں سے دبوچ کر اپنے مقابل نہ گھسیٹ لے جاتا۔

''کیا سمجھتی ہو تم میں منتیں کروں گا تمہاری؟'' اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ مگر حوریہ پھر بھی خائف نہیں ہوئی تھی بدستور اس کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرتی رہی۔

''اوہو تو گویا چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔ آج تو معرکے کا ارادہ لگتا ہے گڈ مجھے تمہیں زیر کر کے بہت لطف آئے گا۔'' وہ اس کے گال تھپک کر اتنی خباثت سے بولا تھا کہ خفت سے حوریہ کا چہرا لال ہو گیا۔

''چلو گی یا یونہی گھسیٹ کر لے چلوں اپنے ساتھ؟ یہ تو طے ہے کہ میں آج تو تمہیں ہرگز ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔'' اس کی مزاحمت کو دلچسپی کی نگاہ سے تکتا ہوا وہ اس کمینگی سے بولا تو بے بسی کے احساس سے حوریہ کی آنکھیں برس پڑیں۔ سبکی بے مائیگی کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ ہولی ورنہ کچھ شک بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی بات پر عمل کرتا اور اسے گھسیٹ کر لے جاتا۔

''بھئی چیخو نا چلاؤ احتجاج کرو مزاحمت کرو۔ مجھے اچھا لگا تھا تمہارا یہ روپ جیسے شکاری کے جال میں پھنسے پرندے کی بے بسی۔''
وہ اس کی گم صم ہو جانے والی کیفیت پر اسے چھیڑتا حظ لیتا ہنستا رہا جبکہ حوریہ کو تو ایسی چپ لگی تھی جو شاید ہی ٹوٹتی۔

اس کی یہ چپ اگلے دو دن بھی نہیں ٹوٹی اس کے شدید ناروا سلوک کے باوجود......
چوتھے دن جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ یا پھر ماما نے فورس کیا تھا کہ وہ اسے بی بی جان اور بابا جان سے ملانے لے آیا۔ بابا جان کو وہ بہت سے زیادہ خاموش اور عدم اعتماد کا شکار نظر آئی تو دل بے تحاشا خدشات میں گھر گیا۔ واپسی

پر بھی وہ یونہی گم صم اور خاموش تھی جب شہیر نے ایکدم اس پر طنز کا تیر چلایا تھا۔

''کم از کم لباس کا انتخاب ہی انسان کو اپنی شخصیت کے مطابق کر لینا چاہیے۔'' وہ اس وقت سیاہ جھلملاتی ساڑھی میں ملبوس تھی جو بالخصوص ماما نے اسے اپنی پسند سے نکال کر دی تھی۔ شہیر کے معاملے میں خاموشی کے سوا وہ اس کے لیے بہترین ساس ثابت ہو رہی تھیں۔ محبت شفقت توجہ پیار' فراخدلی سے اس پر لٹاتیں پورے گھر کا کنٹرول انہوں نے ان چند دنوں میں ہی اسے سونپ دیا تھا۔ وہ قسم کھا کر بھی یہ بات کہہ سکتی تھی کہ اس لباس میں وہ بری ہرگز نہیں لگ رہی تھی مگر وہی احساس کمتری کہ جس نے اس کا چہرہ لمحوں میں پھیکا کر ڈالا گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اسے نا چاہتے ہوئے بھی متوجہ ہونا پڑا۔

''آئی ڈونٹ نو مما نے کیا سوچ کر میرے لیے تمہارا انتخاب کیا؟ تم خوبصورت بھی نہیں ہو کہ سمجھا جائے مما نے اپنے تئیں میرے حواس چھین کر مجھے کہیں اور کا نہیں رہنے دیا۔ بے چاری مما! مجھے تو ان پر ترس آ رہا ہے۔'' وہ ہنس رہا تھا تمسخر اڑاتی ہوئی ہنسی...... حوریہ کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا اور آنکھوں کی سطح نم ہونے لگی۔

''تم خود دیکھو اگر وہ کوئی حور پری بیاہ کر لاتیں تو میں شاید اُن کی چال میں آ جاتا اب...... رئیلی مجھے مما کی عقل پر حیرت ہو رہی ہے۔''

اس کی مسکراہٹ ہنسی پھر قہقہے میں ڈھل گئی۔ حوریہ کے گلے میں کچھ پھنسنے لگا۔ انسلٹ اور اتنی شدید......

''ہاں شاید انہوں نے صحیح کیا اپنے تئیں صحیح کیا...... ایک مڈل کلاس دبو لڑکی کو تلاشا...... تاکہ اُن کا بیٹا انتقاماً یا غصے مین جو کچھ بھی ایسا ویسا کرے وہ لڑکی جھجک ڈر خوف کے باعث چپ رہے۔ گھر کی بات گھر سے نہ نکلے اس پوائنٹ آف ویو سے ماما کی عقل کی داد دینی چاہیے۔ تم اُن کی توقع سے زیادہ بڑھ کر فرمانبردار صابرہ اور دبو ہو یار۔'' وہ ذرا سا رُکا پھر کھلکھلایا تھا اور کچھ توقف کے بعد پھر سے گویا ہوا۔

''سنو...... میرا گھر میرے پیرنٹس اس آزمائش میں پورے اترنے کے انعام میں تمہارے ہو سکتے ہیں مگر یہ اونچا لمبا گڈ لکنگ اور ڈیشنگ شہیر ملک تمہارا ہوگا یہ مما کی بہت بڑی بھول ہے۔ میں چونکہ تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا جبھی بتا رہا ہوں کہ تمہیں پسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ میں عانیہ سے محبت کرتا ہوں۔ عانیہ چونکہ ماڈل گرل ہے جبھی ماما میری اس سے شادی پر آمادہ نہیں تھیں۔ ماما کا خیال تھا وہ مجھے قابو کر چکی ہیں مگر میں نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا ہے۔ میں اگر چاہتا تو شادی سے انکار کر دیتا مگر انہوں نے اپنی قسم دے کر مجھے مجبور کر دیا۔ اپنی شکست کا بدلہ میں اُن کی من پسند بہو سے اُس کی تذلیل کر کے لے چکا ہوں۔ اور چونکہ میرے دل میں لگی آگ بجھ چکی ہے تمہارا دل چاہے تو مجھے معاف کر دینا ورنہ جیسی تمہاری مرضی تم اگر چاہو تو مجھ سے خلع بھی لے سکتی ہو۔'' اس کی حیرت' خوف اور رنج سے پھٹ جانے والی آنکھوں میں جھانک کر اطمینان سے اپنی بات مکمل کر کے وہ پھر سے گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ حوریہ یوں ساکن بیٹھی تھی جیسے پتھرا گئی ہو۔

☆......☆......☆

اگلی صبح وہ اسلام آباد چلا گیا۔ جاب کے سلسلے میں وہ وہیں مقیم تھا۔ مما نے اسے حوریہ کو ساتھ

لے جانے پر یقیناً فورس کیا تھا مگر وہ کسی طور بھی نہیں مانا۔

''پتہ نہیں یار اتنی خوبصورت نہ ہونے کے باوجود تم میں کیسی کشش ہے جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ابھی بھی تمہیں چھوڑ کر جانے کو دل تو نہیں چاہتا گھر میں مزید رک بھی نہیں سکتا ہوں۔'' صبح بیدار ہونے کے بعد اس نے اپنی سحر انگیز خوابناک آنکھوں سے اُسے تکتے ہوئے بوجھل لہجے میں جانے کیسا اعتراف کیا تھا۔ یا پھر اپنی کمزوری ظاہر کی تھی۔ جو بھی تھا حوریہ کی چپ تب بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

''اتنی خاموش کیوں رہتی ہو؟ کچھ بولا کرو یار...... مجھے تو تمہارے ساتھ یہ رویہ گلٹ فیل کرانے نہ لگ جائے۔'' وہ اب کی بار ہنس کر بولا تھا۔ حوریہ نے ہونٹ بھینچ لیے تھے اور جب وہ جار ہا تھا تب وہ محض لمحہ بھر کو اس کے پاس رُکا تھا۔

''تمہارا جو بھی فیصلہ ہو مجھے آگاہ کر دینا...... میں تمہارا من پسند فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں کروں گا۔'' پھر وہ چلا گیا تھا۔ اس کے بعد کی ہر رات حوریہ پر گویا عذاب بن کر ٹوٹتی رہی تھی۔ اس کے کمرے میں اس کی غیر موجودگی کے باوجود ہر شے میں اس کا احساس زندہ تھا۔ اُس کا رویہ ہرگز ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کی کمی محسوس کرتی مگر وہ اپنے وجود اپنے دل کو خالی ہوتا محسوس کرتی رہی تھی۔

اسے گئے تین ہفتے ہو چکے تھے وہ ایک بار بھی پلٹ کر نہیں آیا تو ماما کی تشویش گہری ہونے لگی تھی۔ اور اسی تشویش اور گھبراہٹ کے عالم میں جب وہ شہیر سے ہر قسم کے کانٹیکٹ میں ناکام ہوئیں تو حوریہ سے انہوں نے وہ سوال کر لیا تھا۔

''شہیر کی تمہارے ساتھ کوئی پرابلم تو نہیں چل رہی؟ آئی مین لڑائی جھگڑا یا پھر کوئی اور بات......'' حوریہ کی ویران آنکھوں میں اترا ہوا خالی پن اور احتجاج انہیں نظریں چرانے پر مجبور کر گیا تھا۔

''آئی ایم سوری بیٹا! مجھے اندازہ ہے کہ میں اپنی ماما کے جذبے سے مجبور ہو کر شاید تمہارے ساتھ زیادتی کر گئی ہوں۔ وہ جس غلط راہ پر چل رہا تھا مجھے اسے واپس لانے کے لیے تمہارے جیسی نیک فرمانبردار اور نرم مزاج لڑکی ہی چاہیے تھی۔'' (قربانی دینے کے لیے؟ تذلیل کروانے کے لیے یا پھر کسی جنم کا بدلہ لینے کے لیے؟)

حوریہ کے رویں رویں میں احتجاج در آیا مگر اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔

''وہ تم سے کچھ تو کہہ کے گیا ہوگا؟''

اُن کے لہجے میں کھوج تھی۔ حوریہ نے سرد نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔

''جی کہہ کے تو گئے ہیں...... اگر میں چاہوں تو اُن سے خلع کا مطالبہ کر لوں...... وہ مجھے آزاد کر دیں گے اس لیے کہ انہوں نے یہ شادی مجھ سے نبھانے کے لیے نہیں کی تھی۔''

تمام تر ضبط کے باوجود غم و غصے کی شدت سے وہ پھٹ پڑی تھی۔ ماما کو جیسے دھچکا لگا کچھ دیر وہ یونہی ساکت غیر یقین نظروں سے اُسے تکتی رہی تھیں پھر وہیں کارپٹ پر یوں بیٹھتی چلی گئیں جیسے اُن کی ٹانگوں نے ان کے وجود کا بوجھ ڈھونے سے انکار کر دیا ہو۔ اُن کی آنکھوں میں اتنا سکوت اور چہرے پر ایسی زردیاں اتری تھیں کہ حوریہ کو باقی سب کچھ بھول کر اُن کی فکر کرنی پڑ گئی۔

☆......☆......☆

اس مسئلے کا حل یہ نکالا ماما نے کہ شہیر کو سمجھانے کی غرض سے خود اسلام آباد جانے کا پروگرام بنالیا۔ اس کی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد

ان کا سامنا شہیر کی بجائے عانیہ سے ہوا تھا۔ وہی ماڈل گرل جس سے وہ ہرگز ہرگز بھی اس کی شادی پر رضا مند نہیں تھیں اور وہ اس لڑکی سے شادی کرنے کے بعد اسے گھر میں لا چکا تھا۔ ماما کو جو شاک لگا تھا وہ الگ البتہ انہوں نے عانیہ کی جو انسلٹ کی تھی جیسے الفاظ اس کے لیے استعمال کیے وہ ایسے ہرگز نہیں تھے کہ کوئی بھی عورت چاہے وہ ماڈل گرل ہی کیوں نہ ہو برداشت کر پائے۔ ماما تو اپنا ابال اور طیش نکال کر خود پاپا کے ساتھ واپس چلی آئیں مگر عانیہ نے شہیر کی واپسی تک ایک قیامت اٹھا دی تھی۔ جو کچھ ماما نے اسے کہا تھا اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے بعد اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''اگر تمہاری ماں مجھ سے معافی مانگے گی میں تب ہی تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔'' اپنا بیگ لیے وہ اس کی منت سماجت کے باوجود واپس اپنے گھر چلی گئی تھی۔ شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ وہ یوں روٹھ کر جاتی شہیر کا غم و غصے سے برا حال ہونے لگا۔ اس سب بگاڑ کی وجہ ماما تھیں اور کس کی ہمدردی میں تھیں اس کے خیال نے شہیر کے تن بدن میں آگ بھڑکا دی تھی۔ جب ہی وہ اسی وقت لاہور چلا آیا تھا۔ کال بیل کے جواب میں دروازہ حوریہ نے کھولا تھا۔ شام رات کا لبادہ اوڑھ چکی تھی پورے گھر کی لائٹیں آن تھیں جبکہ ماما اپنے کمرے میں تھیں اسے روبرو پا کر شہیر کا اشتعال شدید غیض میں ڈھل کر ابل پڑا۔

''کون سے مظلومیت کے قصے سنائے تھے تم نے ماما کو جو وہ وہاں چلی آئیں؟ جواب دو مجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں بدبخت عورت......''

حوریہ اس کا دھکا لگنے سے سنبھلے بغیر لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔

''اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اس قسم کے اوچھے ہتھکنڈے اپنا کر تم مجھے حاصل کر لوگی تو یہ بہت بڑی بھول ہے تمہاری...... جو تمہاری اوقات تھی میری نظر میں وہ میں تمہیں اچھی طرح سے جتلا چکا تھا۔''

ایک ہاتھ سے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر دوسرے سے پے در پے تھپڑ اس کے منہ پر برساتے ہوئے وہ آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ حوریہ تکلیف کے احساس سمیت تڑپ اٹھی جبھی بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اس کے حصار سے خود کو چھڑانا چاہا مگر شہیر اس وقت حواسوں میں نہیں تھا۔

''کیوں بھیجا تھا انہیں وہاں؟ تمہارا کیا خیال ہے ڈرتا ہوں ان سے؟ ہاں کی ہے میں نے شادی؟ بولو کیا کرو گی تم؟'' اس کا چہرہ اپنے فولادی پنجوں میں جکڑ کر بولا اور حوریہ جس سے اس کی پریگیننسی کے باعث ماما نے یہ خبر چھپالی تھی ایکدم سرد پڑ گئی۔ اس نے فق چہرے کے ساتھ شہیر کو دیکھا جس کے چہرے پر بلا کی خوفناکی تھی۔ وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر وہ اس قابل کہاں تھی کہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھ پاتی وہ قہر آلود نگاہ اس پر ڈال کر اسے زور سے جھٹکتا وہیں سے پلٹ گیا جبکہ حوریہ سنبھلے بغیر لڑکھڑا کر گری تھی اور حواس کھوتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

پھر زندگی میں بے کیفی ہی باقی رہ گئی تھی۔ حوریہ نے اس روز کی اس کی آمد کے بارے میں ماما کو کچھ نہیں بتایا۔ ہوش میں آنے کے بعد اپنے گرنے کی بس اتنی توجیہہ دی کہ پیر پھسل جانے کے باعث گر گئی تھی۔ ماما نے اس کا کچھ اور بھی

زیادہ خیال رکھنا شروع کردیا۔ اتنی محبت اتنی توجہ اور اہمیت سے نوازتیں کہ حوریہ کو کبھی کبھار شرمندگی ہونے لگتیں مگر ماما شاید اپنے بیٹے کی زیادتی کا ازالہ کرنے یا پھر اپنی خودغرضی سے خفت زدہ تھیں جو بھی تھا حوریہ ان سے خفا نہیں رہ سکی۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے سرعت سے گزرتے چلے گئے کہ اچھا بھلا وقت جیسا بھی ہو بہرحال گزرنے کے لیے ہی ہوتا ہے یہ الگ بات کہ یہی گزرتا ہوا وقت اپنے آثار یادوں کی صورت چھوڑ جایا کرتا ہے۔ وہ بھی تلخ یادیں سمیٹ رہی تھی اس کی ڈلیوری کی تاریخ نزدیک آئی تو بی بی جان رسم کے مطابق اسے لینے چلی آئیں۔ مگر ماما نے بہت سبھاؤ سے انکار کردیا۔

''حوریہ آپ کی طرح میری بھی بیٹی ہی ہے سو بے فکر ہو جائیں اس کی طرف سے...... اللہ خیر کا وقت لائے میں اپنی بچی کو خود سنبھال لوں گی۔''

یوں بی بی جان اس لیے بھی مطمئن ہوگئیں کہ ہر قسم کے حالات سے بے خبر تھیں کہ اس نک چڑھے داماد نے روزِ اول سے ہی اُن سے گھلنا ملنا تو دور کی بات ڈھنگ سے بات بھی نہیں کی تھی اور حوریہ نے انہیں اپنی طرف سے پریشانی میں مبتلا کرنا مناسب نہیں سمجھا یوں سب کچھ پردے میں تھا اور بہتر ہی تھا ان کے ایک آدھ بار شہیر کے متعلق استفسار پر حوریہ نے انہیں شہیر کی اسلام آباد جاب کا بتلا دیا تھا اور یہ کہہ کر کچھ اور بھی مطمئن کردیا کہ وہ ہر ویک اینڈ پر یہاں آتے ہیں۔ جیسے حالات درپیش تھے انہوں نے نہ صرف حوریہ کا اعتماد مزید پست کیا تھا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنی ذات میں سمٹ گئی تھی۔ عادت تو شروع سے ہی ہر دکھ ہر احساس خود پر سہنے کی تھی مگر اب تو وہ جیسے کچھ اور بھی تنہا اور احساسِ کمتری کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔

جس دن حوریہ کی طبیعت خراب ہوئی ماما نے جانے کیا سوچ کر ایک بار پھر شہیر کو فون کیا تھا اس نے جواب میں جانے کیا کہا تھا کہ انہوں نے ضبط کھو کر ایک بار پھر اسے کھری کھری سنائی تھیں اور فون پٹخ دیا تھا۔ حوریہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی کرب اور اذیت کی انتہاؤں کو چھونے کے بعد اسے وہ درجہ ملا تھا۔ جس کے بعد جنت قدموں تلے بچھ جاتی ہے۔ ایک ہی وقت میں دو خوبصورت صحت مند بچوں کی پیدائش نے ماما کو نہال کرڈالا تھا۔ انہوں نے فوری طور پر حوریہ کے والدین کو یہ خوشخبری سنائی تھی۔ جس کے نتیجے میں بابا جان اور بی بی جان اگلے چند گھنٹوں بعد ہی ڈھیروں تحائف سمیت وہاں آ پہنچے تھے۔ تب ہی حوریہ نے جانے کتنے گھنٹوں کی بے ہوشی کے بعد آنکھیں کھولی تھیں۔ جب نرس نے سرخ کمبل میں لپٹے بچے لا کر اس کے پہلو میں لٹائے تو جانے کس احساس کے تحت وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

☆......☆......☆

اُسے ہاسپٹل میں تیسرا دن تھا۔ اب اس کی حالت قدرے بہتر تھی اور وہ نرس کے سہارے کے بغیر خود اٹھ کر واش روم وغیرہ جا سکتی تھی۔ بچوں کو فیڈ بھی کرالیتی۔ اس وقت دونوں بچے کاٹ میں سو رہے تھے۔ جبکہ ماما اس کے پاس بیٹھی اپنے تئیں اس کا دل بہلانے کی غرض سے ہلکے پھلکے موضوعات پر گفتگو کر رہی تھیں کہ ابھی کچھ دیر قبل ہی بی بی جان شہیر کی عدم موجودگی پر حیرت اور تشویش کا اظہار کر کے گئی تھیں۔ انہیں اس اتنے اہم موقع پر شہیر کا نہ ہونا بہت کھلا تھا اس

اور انہوں نے یہ بات صاف صاف بھی ماما کو جتلائی تھی جس پر ماما کا رنگ ایکدم سفید پڑ گیا۔ تب حوریہ نے ہی بات سنبھالی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے بی بی جان پرسوں ہی شہیر آفیشل ٹور کے سلسلے میں آؤٹ آف کنٹری گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر قبل اُن کا فون آیا ہے کہہ رہے تھے کل تک پہنچ جاؤں گا۔''

اور بی بی جان مطمئن ہوئی تھیں یا نہیں البتہ خاموش ضرور ہوگئی تھیں جبکہ ماما کی نگاہوں میں حوریہ کے لیے جو ممنونیت اور تشکر کے جذبات سمٹے تھے حوریہ نے دانستہ ان سے نگاہ نہیں ملائی۔

''میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں بیٹا کہ تم نے میرا یوں بھرم رکھ لیا۔'' بی بی جان کے چلے جانے کے بعد ماما اس کا ہاتھ پکڑ کر سسک اٹھی تھیں۔ حوریہ کی آنکھوں میں سرخیاں اتر آئیں۔

''کیوں پریشان ہوتی ہیں ماما! یہ آپ کا نہیں میں نے اپنا بھرم رکھا ہے۔'' اور جواب میں ماما بس اس کی برداشت اور استقامت کی قائل ہوکر رہ گئی تھیں۔

اس پل دروازہ کھلا تھا اور بلو پینٹ کوٹ میں ملبوس اپنی ٹھٹکا دینے والی شخصیت سمیت وہ اندر چلا آیا۔ حوریہ کی پلکیں غیر یقینی انداز میں اسے تکتی ساکن ہوگئیں۔ مما نے خفگی کے اس مظاہرے میں کمرے سے باہر جانا ہی مناسب جانا۔ حوریہ نے اس کے وجیہہ چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرا کر معدوم ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے تاثرات چھپائے کاندھے جھٹک کر بچوں کی سمت متوجہ ہوا۔ برابر میں موجود ڈبل کاٹ میں سوئے دو ہمشکل بچے اسے تحیر واستعجاب کے ساتھ خوش کن سے احساس سے روشناس کرا گئے۔

''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ ہی ان بے بیز کے فادر ہیں۔'' تب ہی نرس اندر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر رسمی مسکان لبوں پر لا کر بولی۔ شہیر نے سیدھا ہوکر اسے دیکھا اور بھنوؤں کو اثبات میں جنبش دی تو نرس نے بڑے پرزور انداز میں اسے مبارکباد دی تھی پھر بولی۔

''آپ کے دونوں بچے ہی صحت مند اور چارمنگ ہیں البتہ آپ کی مسز کی کنڈیشن خاصی تشویش ناک رہی ابھی بھی بہت ویکنیس ہے۔ انہیں بہترین ڈائٹ کے ساتھ خوش اور مطمئن رکھنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔''

نرس باتونی تھی حوریہ کے بازو میں انجکشن لگاتے ہوئے بھی مسلسل بول رہی تھی۔ شہیر نے اس کی بات بھی دھیان سے نہیں سنی اور باری باری جھک کر دونوں بچوں کو پیار کرنے لگا۔

نرس نے ایک بار پھر اسے مبارکباد دی تو اس کا مقصد سمجھتے ہوئے شہیر نے کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر جو نوٹ ہاتھ لگا اسے تھما دیا تھا اور ایک بار پھر بچوں کی سمت متوجہ ہوگیا۔ ننھے ننھے سے گل گوتھنے سے وجود اُسے نئے انوکھے سے احساسات کا شکار کررہے تھے۔ حوریہ آنکھوں میں نمی لیے اسے دیکھتی رہی۔ دل دکھ کی شدتوں سے بوجھل ہوتا رہا' کتنا مکمل ماحول تھا مگر فریبِ نگاہ وہ اس کے ہوکر بھی اس کے لیے نہیں تھا کیسا ستم تھا۔ سب کچھ برداشت کیا تھا اس نے اس کی نفرت اس کی انتہا پسندی مگر یہ احساس کہ وہ کسی کی خاطر اسے ٹھکرا چکا ہے اسے روہانسا کرتا جارہا تھا۔ شہیر نے بچے کو چومتے ہوئے اچانک نگاہ اٹھائی نگاہ چار ہونے پر حوریہ نے نا صرف نظر کا زاویہ بدلا بلکہ گردن موڑ کر چہرے کا رخ بھی پھیر لیا۔ شاید وہ اپنے آنسو اس سے چھپانا چاہتی تھی۔ شہیر نے بچے کو واپس کاٹ میں لٹایا اور نیچے

تلے قدم اٹھاتا اس کے سرہانے آن رُکا۔

''میری خواہش تو کیا گمان تک نہ تھا کہ تم سے میری نسل آگے بڑھے۔ سو سمپل میں نہ تو تمہیں اس قابل سمجھتا تھا نہ ہی تم سے مزید کوئی تعلق رکھنا چاہتا تھا مگر ہر کام میں چونکہ خدا کی کوئی مصلحت ہوا کرتی ہے کہ ایک نہیں دو دو بچے تمہاری گود میں ڈال دیے۔''

اس کے کھلے ریشمی بالوں میں ہاتھ ڈال کر ایک جھٹکے سے اس کے چہرے کا رخ اپنی جانب پھیر کر وہ ہمیشہ کے سے متکبرانہ اور تلخ لہجے میں بات کررہا تھا حوریہ کی آنکھوں سے بہتا گرم سیال کچھ اور شدت سمیٹ لایا۔

''یہاں آنے کا مقصد تمہیں کوئی تمغہ پہنانا نہیں ہے صرف یہ جتانا ہے کہ خود کو مضبوط سمجھنے کی حماقت مت کرنا تمہاری حیثیت میرے نزدیک آج بھی وہی ہے جو ان بچوں کی پیدائش سے پہلے تھی اور میں جب چاہوں تمہیں اپنی ذات سے جھٹک کر الگ کردوں لیکن اگر میں ایسا نہیں کررہا تو اس کا مطلب میں تمہیں اپنے بچوں کی گورنس کی حیثیت دے رہا ہوں اینڈ دیٹس آل......

وہ مسلسل چرکے لگا رہا تھا حوریہ نے کمال ضبط سمیت آنکھیں سختی سے میچ کر خود کو ہر احساس سے بے نیاز کردیا۔

☆......☆......☆

ماما کی شدید ناراضگی اس سے مخفی نہ تھی جو رویہ انہوں نے شہیر سے روا رکھا تھا ہاسپٹل میں اسے ہی نہیں خود شہیر کے اندر کی سفاکیوں کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے مستقبل کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی اچھی امید نہیں رہی تھی۔ گو کہ دو بچوں کی مصروفیت نے آنے والے وقتوں میں اسے سر کھجانے کا بھی وقت نہیں دیا تھا مگر یادوں پر تو اختیار نہیں تھا۔ ماما نے اسے اپنی آغوش میں یوں سمیٹا تھا کہ اسے کبھی لگا ہی نہ کہ وہ ان کی بہو ہے بیٹی نہیں۔ اسی کی خاطر انہوں نے اپنے بیٹے سے قطع تعلقی اختیار کرلی تھی اسے ان کے خلوص پر شبہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اسامہ اور حذیفہ کی کسی حرکت پر وہ جب بے ساختگی میں شہیر کو یاد کر بیٹھتی تو اگلے لمحے اسے یوں نظریں چرانے لگتیں جیسے کوئی گناہ کرلیا ہو۔ اکثر اسے دیکھتیں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس جب بڑھتا تو ان کا ڈپریشن بھی بڑھ جاتا۔

اسامہ اور حذیفہ کے عقیقے کی تقریب ماما نے بڑے شوق اور اہتمام سے منعقد کی تھی۔ اسی سلسلے میں تیاریاں بھی جاری تھیں کہ ماما ایک بار پھر بیمار پڑ گئیں۔ انہیں بیٹے کی بے حسی اور حوریہ کا غم اندر سے گھلانا شروع کر گیا تھا۔ حوریہ کو قریبی مارکیٹ سے کچھ ضرورت کی چیزیں چاہیے تھیں بچوں کو ملازمہ کے حوالے کرکے ماما کو بتاتی وہ چادر اوڑھے خود ہی نکل آئی تھی۔ اس سے قبل بھی وہ ایک آدھ بار مارکیٹ تک آچکی تھی جبھی اعتماد کسی قدر بحال ہوچکا تھا مگر اس کے گمان تلک بھی یہ بات نہ تھی کہ آج کا یوں تنہا نکلنا اسے پچھتاوے کا شکار بھی کرسکتا ہے۔ بڑی سی چادر میں خود کو اچھی طرح سے چھپائے وہ اس احساس سے بے خبر رہی تھی کہ مین سڑک پر وائٹ کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شہیر اسے دیکھ کر چونکا ہے اور لمحے کے ہزارویں حصے میں کسی شیطانی خیال نے اس کے ذہن پر قبضہ جما کر اس پر عمل کے لیے اُکسا دیا ہے۔ سڑک کراس کرکے حوریہ جیسے ہی مارکیٹ کی سمت مڑی وائٹ گاڑی نہایت سبک رفتاری سے اس کے نزدیک آن رُکی۔ حوریہ اپنے دھیان میں تھی آگے بڑھ گئی اچانک بازو پر ہونے والی

گرفت کا احساس پا کر متوحش انداز میں پلٹی تو اسے روبرو پا کے ششدر رہ گئی۔

''کہاں آوارہ گردی کررہی ہو؟ میرے بعد میرے بوڑھے والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث رہنے لگی ہیں میڈم!'' طنز سے بھرپور کاٹ دار لہجہ اسے لحوں میں جھلسا کے رکھ گیا تھا۔

''لیو مائے ہینڈ!'' وہ تمام سرشاری لحوں میں شدید اشتعال میں ڈھل گئی۔ جو اسے غیر متوقع طور پر اندر اتری تھی۔ اس کی تمام تر بے نیازی کٹھور پن کے باوجود دل کو اس کے سامنے پر وہ کسی طرح بھی دھڑکنے سے نہ بچا سکتی تھی تو وجہ اس شخص کی وہ محبت تھی جو اس کی تمام تر بے حسی کے باوجود دل میں جانے کیسے جگہ پا گئی تھی۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے جانِ من! آؤ نا بیٹھو۔'' وہ ایکدم لہجہ بدل کر بولا تو حوریہ نے اسی خفگی کے تحت جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔

''مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا سنا آپ نے؟''

''تو کیا کسی اور کے ساتھ جانے کا پروگرام بنالیا ہے؟''

سرد پھنکارتی تضحیک آمیز آواز حوریہ کا چہرا شدتِ غم سے سیاہ کرگئی گلا آنسوؤں سے بھر گیا۔ اس قدر تذلیل! شاید یہ شخص اسے سوائے کرب و اذیت کے کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ شہیر نے کھلے دروازے سے اسے اندر کھینچا اور اگلے ہی لمحے گاڑی اسٹارٹ کردی تو حوریہ نے کس قدر حواس باختگی سے اسے دیکھا تھا۔

''کہاں لے کے جارہے ہیں مجھے......''

''افق کے اس پار جہاں زمین اور آسمان آپس میں ملتے ہیں۔'' جواباً اسے آنکھ مارتے ہوئے وہ کس قدر خباثت سے بولا تو حوریہ کے حواس ایک دم ٹھٹھرنے لگے۔ اور جب وہ اسے ہوٹل کے کمرے میں لے کر آیا تو حوریہ کے چہرے پر اڑتی ہوائیوں کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تھا۔

''کم آن لڑکی! بیوی ہو تم میری...... اگر دیکھو ذرا اپنے پیرنٹس کی پابندیوں کے باعث ہمیں کیسے ملنا پڑ رہا ہے۔'' وہ اس کے نزدیک آ کر لگاوٹ سے بولا تو حوریہ اس کی آنکھوں میں اترتے خمار کو دیکھ کر بدک کر دور ہوئی اور روہانسی ہو کر بولی تھی۔

''مجھے جانے دیں پلیز......''

''چلی جانا میں بھی تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھنے کو تھوڑا لایا ہوں۔'' شہیر نے پہلے دروازہ لاکڈ کیا تھا پھر پلٹ کر اس تک آتے اسے بیڈ پر دھکیل دیا۔ وہ اتنی سراسیمہ ہورہی تھی کہ بے اختیار چیخ اٹھی مگر شہیر کے وزنی ہاتھ کے وحشیانہ دباؤ نے اس کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے کسی ذاتی کام کی غرض سے لاہور آیا تھا۔ دو دن کا قیام تھا اور یہ آخری دن تھا۔ یہاں اپنے گھر ہونے کے باوجود وہ ہوٹل میں مقیم ہوا تھا تو یہ بہت ستم کی بات تھی اس کے نزدیک اور جس کی وجہ سے یہ ستم ہورہا تھا جب غیر متوقع طور پر اسے سامنے پایا تو یہ نفرت عداوت اور انتقامی جذبہ عود کر سامنے آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اسے یہاں لایا تھا اس کی بے بسی سے حظ اٹھانے کے بعد اب وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے مسکراتی ہوئی نظروں سے سسکتی حوریہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے کھل کر بکھر جانے والے بالوں نے اس کے نازک سراپے کو

ایک طرح سے چھپالیا تھا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں اچھالنے کے بعد وہ بیڈ سے اتر گیا۔ ہاتھ لے کر چینج کیا اور اپنی ضروری چیزیں سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھنے کے بعد اس کی سمت متوجہ ہوا تو وہ ہنوز اسی پوزیشن میں تھی۔

''مجھے تم سے کتنی نفرت ہے اگر میں بتانا چاہوں تو شاید تمام الفاظ مل کر بھی میرے جذبات کی عکاسی نہ کرسکیں۔ بس اتنا جان لو کہ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا وہ تمہارے قرب کی خواہش میں بے بس ہو کر نہیں بلکہ تمہیں ماما پاپا کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کی خاطر کیا ہے جنہیں تم جیسی تھرڈ کلاس عورت نے مجھ سے چھین لیا اور ان سے وابستہ میری تمام سہولتیں بینک بیلنس جائیداد وغیرہ سب کچھ...... مگر اب میں دیکھتا ہوں جب تم ایک بار پھر پریگننٹ ہوگی تو ان کی نظروں میں تمہاری کیا اوقات رہ جائے گی ایک ایسی عورت ہو نا تم جسے تمہارا شوہر شادی کے تیسرے دن ٹھوکر مار کر ایسا گیا کہ پھر پلٹ کر تمہاری صورت دیکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ اس پریگننسی کے بعد وہ خود تمہارا منہ کالا کریں گے اور اپنے گھر سے دھکے مار کر نکالیں گے۔''

اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکے سے سر اونچا کر کے اس کی نمناک دھندلائی آنکھوں میں اپنی سرد نظریں گاڑھتے ہوئے پھنکار پھنکار کر بولا تو حوریہ کی آنکھیں خوف کے ساتھ ساتھ حیرت اور رنج سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ اپنا بیگ اٹھائے پلٹ کر کمرے سے نکل گیا جبکہ حوریہ تو جیسے پتھر کی ہوگئی تھی۔ چند منٹ کے توقف سے دروازے پر دستک ہوئی تب وہ ہڑبڑائی تھی اور سرعت سے اپنی چادر اُٹھا کر خود کو اچھی طرح ڈھانپا اس دوران ملازم اندر چلا آیا تھا۔

''سوری میم! مگر اب آپ کو فی الفور روم خالی کرنا پڑے گا صاحب جاچکے ہیں اور ادائیگی بھی ہوگئی سو پلیز آپ بھی اب تشریف لے جائیے۔''

ملازم نہایت مودب انداز میں محو کلام تھا مگر حوریہ کو اس کی نگاہوں کی حقارت اور تپش نے پانی پانی کر ڈالا تھا۔ وہ سرعت سے اٹھ گئی۔ اس پل وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر وہ رو رہی تھی۔ شاید اس محبت کے خاموش سے اپنی موت مرجانے پر جو اس نے شہیر سے کی تھی۔ جس نے کبھی اسے کوئی خوشی کوئی سکھ نہیں دیا تھا ہمیشہ دکھوں کے احساس نے اس کی آبیاری کی تھی مگر آج انتہائی ذلت سمیٹ کر وہ دل سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

پھر کس طرح وہ گھر پہنچی تھی اسے کچھ خبر نہیں ہوسکی اس کی طبیعت خراب ہوچکی تھی اگلا ایک ہفتہ وہ بخار میں پھنکتی رہی ماما کو اپنی بیماری بھلا کر اس کی تیمارداری کے ساتھ بچوں کو بھی سنبھالنا پڑ گیا تو ایک ہفتے میں ہی چکرا کر رہ گئیں حوریہ کی طبیعت تو سنبھل گئی مگر اندر کا خوف تمام نہ ہوا اس نے زندگی میں کبھی اتنی پابندی سے نماز نہیں پڑھی تھی۔ جتنا ان دنوں پڑھیں۔ طویل سجدوں میں اس کی خدا سے بس ایک ہی التجا ہوتی کہ اسے اس ذلت سے بچالے دو ماہ اذیت کے پل صراط پر لمحہ لمحہ چلنے کے بعد آخر وہ قریبی ہیلتھ کلینک سے اپنا چیک اپ کرا کے اطمینان سے ہوئی تو ایک بار پھر خدا کے حضور سجدۂ شکر بجالائی۔

اس کے بعد وہ اتنا خوفزدہ ہوئی تھی کہ تنہا گھر سے نکلنے کا تصور بھی کبھی نزدیک نہ آنے دیا۔ وقت رُکتا نہیں ہے چاہے کتنا ہی کڑا کیوں نہ ہو

جس روز ماما نے اسامہ اور حذیفہ کا اسکول میں ایڈمیشن کروایا جانے کیوں بہت سارے ضبط اور حوصلے کے باوجود وہ ایک بار پھر بکھر گئی تھی۔ زیاں کا احساس اُس کا دل رگیدتا رہا تھا۔ زندگی کے قیمتی ماہ و سال کسی کے بے حسی اور بے جا نفرت کی بھینٹ چڑھتے جارہے تھے۔ اور جب ماما نے اسے گاڑی لے کردی اور ڈرائیونگ سیکھنے کا کہا کہ بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کی سہولت ہوجائے گی۔ تو حوریہ انکار نہیں کرسکی۔

☆......☆......☆

اسامہ اور حذیفہ کی پانچویں سالگرہ تھی اور دونوں کی یہ رٹ بھی کہ اس مرتبہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں سلیبریشن ہونی چاہیے' حوریہ نے سمجھایا بھی تھا۔

''بیٹے دادو کے ساتھ گھر پر ہی کیک کاٹ لیں گے نا جیسے ہمیشہ کاٹتے ہیں۔'' تب اسامہ جس کی فطرت میں ضد اور غصے کا سفر زیادہ تھا بری طرح سے اینٹھ گیا تھا۔

''میرے سارے فرینڈز اپنے پاپا مما کے ساتھ ہوٹل میں سالگرہ کا فنکشن ارینج کرتے ہیں ۔آپ نے بھی ایسا نہیں کرلیا۔ ایک تو ہمارے پپا بھی کبھی نہیں آتے۔ نہ آپ ہماری فون پر بات کراتی ہیں کہ ہم ان سے آپ کی شکایت کرسکیں۔'' حوریہ گم صم بیٹھی رہ گئی تھی۔ ان کے باپ کے متعلق ہونے والے سوالوں کے جواب میں ماما نے ہمیشہ ایک ہی بات کہی تھی۔ وہ جاب کے سلسلے میں آؤٹ آف کنٹری ہیں۔

''کب آئیں گے؟'' اسامہ سوال کرتا۔

''جلدی......'' ماما کی ڈھارس اور تسلی کا ایک ہی انداز ہوتا مگر اب بچے اکتانے لگے تھے۔ اُن کا یقین بھی جیسے اس تسلی سے اٹھ گیا تھا۔ جب اسامہ یہ رٹ لگا رہا تھا تب بچوں کے نانا نانی نے انہوں نے اسامہ کی بات مان لی تھی اور اس کی خواہش کے مطابق ہوٹل میں ان کی برتھ ڈے کو سلیبریٹ کیا گیا جس میں دونوں بچوں کے فرینڈز نے شرکت کی تھی۔ ماما اپنی طبیعت کی خرابی کی بنا پر وہاں شریک نہیں ہوئیں اور گھر پر ہی گفٹ وغیرہ دے کر وش کردیا۔ بچوں کے ساتھ رات دس بجے جب وہ گھر لوٹی تو پورٹیکو میں کھڑی سیاہ نسان کو پاپا کے ساتھ اس نے بھی کسی قدر حیرانی سے دیکھا تھا۔

''شاید کوئی مہمان آیا ہو'' اُس نے خود ہی ایک قیاس کرلیا۔ اچھلتے کودتے اسامہ کی انگلی تھامے اور سوئے ہوئے حذیفہ کو بامشکل اٹھائے ہوئے حوریہ نے جب لاؤنج میں قدم رکھا تو اپنی جگہ ٹھٹک کر ساکن ہوگئی۔ صوفے پر بیٹھی مما کی گود میں سر رکھے کارپٹ پر دوزانو بیٹھا ہوا وہ شہیر ملک کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس کی ساکن آنکھیں ماما کی حیران نگاہوں سے ملیں تب وہ حذیفہ کو بازوؤں مین بھینچے الٹے قدموں بھاگتی اپنے کمرے میں جاگھسی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ تین سالہ اس کی بیٹی عیشا اس کے ساتھ تھی جسے علیحدگی کے بعد عانیہ نے اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ بات مما کے توسط سے اس تک پہنچی تھی۔ شہیر بہت ساری تبدیلیوں کے ساتھ ویسا ہی جاذب نظر تھا کچھ دنوں تک تو وہ حوریہ سے نظریں چراتا رہا شرمندگی و خجالت کے ہر انداز سے عیاں تھی مگر دھیرے دھیرے وہ سیٹ ہوگیا کہ ماما کی چند روزہ ناراضگی بھی بالآخر ختم ہوگئی تھی اور انہوں نے تو اسے پہلے دن ہی کھلے بازوؤں سے قبولا تھا۔ شہیر نے آفس جانا شروع کیا تو حوریہ نے ماما

کے چہرے پر بھی اطمینان دیکھا تھا۔ جب ماما نے اسے کہے بغیر عیشا کی ذمہ داریاں اپنے ذمے لیں تو حوریہ نے انہیں منع کر دیا تھا۔

اسامہ اور حذیفہ کی طرح یہ بھی میری اولاد کی طرح ہے ماما! آپ اس کی طرف سے فکر مند رہنا چھوڑ دیں۔'' اور ماما اتنی مشکور ہوئی تھیں کہ بھیگتی آنکھوں سے اسے گلے لگا لیا تھا۔

''مجھے تم پر فخر ہے بیٹا! ہمیشہ سکھی رہو۔'' پھر اس نے اپنے رویے سے یہ بات ثابت بھی کر کے دکھائی تھی۔ اس نے پاپا سے کہہ کر عیشا کا ایڈمیشن بھی اسامہ اور حذیفہ کے ساتھ اسکول میں کروا دیا۔ بچوں کو اسکول چھوڑنے کی ذمہ داری ابھی بھی حوریہ کی ہی تھی۔ اس روز بھی ناشتے کی تیاری بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنے کا کام ساتھ ساتھ نپٹا کر وہ انہیں ٹیبل پر ناشتہ کرنے چھوڑ کر کمرے میں آ گئی۔ گاڑی کی چابی اٹھائی اور چادر اوڑھ کر عجلت بھرے انداز میں پورٹیکو میں آئی تو تینوں بچے گاڑی میں موجود تھے۔ اسے اصل جھٹکا شہیر ملک کو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان دیکھ کر لگا تھا۔

''مما اب ہم پپا کے ساتھ اسکول جایا کریں گے۔'' اسامہ نے خوشی سے چہک کر اطلاع دی تو حوریہ گہرا سانس کھینچتی بنا کسی تاثر کے پلٹ پڑی۔

''حوریہ......'' بھاری بھر کم آواز میں کچھ تو ایسا تھا کہ اس کے بڑھتے قدم بے اختیار ٹھٹک گئے۔

''یہاں آؤ نا مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے پلیز......'' حوریہ کے گردن موڑ کر دیکھنے پر وہ کسی قدر ملتجی ہو کر بولا تھا مگر حوریہ نے سر جھٹک دیا اور تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔ شہیر ملک کے وجیہہ چہرے پر بے بسی کا تاثر ابھر آیا تھا۔

☆......☆......☆

مما آج اسکول میں بریک ٹائم میں بچوں نے عیشا کو دھکا دے کر گرا دیا۔ دیکھیں اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی ہے۔ اسامہ نے نہ تو عیشہ کو اٹھا کر کھڑا کیا نہ بچوں کو ڈانٹا حالانکہ وہ اسی کے فرینڈ تھے۔'' حذیفہ کو ہوم ورک کرتے اچانک یاد آیا تو ہاتھ روک کر حوریہ کو بتایا تو حوریہ نے چونک کر باری باری تینوں کو دیکھا۔ اسامہ کے تاثرات میں نخوت جبکہ عیشہ کے معصومیت تھی۔

''بیٹا آپ کو اٹھا لیتے بہن کو......'' حوریہ نے عیشا کو اپنی گود میں بٹھا کر فراک ہٹا کر گھٹنا چیک کیا تو زخم موجود تھا اس نے دراز سے مرہم نکال لیا۔

''اسامہ بیٹے آپ کے فرینڈ نے بہن کو مارا آپ نے پھر بھی اسے منع نہیں کیا کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ میری بہن نہیں ہے۔'' اسامہ کے تڑخ کر جواب دینے پر حوریہ نے ٹھٹک کر اس کی صورت دیکھی تھی۔

''واٹ یو مین اسامہ! عیشہ آپ کی بہن نہیں ہے یہ بات آپ سے کس نے کہی؟'' اس کے لہجے میں کسی قدر سختی در آئی تھی۔

''یہ میری رئیل سسٹر تو نہیں ہے نا مما! اسٹیپ سسٹر اسٹیپ مدر کی طرح ہی گندی ہوتی ہے نا۔'' حوریہ سناٹوں کی زد پر آ گئی تھی۔ اس کا یہ لمحاتی سکتہ ٹوٹا تو بازو سے پکڑ کر اسامہ کو خود سے نزدیک کر لیا۔

''بری بات بیٹے! بہن صرف بہن ہوتی ہے۔ رئیل یا اسٹیپ کے بارے میں کس نے آپ کو بتایا؟ اور ہاں آئندہ میں آپ کے منہ سے ایسی باتیں نہ سنوں...... ورنہ خفا ہو جاؤں گی آپ کو پتہ ہے ایسی باتیں گندے بچے کرتے ہیں اور اسامہ تو گندا بچہ نہیں ہے نا؟ اور آئندہ عیشہ کے لیے یوں کیئرلیس بھی نہیں ہونا...... آپ بڑے بھائی ہو عیشہ کے اور بڑے بھائی ہمیشہ بہنوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ پرامس کرو اب ایسا نہیں کرو گے۔'' وہ اس سے وعدہ

لے رہی تھی اور اتنے رسان اتنی محبت سے سمجھا رہی تھی کہ اپنے کسی کام سے اُدھر آئے شہیر ملک نے ساری بات سنی تھی اور اس کی اعلیٰ ظرفی، سمجھداری کا قائل ہو کر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

ماما نے شہیر ملک کی پریشانی اور اجاڑ صورت کو دیکھتے ہوئے حوریہ کو پاس بٹھا کر اچھا خاصا طویل لیکچر دیا تھا جس کا لب لباب معاف کر دینے کی عظمت تھا۔ حوریہ سمجھ گئی تھی اُن کا مقصد مگر خاموش بیٹھی رہی۔

''شہیر نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے حوریہ بیٹا! تمہاری زندگی کا اجاڑ پن بھی میرے سامنے رہا ہے۔ وہ تمہاری طرف منتظر نظروں سے دیکھتا ہے۔ میں چاہتی ہوں اب تم اَنا کی اس دیوار کو اپنے بیچ سے گرا دو۔ اور پھر سے ایک ہو جاؤ۔''

اور حوریہ نے گہرا سانس بھر کے بنا کسی احتجاج کے ان کی بات مان لی جس کے نتیجے میں اب شہیر ملک کے کمرے میں تھی وہ......

''مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے حوریہ پلیز کچھ دیر تو بیٹھو میرے پاس۔''

بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے وہ اسے کب سے وارڈ روب سیٹ کرتے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر بول پڑا کہ وہ یقیناً دانستہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔

''آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔'' وہ ہنوز مصروف رہ کر بولی تو اس کے سپاٹ چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوا شہیر ملک خود اٹھ کر اس کے نزدیک آ گیا۔

''مجھ سے خفا ہو نا تم؟'' حوریہ نے نگاہ بھر کے اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر سے الماری میں کپڑے لٹکانے لگی۔

''مجھے اعتراف ہے حوریہ کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا بہت زیادتیاں کی ہیں مگر پلیز مجھے معاف کر دو۔'' دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ سراپا عاجز ہو کر بولا۔

''مجھے اجازت تو دو حوریہ میں تمہارے سارے زخموں پر مرہم رکھنے کو بے چین ہوں۔ مجھے اس مجرمانہ شرمندگی کے احساس سے نکال لو۔ پلیز اپنے مہربان وجود کی چھاؤں سے میرے اندر کی دھوپ مٹا دو۔''

اسے بازوؤں کے حصار میں جکڑ کر اس کے شانے پر سر رکھتا ہوا وہ گلوگیر آواز میں بولا تو حوریہ گم صم سی کھڑی رہ گئی۔

''میں آپ کو روکنے پر قادر نہیں ہوں شہیر ملک! لیکن ایک بات ذہن میں رکھیے گا آپ کی قربت میں مجھے خود پر بہت جبر کرنا پڑے گا۔ مجھے آج بھی یہی لگے گا جیسے میں آپ کی بیوی نہیں آپ کی داشتہ ہوں۔'' معاً سارے آنسو اندر اُتار کر اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے ادا کیا تو شہیر کے بازو اس کے شانوں سے ڈھلک کر اپنے پہلوؤں میں گر گئے۔ چہرا ایک دم سفید پڑ گیا۔

''حوریہ......'' اس کے ہونٹ کانپے تھے۔

''یہ سزا مت دو مجھے پلیز......'' اس نے کسی قدر عاجزی سے کہا تو حوریہ زہر خند سے ہنس پڑی۔

''یہ سزا تو آپ نے برسوں قبل مجھے دی تھی۔ ایک شریف لڑکی کو اپنی رکھیل بنا کر، ایسا ہی رویہ و سلوک تھا نا آپ کا میرے ساتھ...... آپ تو ہمیشہ سے خود مختار رہے ہیں کس نے روکا ہے آپ کو؟ آپ کی تحویل میں ہوں میں......''

''مگر مگر میں تمہیں تمہاری رضا سے......''

''ہاہ رضا...... یہ لفظ آپ کے منہ سے کچھ جچتا نہیں ہے۔'' وہ حقارت سے ہونٹ سکوڑ کر بولی تو شہیر لب بھینچتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

میں اس کی دسترس میں ہوں لیکن
وہ مجھے میری رضا سے مانگتا ہے
جب ماما نے مجھ سے کہا تھا میں شہیر کو معاف کردوں تو میں ہمیشہ کی طرح خاموش رہی۔ سوائے ان کی بات ماننے کے میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ مجھے سال گزرنے کے باوجود میں ماما کو نہیں بتا پائی تھی کہ ان کے بیٹے نے اس دن ہوٹل میں مجھے کیسے میری ہی نظروں سے گرادیا تھا۔ میرے وجود پر جتنے بھی زخم اس کی وحشتوں کے نشان بن کر اترے تھے۔ وقت کے ساتھ بھلے بھر گئے مگر روح کے زخموں کا کیا کروں؟ جو کینسر بن گئے ہیں۔ عورت سب کچھ بھلا سکتی ہے مگر اس حد تک کی گئی تذلیل نہیں جو ایک تھرڈ پرسن کے سامنے میری ہوئی تھی۔ ہوٹل کے ملازم کے علاوہ وہاں کی انتظامیہ کی نگاہوں میں میرے لیے جو تھا وہ مجھے یاد آتا ہے تو وجود پر کوڑوں کی ضرب محسوس کرتی ہوں۔

اس سے آگے بہت سارے صفحات خالی تھے۔
شہیر کے اندر اضمحلال گہرا ہونے لگا۔ وہ اپنی جگہ کچھ غلط بھی تو نہ تھی۔ ایک جگہ اس کے ہاتھ کی حرکت تھمی اور نگاہیں سطروں پر جا رکیں۔

مجھے مصروف رہنے دو
تمہاری یاد کی کرنوں کو اب رستہ نہیں ملتا
کہ میری جان کھا جائیں
بہت مصروف رہتی ہوں
تمہاری یاد کی کرنوں سے کتنی دور رہتی ہوں
تب اور اب کی اس لڑکی میں
چند صدیوں کی دوری ہے
مجھے یہ فکر لاحق ہے
ابھی کھانا بنانا ہے ابھی میٹھا بنانا ہے
ابھی تو پیاز کاٹنے ہیں ابھی سیلڈ بنانا ہے
ابھی سب آنے والے ہیں ابھی ٹیبل سجانا ہے
ابھی بچوں کے کپڑوں کو بھی دھونا ہے
ابھی بچوں کو کل کے واسطے لکھنا لکھانا ہے
ابھی برتن بھی دھونے ہیں ابھی جھاڑو لگانی ہے
ابھی پھر شام ہوتی ہے ابھی چائے بنانی ہے
ابھی مہمان آئیں گے مجھے گھر کو سجانا ہے
ابھی مجھ کو تمہاری یاد کی فرصت نہیں ملتی
مگر سوچو یہ اچھا ہے
تیرے حق میں میرے حق میں
کہ میری یاد کی دنیا کو اب ویران رہنا ہے
مجھے تم سے یہ کہنا ہے مجھے بس کام کرنے دو
مجھے مصروف رہنے دو
مجھے مصروف رہنے دو

تحریر کے الفاظ شہیر ملک کی نگاہوں میں دھندلا گئے۔ نم پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارتے ہوئے اس نے مزید پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور ڈائری کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اسے یاد تھا جب شادی کے تیسرے دن وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا تو حوریہ سسکتی ہوئی آ کر اس کے بازو سے لپٹ گئی تھی۔

''مت جائیے شہیر مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جائیے۔ میں جیتے جی مرنا نہیں چاہتی...... میں آپ کا ہر ستم سہہ لوں گی مگر مجھے دنیا کی نگاہوں میں آنے سے بچالیں۔''

مگر تب وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر پلٹ کر دیکھے بنا چلا گیا تھا۔ تب وہ ہر احساس سے عاری تھا اور آج آج حوریہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی تو بھی وجہ وہی تھا۔ وقت کا الٹا چکر شروع ہو چکا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا حوریہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے معاف کر سکے گی بھی کہ نہیں...... البتہ اس نے خود سے عہد ضرور کیا تھا کہ وہ اس پر جبر نہیں کرے گا۔ یہ یقیناً اس کے اعمال کی بہت معمولی سزا تھی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

ثمینہ فیاض

محرومی اک احساس

ایک معصوم کی داستان جو اپنے باپ کے وقت کی طلب گار تھی

آج اس کی زندگی میں اک طوفان آ کر گزر گیا تھا اس کے باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا وہ باپ جو اس کی ہر خواہش کو اس کی زبان پر آنے سے پہلے پوری کروا دیتا تھا۔ اپنے مخملی بستر پر لیٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ سب رو رہے تھے مگر اس کی آنکھ میں اک آنسو بھی نہ تھا تدفین کے بعد سب اپنے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے۔ اب بس وہ تھی اور گھر کے ملازم تھے، کہتے ہیں جب کوئی آپ کا پیارا اس دنیا سے جاتا ہے تو دل کو بہت دھچکا لگتا ہے آنسو خود بخود آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں مگر کیا وجہ تھی کہ اسکا دل اداس نہیں تھا۔

حیا اک اپر کلاس کی فیملی سے تعلق رکھنے والی اک بہت سوبر سی لڑکی تھی دولت کی کوئی کمی نہیں تھی ہر فرمائش ہر ضرورت لمحوں میں پوری ہو جاتی تھی۔ 2000 گز کے رقبے پر پھیلی ہوئی یہ کوٹھی اس کے اندر بسی تنہائی کو اور بڑھا دیتی تھی بچپن سے جوانی تک 600,400, 1000 اور 2000 گز کے مکانات میں وہ اپنے قد اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گھر کے رقبے کو بھی بڑھتا دیکھتی رہی تھی اور اسی حساب سے ملازمین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی ماں کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور بچپن سے آج تک باپ کو اپنے دفتری امور اور میٹنگز سے ہی فرصت نہیں تھی ہاں کبھی کبھی جب وہ فری ہوتے تو چند سوال اس سے ضرور کرتے تمھاری اسٹڈیز کیسی چل رہی ہیں؟ کوئی چیز کوئی ٹو آئے چاہیے تو بتاؤ!۔ وہ اپنی ہر برتھ ڈے اپنی سہیلیوں کے ساتھ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تو سیلیبریٹ کر لیتی لیکن اپنے باپ سے برتھ ڈے وش سننے کو ترستی رہتی وہ انتظار کرتے کرتے سو جاتی کہ شاید اب پپا آ کر اسے گود میں اٹھائیں اور اسے پیار کرتے ہوئے وش کر دیں ہاں ان کے پی اے کے ذریعے آنے والا کوئی بہت خوبصورت گفٹ چند لمحے کو تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ لے آتا لیکن پھر اداسی اس کے اوپر طاری ہو جاتی۔ بعض اوقات ملازمین کے منہ سے نکلنے والے جملے اس کے کچے ذہن میں ایسے پیوست ہو

تے کہ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ملازمین جب اسکے پپا کے سڑیل دماغ ہونے اور ان کے ساتھ برا سلوک کرنے کے بارے میں اک دوسرے سے باتیں کرتے تو وہ باتیں اس کے ذہن کے کسی کونے میں جا دبکتیں ۔وہ بہت خاموش رہنے لگی لیکن ساتھ اپنے باپ کے کہے ہوئے جملے بھی اس کے کانوں میں گونجتے یہ ہمارے ملازمین ہیں ان سے زیادہ فری نہ ہوا کرو کوئی تم کو کچھ نہیں کہہ سکتا ہاں تم ان پر حکم چلا سکتی ہو انہیں ان کی اوقات میں رکھنا اگر کوئی بھی تمھاری بات نہ مانے مجھے بتانا میں اسے نکال دوں گا

اسکول میں آدھا دن گزارنے کے بعد جب وہ گھر آتی تو اس گھر کی تنہائی سے اسے وحشت سی ہونے لگتی دل چاہتا یہاں سے کہیں نکل بھاگے گھر کے خالی کمرے عجیب پر اسراریت کا احساس اس کے دل میں جگا دیتے وہ راتوں کو اٹھ کر چیخنے لگتی گویا کوئی خواب دیکھا ہو آیا اماں اس کے پاس سوتیں لیکن ڈر تھا کہ اسکا پیچھا ہی نہ چھوڑتا تھا ساری رات اس کے کمرے کی لائٹ آن رہتی اسے جب بھی کسی چیز سے خوف محسوس ہوتا وہ چیز اس گھر سے باہر پھینک دی جاتی لیکن اگلے دن پھر کسی اور چیز کا خوف اس پر طاری ہو جاتا۔اس کے پپا کو اس کی اسٹڈیز، ہیلتھ، اسپورٹس اس کے اسٹینڈرڈ کی تو بہت فکر تھی لیکن کبھی اس کی تنہائی کو ختم کرنے کے بارے میں نہیں سوچا وہ سارا دن یا تو ٹی وی کمپیوٹر کے ساتھ لگی رہتی ان پر کارٹونز یا ویڈیو گیمز کھیلتی رہتی یا پھر نوکروں کے ساتھ کھیلتی رہتی انہیں ڈانٹتی ان پر غصہ کرتی ان سے لڑتی اور پھر ان کو منا کر ان کے ساتھ دوستی بھی کر لیتی کہ شاید وہ ان کے بغیر اب رہ بھی نہیں سکتی تھی ان سب کی عادی ہو گئی تھی گویا اس کے پپا تو اس سے دور ہو گئے تھے مگر نوکر اس کی فیملی ممبر کی طرح اس کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے آیا اماں نے ہی اس کی

تربیت کی اسے اب اپنے پپا کا انتظار بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اب عادی ہو چکی تھی۔ لیکن ہر بار کوئی بھی خاص موقع ہو چاہے اس کا رزلٹ آیا ہو جس میں وہ فرسٹ آئی ہو یا کوئی کمپٹیشن جیتی ہو سالگرہ ہو یا کوئی بھی اہم بات دل میں اک امید ضرور جاگ جاتی کہ شاید پپا آج جلدی آجائیں تو وہ مل کر سیلیبریٹ کریں اور پھر ہر مرتبہ کی طرح وہ اپنے ڈرائیور کک مالی چاچا آیا اماں کریمن بوا کے ساتھ کسی ریسٹورینٹ یا پارک میں جا کر خوش ہو جاتی اپنے دل کو بہلاتی اور آیا اماں اسے ہر بار کی طرح آنے والے سال کے رزلٹ سالگرہ یا اور کوئی خاص موقع کا سہارا دے کر دلاسا دیتیں اس کی امید باندھنے کے اک کمزور سی کوشش کرتیں۔

کل وہ پارک میں بھاگتے بھاگتے گر گئی تھی اور پپا اسے دیکھنے آئے تھے 10 منٹ بیٹھنے کے دوران انہوں نے اسے تو کم ہی دیکھا نوکروں کی شامت زیادہ بلائی تم سب کو تنخواہ اس بات کی دیتا ہوں یہ خیال رکھا ہے تم لوگوں نے میری بچی کا وہ سوچتی رہ گئی کہ پپا اسے دیکھنے آئے تھے یا ان ملازمیں کو اک بار پھر ان کی اوقات یاد دلانے کے لیے جو وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔

حیا اپنی زندگی کی 22 سال اسی تنہائی کے عذاب میں گزار چکی تھی وہ اب کراچی یونیورسٹی سے بیچلرز ان سائیکولوجی کر رہی تھی وہ اکثر اپنے گھر کے قریب بنے پبلک پارک میں جا کر بیٹھ جاتی تھی حالانکہ اسکے اپنے گھر میں اچھا خاصہ لان تھا لیکن اسے تو انسانوں کے درمیان بیٹھنا تھا ہنستے کھیلتے ہوئے بچے کھلکھلاتے چہرے زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے لوگ اسے زندگی کی طرف راغب کرتے تھے ۔وہ اپنے ساتھ کریمن بوا کو بھی لے آئی تھی

وہ حسرت سے بھرے لہجے میں پارک میں بیٹھے لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہتی ہے کریمن بوا کتنے خوش نصیب ہیں نہ یہ لوگ اک دوسرے کے ساتھ وقت بتاتے ہیں ساتھ ہنستے ہیں کھیلتے ہیں۔ اک بات بتائیں بوا آپ کے ابو آپ کو کتنا پیار کرتے تھے؟

کریمن بوا بٹیا ہر ماں باپ اپنے بچوں سے پیار کر تے ہیں بس انہیں ان کو پیار کرنے کا علیحدہ علیحدہ طریقہ ہوتا ہے۔ حیا اک بار پھر اسی بچوں کی معصومیت سے کہتی ہے لیکن میرے پپا تو ٹائم ہی نہیں دیتے تھے انہیں تو فرست ہی نہیں ملتی تھی بات کرنے کی بھی بات کیے ہوئے بھی تین تین دن ہو جا تے تھے ان سے بات نہیں ہوتی تھی میں رات سو جا تی تھی تو وہ گھر آتے تھے اور جب اٹھتی تو وہ جا چکے ہو تے تھے۔

کریمن بوا کو اسنے اپنے بچپن سے اس گھر میں دیکھا تھا یوں کہا جائے کہ ان کی گودوں میں کھیل کر بڑی ہوئی تو غلط نہ ہوگا شاید وہ اپنے پپا سے اتنا فری ہو کر بات نہیں کر پاتی تھی جتنا کریمن بوا سے اور جب سے آیا اماں کا انتقال ہوا تھا تب سے کریمن بوا اس سے زیادہ قریب ہو گئیں تھیں وہ اپنے دل کی ہر بات ان سے شیئر کر لیتی تھی اپنا ہر مسئلہ اپنا ہر دکھ اپنی ہر تکلیف ان ہی سے کہتی تھی اور وہ بھی اپنی بیٹی کی طرح اسے ہر بار اچھا مشورہ دیتیں اور اسے سکون مل جاتا تھا۔

بٹیا آج تمھیں ہم اپنے دل کی اک بات بتائیں

جی بوا کہیے نا وہ اک دم پرجوش ہو گئی

کریمن بوا سامنے کھڑے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں وہ سامنے شخص کو دیکھ رہی ہو ابھی اس کے بچے کی چپل ٹوٹ گئی تھی تو وہ بچے کو گود میں اٹھا کر لے گیا جب کہ چپل دوسرے ہاتھ میں پکڑ لی اسے دیکھ کر ہمیں اپنے بچپن کا اک واقع یاد آگیا

حیا پوری توجہ سے سنتے ہوئے دونوں پیروں سے پالتی مارتی ہوئی آگے ہو کر کھسک کر بڑی بے تا

بی سے ہاں بوا بتائیں بتائیں۔
جب بچپن میں اک مرتبہ میں اور میرے ابا باہر کہیں جا رہے تھے تو راستے میں میری چپل ٹوٹ گئی تو میں نے اپنے ابا کو وہ دکھائی ابا نے دیکھا اور ہاتھ سے چپل جوڑ کر آگے بڑھ گیا اور دو قدم چلنے کے بعد وہ پھر نکل گئی ابا کو تیز تیز جاتا دیکھ کر میں نے چپل ہاتھ میں اٹھائی اور ننگے پیر ابا کے پیچھے چل پڑی حالانکہ کئی پتھر اور کانٹے میرے پیر میں چبھے پر میری ہمت ہی نہیں پڑی کی ابا سے دوبارہ کہہ سکتی تکلیف سے میری آنکھ میں آنسو آگئے تھے۔ بوا کی آواز بھرا گئی۔
بیٹا تمھارے پپا اگر ٹائم نہیں بھی دیتے لیکن تمھاری ہر ضرورت کا خیال ضرور رکھا ہے انہوں نے بچپن سے آج تک تمہاری ہر فرمائش کو پورا کیا ہے۔ بوا کے انداز میں سچائی اور خلوص کی مہک تھی
اتنے میں ایک بچہ جو اپنے باپ کے ساتھ کھیل رہا تھا بھاگتے بھاگتے گر گیا اس کے باپ نے دیکھا تو دوڑ کر اس کے پاس آیا اسے پیار کیا اس کے آنسو پونچھے اور چوٹ کی جگہ پر جو گھٹنے میں لگی تھی پھونک کر اسے تسلی دیتا اسے گود میں اٹھا کر آگے بڑھ گیا وہ دونوں اسے جاتا دیکھتی رہیں
بیٹیا! مجھے یاد ہے کہ جب راستہ میں اک بار میں گر گئی تھی اور رونے لگی تھی تو ابا نے مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور غصے سے ڈانٹنے لگا کہ ہر وقت روتی ہے لڑکا ہوتا تو ایسے کبھی نہ روتا یہ کڑیاں ہی میرے متھے پئی ہیں کچھ نہیں ہوا ٹھیک ہو جائے گا جاؤ جا کہ مرو اب روتا نہ دیکھوں جب کہ میری ٹانگ سے خون نکل رہا تھا جو میں نے سڑک پر پڑے اک کاغذ سے صاف کیا اور آنسو پونچھ کر بیٹھ گئی اور ابا اپنے کاموں میں پھر مصروف ہو گیا تھا۔
تمھارے پپا تو رات رات بھر جب تم بیمار ہوتیں تھیں تمھارے سرہانے بیٹھ کر گزار دیتے تھے اک بار
تمھیں بخار ہوا تھا تو سیٹھ صاحب باہر کسی ملک گئے ہوئے تھے اپنی ساری میٹنگز کینسل کروا کر واپس آ گئے تھے۔ ہر بار کی طرح بوا اس کے دل سے باپ کی نفرت مٹانے کی کوشش کر رہی تھیں
ہمیشہ وہ انسان کامیاب رہتا ہے جو اپنی زندگی میں میانہ روی اختیار کرے چاہے وہ دولت ہو یا رشتے تمہارے بابا تم سے بہت محبت کرتے تھے اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں انہوں نے اپنی پوری زندگی تنہا گزار دی دوسری شادی بھی نہیں کی وہ چاہتے تھے کہ تم کبھی بھی کسی دوسری عورت کے رحم و کرم پر نا رہو۔ اس کا دل صاف کرنا چاہتیں تھیں۔
لیکن کیا فائدہ ہوا! ملازمین کے رحم و کرم پر تو چھوڑ دیا مجھے۔ حیا کی زبان پر اک شکوہ پھر ابھرا
ہاں! یہ غلطی ان سے ضرور ہوئی ہے وہ چاہتے تھے کہ تم زندگی میں کبھی کسی محرومی کا شکار نہ ہو مگر اپنے وقت کو تمھارے لیے میسر نہ کر سکے۔ بوا کو افسوس ہوا
۔ وہ دولت کے بہت امیر سہی پر رشتوں کو نبھانے میں مفلسی کا شکار رہے۔ آج میرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ۔ دوست بے تحاشا ہیں۔ عزت ہے بابا اپنی اور میری مرضی سے میرا رشتہ بھی طے کر گئے مجھے ہر طرح سے محفوظ کر گئے اپنے سارے کام اپنے وقت پر پورا کر گئے پر میری منتظر نگاہیں منتظر ہی رہ گیں۔ کاش کچھ لمحے دولت کے بجائے مجھے دیے ہوتے تو ان آنکھوں میں اداسی نہیں آنسو ہوتے جو ان کی یاد میں میری آنکھ سے بہتے اور اس محرومی کے احساس کے ساتھ ہی حیا کی آنکھیں جھلک اٹھیں اور وہ بوجھل دل کے ساتھ بستر سے اٹھ گئی۔
وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر اپنے پپا کی بخشش کے لیے پروردگار کے حضور جھک گئی۔

☆☆......☆☆

ایسا بھی ہوتا ہے

''اب آ بھی جائیں موبائل سے پیٹ نہیں بھرتا۔'' وہ دوبارہ کہہ رہی تھی لیکن اس بار خود اندر نہیں آئی صرف سر دروازے سے اندر کر کے پیغام پہنچایا تھا۔ ''نہیں کھانا مجھے کھانا تم کھالو میں ذرا ریحانہ سے بات کرلوں وہ آن لائن ہے اس وقت......'' اُس نے صرف بنیہ کو......

وہ جو صارم کو کھانے کے لیے بلانے آئی تھی کمرے کے اندر پاؤں رکھتے ہی اُس کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔ دل چاہا کہ شوہر نامدار کے کان سے چپکا فون کسی ایسی جگہ چھپا دے یا دیوار سے دے مارے تاکہ دوبارہ کسی فرزانہ، رحمانہ یا دردانہ کا فون تو کجا Msg یا مس کالز تک نہ آ سکے۔ لیکن مسئلہ صرف یہی تھا کہ وہ یہ سب صرف سوچنے کی حد تک آزاد تھی۔ پریکٹیکل کرنا تو آ بیل مجھے مار بلکہ آ شوہر مجھے مار کے مترادف تھا۔ سو ایک چپ سو سکھ کے اصول پر زبردستی ہی کاربند تھی۔

''کیا ہوا گھور کیوں رہی ہو آج لنچ میں مجھے کھانے کا ارادہ ہے کیا وہ بھی سالم اور کچا......'' وہ جو غصے کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے اپنے ہی خیال میں گم اُسے گھورے جا رہی تھی۔ صارم کے یوں ہاتھ نچا کے بولنے سے ہوش کی دنیا میں واپس لوٹی۔

''کیوں آپ بکرے ہیں کیا جو میں آپ کو کھاؤں گی اور وہ بھی کچا اور سالم......'' طنزیہ نظروں سے گھورتے اُس نے اُسی کے لہجے میں وہی الفاظ دہرائے۔

''لگ تو یہی رہا ہے کہ تم مجھے نظروں ہی نظروں میں نگل جاؤں گی۔'' اُس نے میسج ٹائپ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے زہریلی چیزیں کھانے کا ذرا بھی شوق نہیں ہے۔ اس لیے میں کھانا لگانے جا رہی ہوں۔ آپ اگر اپنی چہیتیوں سے فارغ ہو جائیں تو آ جائیے گا۔'' وہ غصے سے تن فن کرتی کچن کی طرف چلی گئی لیکن جاتے جاتے وہ کمرے کا دروازہ زور سے بند کرنا نہیں بھولی۔

یہ اُس کے آخری حد کو چھوتے غصے کی نشانی تھی۔ صارم نے ناک چڑھا کے اُسی کے الفاظ دہرائے۔

''اپنی چہیتیوں سے فارغ ہو جائیں تو آ جائیے گا۔'' اُس کا موڈ بھی خراب ہو چکا تھا۔

''کیا ہو جاتا جو کبھی مجھ سے بھی 2 بول میٹھے بول بول دے۔ سارے زمانے کے لیے نرم اور

پیار کرنے والی صرف میرے لیے ہٹلر بنی پھرتی ہے نجانے کیا بیر ہے اِسے مجھ سے......'' اپنے شوہر سے......وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگا۔ ہنیہ کو غصہ دلانے کے لیے اب وہ بیڈ پر لیٹ کے خوامخواہ ہی موبائل اٹھائے Whats App میں سب کو چیک کر رہا تھا کہ کوئی Online ہو تو اُس کے ساتھ ٹائم پاس کر کے غصیلی بیوی کو اور غصہ دلایا جائے۔ پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ کس سے فون پر بات کر رہا ہوں۔ خود سے 'چھیتی' سوچ لیا ایک بار آرام سے پوچھتی تو میں بتا نہ دیتا کہ صفدر کا فون تھا۔ لیٹے لیٹے سب کا Status چیک کرتے وہ خود سے ہی اُلجھا جا رہا تھا۔

''اب آ بھی جائیں موبائل سے پیٹ نہیں بھرتا۔'' وہ دوبارہ کہہ رہی تھی لیکن اس بار خود اندر نہیں آئی صرف سر دروازے سے اندر کر کے پیغام پہنچایا تھا۔

''نہیں کھانا مجھے کھانا تم کھالو میں ذرا ریحانہ سے بات کرلوں وہ آن لائن ہے اِس وقت......''

اُس نے صرف ہنیہ کو غصہ دلانے کے لیے ریحانہ کا نام استعمال کیا تھا کیونکہ ریحانہ کا آن لائن ہونا تو دور کی بات اُس کے موبائل میں کسی بھی ریحانہ نام کی لڑکی کا نمبر ہی Save نہ تھا۔ توقع کے عین مطابق ہنیہ پیر پٹختی جا چکی تھی اور اِس بار دروازہ بجنے کی آواز ایسی تھی گویا نزدیک ہی کہیں بم پھٹا ہو ایسی زوردار اور دل دہلانے والی آواز......

☆......☆......☆

صارم اور ہنیہ کی شادی کو سال بھر ہوا تھا۔ ہنیہ کا میکہ اور سسرال دونوں لاہور میں تھے۔ وہ صارم کی جاب کی وجہ سے سب سے دور کراچی میں رہ رہی تھی۔ ویسے تو دونوں ہی بھرے پرے گھر سے تھے مگر صارم کا زیادہ وقت دفتر میں گزر جاتا تھا اور ہنیہ کاموں سے فارغ ہو کر بولائی بولائی سارے گھر میں گھومتی رہتی۔ کمپنی کی طرف سے انہیں بہت خوبصورت اپارٹمنٹ ملا تھا مگر 2 لوگوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے۔ لہٰذا سجے سجائے گھر میں بھی اُس کا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔

اب کچھ دنوں سے دونوں میں یہ کھٹ پٹ جاری تھی ہنیہ کو صارم کا فون کو ہاتھ لگانا ہی برا لگتا تھا اور اپنی ناراضگی کا اظہار وہ بلاوجہ کے کاموں میں خود کو اُلجھا کر کرتی تھی۔ اِدھر صارم کو اُس کا ہر وقت مصروف رہنا کھلتا تھا اور وہ ہنیہ کو تنگ کرنے کا کوئی موقعہ نہیں جانے دیتا تھا۔ دونوں ہی خود ترسی کا شکار ہو رہے تھے وہ بھی بلاوجہ......

''شادی کرنے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ بیوی کو گھر میں غلاموں کی طرح رکھ کے باہر کی عورتوں سے گپ شپ لگائی جائے۔ اُن سے تو اتنے اچھے طریقے سے بات کرتے ہیں بس صرف میں ہی بری لگتی ہوں۔ مجھے ہی کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ آپ لوگ بتائیں میں کوئی غلط بات تو نہیں کر رہی ناں......سارا سارا دن گھر کا کام اُس کے بعد شام تک مجازی خدا کا انتظار کرنا اور جب مجازی خدا کی انٹری ہو تو منہ پر بارہ بجے ہوں سیدھی بات کا جواب بھی یوں ملے گویا ابھی ثابت نگل لیں گے۔ ذرا جو میرا خیال ہو کہ سارا دن اکیلی پڑی سڑتی رہی ہے چلو دو گھڑی پیار سے حال چال ہی پوچھ لوں پر ناں جی ایسا کرنے سے شوہرانہ ناک کٹ کر زمین پر نہ گر جائے گی اور جہاں تک پیار کے دو بولوں کی بات ہے وہ تو آفس میں اور واٹس اپ کے ذریعے اپنی لاڈلیوں سے کہتے ہیں رہتے ہیں۔ سو میرے لیے کچھ بچتا ہی نہیں۔''

''میرے بس میں ہو تو میں صارم کے موبائل

کے اتنے ٹکڑے کروں کہ کیا ہی کسی لیلیٰ نے ناکام مجنوں کے دل کے اتنے ٹکڑے کیے ہوں۔''
وہ ٹی وی آن کیے اپنے ہی خیالوں میں گم تھی جب سامنے میز پر پڑے صارم کے موبائل کی Msg ٹون بج اٹھی۔ دل میں تجسس نے انگڑائی لی۔

دوڑ کے ساتھ والے کمرے میں کسی کتاب میں گم شوہر پر نظر ڈال کے مطمئن سی تیز گام بنی واپس پہنچی۔ جھٹ سے موبائل اُٹھا کے اسکرین آن کی لیکن سامنے پن کوڈ مانگتی اسکرین کو دیکھ کے اُسے رونا ہی آ گیا۔
''اچھا تو اب کوڈ بھی لگ گیا۔'' غصے کے مارے وہ الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگی ہی تھی جب اندر آتے صارم نے اُسے خونخوار نگاہوں سے دیکھا۔
''یہ کیا کر رہی ہو؟ میرا آئی فون اپنے خونخوار ناخنوں سے نوچنے کا ارادہ ہے کیا؟'' اُس نے موبائل ہنیہ کے ہاتھ سے جھپٹ ہی تو لیا۔
''اب میرا غصہ اِس بے جان پر نکالو گی کیا؟ حد ہے یار جنگلی پنے کی بھی......'' وہ اپنے مہنگے فون کو مختلف زاویوں سے گھما پھرا بلکہ نچا نچا کے جانچ رہا تھا۔
''اچھا تو میرا میسج چیک کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ تبھی یوں نوچ نوچ کے...... وہ تو شکر ہے میں نے کوڈ لگا رکھا ہے ورنہ تو آج سب ڈیلیٹ ہو جانا تھا۔'' اُس نے میسج کھول کے پڑھنے کے بعد اُسے غور سے دیکھتے کہا۔
''ظاہر ہے جب گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا تو پھر انگلی تو ٹیڑھی کرنی ہی پڑے گی ناں۔ اب آپ مجھ سے چھپانے کی خاطر کوڈ بھی لگایا کریں گے۔'' کہتے ہوئے وہ روہانسی ہو گئی لیکن

اگلے ہی پل خود پر کنٹرول پاتے دوبارہ سے اپنی پرانی ٹون میں واپس آئی۔
''مجھے بھی آج سے بلکہ ابھی سے آپ سے اور آپ کی چیزوں سے کوئی سروکار نہیں۔ جہاں دل چاہے منہ ماریں میری بلا سے......'' غصے اور صدمے کے مارے وہ اتنی بڑی بات آرام سے کہہ گئی۔
''یہ تو بڑی اچھی بات ہے میرے لیے لیکن تم وعدہ کرو کہ تم اپنے کہے پر عمل بھی کرو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ کوئی Msg آئے اور تم پھر سے کوڈ کھولنے کے چکر میں پڑ جاؤ۔ کھاؤ پھر اپنی قسم......'' وہ اُسے غصے کی انتہاؤں تک پہنچا رہا تھا۔ لیکن ہنیہ نے کمالِ ضبط سے کوئی جواب نہ دیا۔
''دیکھو ناں ابھی بھی ارم کا کتنا امپورٹنٹ میسج آیا ہے اگر تمہاری جاسوس طبیعت کی وجہ سے یہ ضائع ہو جاتا تو پھر......'' اُس نے جان بوجھ کے جملہ ادھورا چھوڑا اور موبائل کمپنی کی طرف سے بیلنس کم ہونے پر آنے والے میسج کو دوبارہ سے آنکھوں میں پیار سموتے پڑھنے لگا۔
''بھاڑ میں گئے آپ اور آپ کی ارم...... لعنت بھیجتی ہوں میں سب پر...... اگر آپ کوڈ لگا سکتے ہیں تو آج سے میرا موبائل چیک کرنے کی بھی ضرورت نہیں میں بھی کوڈ لگا کے رکھوں گی آج سے بلکہ اِسی وقت سے......'' وہ موبائل اُٹھا کے غصے سے تن فن کرتی باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

''عجیب بیوی ہے میری توبہ توبہ سارے زمانے کے لیے نرم دل اور ہمدرد سوائے میرے...... جب بات کرے گی مجھ سے بغیر لگی لپٹی ہی کرے گی۔ آپ سب کو بھی یقیناً مجھ سے

ہمدردی ہو رہی ہوگی۔ آخر کو انسانیت بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ جو میری بیوی کے اندر میرے لیے رتی برابر بھی نہیں ہے۔ اب آپ سب ہی بتائیں کہ میں کیا کروں مجھے کوئی مشورہ دیں کہ میں کیسے نبیہ سے نپٹوں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کیسے اُس کی عقل ٹھکانے پر لاؤں۔ وہ خود ترسی کا شکار ہوا بیٹھا تھا بلکہ وہ کیا دونوں ہی خود کو درست اور دوسرے کو غلط گردان رہے تھے۔ جبکہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر غلط تھے سو فیصد غلط......

☆......☆......☆

صارم نے اپنے بچپن کے دوست شہر یار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ساری بات کھل کر اُسے بتادی۔ صارم کو امید نہیں بلکہ یقین تھا کہ شہر یار ضرور اُس سے ہمدردی کرے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ نکلا۔ یار اس میں غلطی تمہاری بھی ہے۔ تم نے اپنے اور بھابی کے درمیان جان بوجھ کے اتنے فاصلے پیدا کردیے جس کی وجہ سے اب تم دونوں ایک دوسرے کو غلط سمجھ رہے ہو۔ شروعات تمہاری طرف سے ہوئی تھی اس لیے اب سب ٹھیک کرنے میں پہل بھی تمہیں ہی کرنی ہوگی۔

وہ اپنے جگری یار کے منہ سے اپنے خلاف یہ سب سننے کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھا۔ اسی لیے چونکا۔

''میری غلطی......میری کیا غلطی ہے۔'' اس میں......اُس کے لہجے میں شکوہ ہلکورے لے رہا تھا۔

''بقول تمہارے بھابی ساری دنیا کے ساتھ بہت خوشدلی سے ملتی ہیں سوائے تمہارے...... اِس کا مطلب کہ تم نے ضرور کچھ ایسا کیا کہ بھابی نے اُس 'ساری دنیا' کی گنتی سے تمہیں نکال باہر کیا۔ پھر جہاں تک میں سمجھا تم جان بوجھ کے بھابی کو غصہ دلاتے ہو شک میں مبتلا کرتے ہو۔''

''تم اچھے دوست ہو میرے ہی خلاف بھرے بیٹھے ہو۔'' صارم اُس کی بات کاٹ کے صدمے سے چور لہجے میں بولا۔

''یہی تو تیرا مسئلہ ہے میرے یار تُو خود پر رکھ کے سوچتا ہے۔ اچھا تم نے خود ابھی بتایا کہ بھابی ایک دن جب گھر کے کاموں میں تھوڑا بزی تھیں تو تم نے انہیں غصہ دلانے کے لیے اپنی خود ساختہ 'سہیلیوں' سے جلانا چاہا وہ کیا نام بتائے فرزانہ 'رحمانہ وغیرہ پھر اُس کے بعد یہ معاملہ آگے بڑھتا گیا۔ تم ہر دوسرے دن کسی نہ کسی بات پر خیالی لڑکیوں کا نام اور ذکر کرنے لگے حالانکہ میں تمہاری نیچر اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم نے شادی سے پہلے کبھی لڑکیوں کے ساتھ دوستی میں دلچسپی نہ لی تو شادی کے بعد کیا لوگے۔

لیکن یار میں تمہارا دوست ہوں اور بھابی تمہاری بیوی اور بیویاں اپنے شوہروں کے معاملے میں انتہائی کانشس بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شکی ہوتی ہیں۔ تمہارے ایک مذاق نے آج یہ حالت پیدا کردی کہ بھابی ہر وقت شک میں خود بھی پریشان رہتی ہیں اور تمہیں بھی رکھتی ہیں کیا سمجھے......''

وہ اُسے ایک اچھے اور مخلص دوست کی طرح سمجھا رہا تھا جو اُس کی عقل شریف میں بھی سما ہی گیا آخر......اور جب وہ وہاں سے اُٹھا تو ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھا۔ آخر کو وہ اُس کی بیوی تھی جس کے دل میں شک کا بیج اُس نے خود بُویا تھا۔ اب اس بیج کو تناور درخت بننے سے پہلے ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔

☆......☆......☆

اُس نے بددلی سے کھانا تیار کیا اور کمرے میں اندھیرا کیے پڑی رہی یونہی لیٹے لیٹے اُسے کافی دیر گزر گئی۔ اُسے لگا جیسے وہ اس گھر میں بیکار ہی پڑی ہے۔ دل امید کا دیا تھامے تھامے نڈھال ہو کے بیٹھنے لگا۔ آنکھوں میں مایوسی کے اندھیرے نے اپنے پنجے مکمل قوت سے گاڑ لیے۔ جب انہیں میرے ہونے نہ ہونے سے فرق ہی نہیں پڑتا تو میرا یہاں رہنا بے کار ہے۔

سوچ سوچ کے دماغ پھٹنے کے قریب تھا۔ وہ غائب دماغی سے اُٹھی اور الماری سے کپڑے نکال کے بیگ میں رکھنے لگی۔ دل و دماغ میں مایوسی کے جھکڑ چلنے لگے۔ وہ اتنی دلبرداشتہ ہو رہی تھی کہ ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھول کے اندر آتے صارم کو محسوس ہی نہ کرسکی۔ حالانکہ وہ اُسے اُس کی آہٹ سے نہیں بلکہ اس کی خوشبو سے ہی بنا دیکھے پہچان لیتی تھی۔

''یہ کیا تم کہیں جارہی ہو؟'' وہ اُسے سامان پیک کرتے دیکھ کے صحیح معنوں میں سٹپٹایا تھا۔ لیکن ہنیہ بناء کچھ بولے اپنی کارروائی مکمل کرتی رہی۔

''یار کیا کررہی ہو بولو ناں...... یہاں آؤ اِدھر آ کے بیٹھو'' وہ اُسے زبردستی گھسیٹتا ہوا بیڈ پر لے آیا۔

''یہاں بیٹھو اور میری بات غور سے سنو۔''

''اب کہنے سننے کو کچھ باقی ہے؟'' وہ بولی۔ تو اُس کے الفاظ سے زیادہ اُس کا لہجہ ہارا ہوا تھا۔

''بالکل! بہت کچھ ہے کہنے اور سننے کو آج میں کہوں گا اور تم سنو گی۔'' وہ اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے دل کی تمام گہرائیوں سے کہہ رہا تھا ایک پل کے لیے ہنیہ کو لگا کہ جیسے وہ اُس کا شادی کے اولین دنوں والا صارم ہو۔

''میں اُس سب کے لیے معافی مانگتا ہوں جو میں نے اتنے دنوں میں تمہیں چڑانے کے لیے کیا۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ تمہارا گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کا غصہ میں نے جھوٹ موٹ لڑکیوں کا نام لے کر نکالا یہ جانے اور سوچے بغیر کہ تم یہ سب کچھ میرے لیے ہمارے گھر کے لیے ہی تو کرتی تھی۔ کیا تم مجھے معاف کرو گی۔'' وہ اُس کے سامنے بیٹھا معافی مانگ رہا تھا سچے دل سے۔

''کیا...... کیا کہا آپ نے؟ وہ سب صرف مجھے چڑانے کے لیے تھا۔ سچ میں آپ کی دوستی کسی لڑکی سے نہیں۔'' وہ ایک پل میں ہلکی پھلکی سی ہوگئی۔

''اور نہیں تو کیا میں تمہیں ایسا ویسا لگتا ہوں کیا؟'' اب وہ اُس سے سوال کررہا تھا۔

''لگتے تو نہیں ہیں لیکن آپ خود ہی اپنے منہ سے......''

''بکواس کرتا تھا میں وہ سب اپنے منہ سے......'' صارم نے اُس کی بات کاٹ کے اتنی جلد بازی میں کہا کہ ہنیہ کو ہنسی آگئی۔

''اچھا جناب یہ بات ہے تو پھر میں بھی آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آج سے بلکہ ابھی سے آپ کو مکمل ٹائم دوں گی تاکہ آپ کا یہ جو شیطانی دماغ ہے یہ دوبارہ کسی غلط منصوبے کی طرف نہ لگے۔'' اُس نے شرارت سے اُسے دیکھا تو وہ اپنی معصوم اور سادہ سی بیوی کے لہجے میں اپنے لیے چھپے پیار کو محسوس کر کے مطمئن ہو گیا اور آسمان پر موجود چاند تارے بھی اُن کی اِس آسودگی پر خوشی سے مسکرا اُٹھے۔

☆☆......☆☆

تصویر کے پار

فارغ وقت میں میرے تین ہی مشغلے ہوتے ہیں' ٹی وی دیکھنا' مطالعہ کرنا یا پھر اس تصویر کو مسلسل دیکھتے رہنا۔ میرے نزدیک اس کمرے کی سب سے نمایاں چیز یہ تصویر ہے جسے دیکھتے کبھی میرا جی نہیں بھرتا۔ ایک دوست نے' تحفتہً دی تھی۔ قدردانی کے طور پر میں......

میں اپنے ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر بیٹھنے کا عادی ہوں وہاں سے ٹی وی مناسب طریقے سے دیکھا جاسکتا ہے ۔ سامنے دروازے پر بھی نظر رہتی ہے۔ کوئی آئے جائے میرے علم میں رہتا ہے۔ دائیں دیوار پر ایک تصویر ٹنگی رہتی ہے ۔ وہ بھی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

بوجوہ مجھے یہ جگہ پسند ہے۔ اگر کبھی مجبوراً جگہ بدلنی پڑے تو بے چین رہتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ بدل گیا ہو۔ اگر مہمان اس جگہ پر قبضہ کرلیں تو میں بے تکلف ان سے سیٹ بدلنے کی درخواست کرتا ہوں۔ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر ہی مجھے سکون ملتا ہے۔

فارغ وقت میں میرے تین ہی مشغلے ہوتے ہیں' ٹی وی دیکھنا' مطالعہ کرنا یا پھر اس تصویر کو مسلسل دیکھتے رہنا۔ میرے نزدیک اس کمرے کی سب سے نمایاں چیز یہ تصویر ہے جسے دیکھتے کبھی میرا جی نہیں بھرتا۔ ایک دوست نے ..... تحفتہً دی تھی ۔ قدردانی کے طور پر میں نے اسے ڈرائنگ روم میں سب سے نمایاں جگہ پر ٹانگ دیا۔

پہلی نظر میں مجھے تصویر نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے تصویر کی جزیات اور مرکزی خیال کو پسند کرنے لگا۔ یہ ایک گاؤں کا منظر تھا۔ مٹی سے بنے گھر کے سامنے ایک خاتون ہاتھوں میں اناج پھٹکنے کا سوپ لیے کھڑی ہے۔

ایک طرف بیل اور گائے بندھے ہیں ۔ اس کے ساتھ چارہ کاٹنے کی مشین نصب ہے۔ سامنے کھلے حصے میں دو بچے بھی دیکھے جاسکتے۔ ایک سایہ دار درخت نے صحن کے ایک حصے کو گھیر رکھا ہے ۔ دور لہلہاتے کھیتوں کا منظر ہے جس کے سامنے ایک کڑیل جوان کاندھے پر گنے کا گٹھر اٹھائے گھر والوں کی سمت چلا آرہا ہے۔

ان تمام جزیات کو میں نے ہزاروں مرتبہ

غور سے دیکھا ہے۔ آئل پینٹ سے بنی یہ تصویر خوبصورت فطری رنگوں کا امتزاج لیے ہوئے ہے۔ برش کا ایک اسٹروک بھی اضافی نہیں لگتا۔ جیسے کسی بڑے فنکار نے اسے تخلیق کیا ہو۔ اس قسم کی تصویر شہر میں بہت پسند کی جاتی ہے چونکہ گاؤں کے مناظر سے عموماً شہر کے لوگ دور ہو چکے ہیں۔ جو چیز کمیاب ہو اُس کی قدر تو لازماً ہوتی ہے۔

ایک بہت ہی فیشن ایبل ہوٹل کے ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں بیل گاڑی کا ایک پہیا دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

جب منیجر سے اس کے بابت دریافت کیا تو اس نے کہا ہم ماضی سے رشتے کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے تعجب سے کہا یہ آپ کے لیے ماضی ہوسکتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں آج بھی اس پہیے کی گاڑی مال برداری اور سواری کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ نہ جانے میری بات اس کی سمجھ میں آئی یا نہیں البتہ وہ مسکرا کر چل دیا۔

اب تصویر سے متعلق میری کیفیت میں کچھ تبدیلی آ رہی ہے۔ میں جب کمرے میں تنہا ہوتا ہوں تو تصویر میں موجود مٹیار' مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے' میں اس انوکھی سوچ کے فسوں میں ایسا گرفتار ہوں کہ میری خواہش ہوتی ہے کہ جب میں تصویر کی جانب مبذول ہو جاؤں تو کمرے میں کوئی اور نہ ہو' اس دوران میں تنہائی مجھے ایک نئے جذبے سے سرشار کرتی ہے۔

تصویر کی جانب میری غیر معمولی توجہ کو بیگم نے محسوس کیا اور ایک روز برملا کہہ دیا کہ آپ اس تصویر کو اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں؟ آخر تصویر ہی تو ہے۔ ایک فنکار کا خیال جسے اس نے مرتسم کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ تو مجھے اس میں کچھ اور نظر نہیں آتا۔

مجھے یقین تھا کہ بیگم مجھ سے کبھی اتفاق نہیں کریں گی لہٰذا میں نے اپنے جذبات ان سے چھپا لیے اور اتنا کہنے پر اکتفا کیا' ایک اچھی تصویر ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ میں مختلف معاملات پر غور وفکر کر لیتا ہوں اور بس......

بیگم نے مجھے کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا'' یہ تصویر آپ کی زندگی میں کچھ زیادہ دخیل نہیں ہوگئی؟ آپ کی ساری توجہ اس تصویر پر رہتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ بچوں کو بھی وقت نہیں دیتے۔ اگر آپ کا یہی حال رہا تو میں یہ تصویر یہاں سے ہٹا دوں گی۔''

میں نے فوراً کہا'' بیگم یہ غضب نہ کرنا۔ یہ تصویر اب ہمارے ڈرائنگ روم کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔ اس کے بغیر کمرہ پھیکا پھیکا سا ہو جائے گا اور اس کی رونق جاتی رہے گی۔''

بیگم نے کہا یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ تصویر کے بجائے زندہ لوگوں میں جو اس گھر کا حصہ ہیں' دلچسپی لینا شروع کریں۔

میں بیگم کی تنبیہ سے لرز گیا اور اسے یقین دلاتا رہا کہ اب وہی کچھ ہوگا جیسا وہ چاہتی ہے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ تصویر ضائع نہ کر دے۔ اب میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ بیوی بچوں کے سامنے تصویر سے کنارہ کش ہو جاتا البتہ تنہائی میں اسی انہماک سے تصویر دیکھتا رہتا۔

ایک روز میں گھر میں تنہا تھا۔ بچے سب ماں کے ساتھ نانی کے گھر گئے ہوئے تھے اور مجھے رات کو انہیں جا کر واپس لانا تھا۔ اس طرح

سارے دن کی تنہائی میسر تھی۔ اب میرے اور تصویر کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر میں تصویر کی جانب متوجہ تھا کہ تصویر میں موجود خاتون جو ایک مٹیار لگتی تھی اسے حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو میں اسے اپنی نظروں کا دھوکا سمجھا۔ لیکن کافی دیر تک میں خاتون کو سوپ میں اناج پھٹکتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے میری جانب نگاہ اٹھائی' اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا'' دور دور سے دیکھتے رہتے ہو' کبھی ہماری دنیا میں بھی آؤ۔''

میں نے قدرے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا'' یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا لو یہ ہاتھ تھام لو۔ میں ایک معمول کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر تصویر میں داخل ہو گیا اور خود کو اس مٹیار کے آنگن میں کھڑا پایا۔ اس نے بان سے بنی کھاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بیٹھ جاؤ۔ خود گھر کے اندر چلی گئی' گلاس اور جگ کے ساتھ دوبارہ واپس آئی۔ گلاس میں لسی انڈیلتے ہوئے کہا'' تازہ لسی ہے پیو'' میں نے بڑی مشکل سے گلاس ختم کیا۔ '' لسی بہت عمدہ ہے'' میں نے کہا۔ اس نے گلاس دوبارہ بھر دیا ''اور نہیں پی سکتا'' میں نے عاجزی سے کہا'' اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا'' بس ایک گلاس' ہم تو جب تک دو تین گلاس نہ پئیں سیری نہیں ہوتی' لیکن خیر تمہاری مرضی۔''

وہ کافی جاذبِ نظر تھی۔ اس کی آواز میں ایک گونج تھی' جیسے کنویں سے آ رہی ہو۔ اس کی ہنسی میں جھرنوں کی قلقل تھی۔ معمولی اور سادہ کپڑوں کے باوجود اس میں ایک وقار تھا جو مقابل کو احترام پر مجبور کرتا۔ میک اپ کی آلائشوں سے پاک اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ نکلتا ہوا قد اس کی شخصیت کو کشش عطا کرتا تھا۔

میں نے اس کے رویے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی۔ جس سے مجھے قدرے حوصلہ ملا۔ میں نے صحن میں کھیلتے دو بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' تمہارے بچے بڑے پیارے ہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا'' یہ میرے شوہر کی پہلی بیوی کے بچے ہیں' اس کا طاعون میں انتقال ہو گیا تھا۔ میں تو اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کی منگ تھی۔ وہ بڑا سجیلا اور خوبرو جوان تھا۔ میں اس سے پیار کرتی تھی اور وہ بھی مجھے بے حد چاہتا تھا۔ میری ماں جانتی تھی۔ لہٰذا جب میری ساس نے رشتہ ڈالا تو میرے گھر والوں نے قبول کر لیا اور منگنی ہو گئی۔

مراد کو گھڑ سواری کا بڑا شوق تھا۔ اس نے ایک گھوڑی پال رکھی تھی۔ اکثر اس پر دور دور تک سیر کو نکل جاتا۔ وہ کئی مرتبہ مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتا۔ میں خوف کھاتی تو کہتا'' نیلم میرے ہوتے تمہیں ڈر کیسا؟''

لیکن ایک دن وہ گھوڑی سے گرا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی اور وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ میں بہت روئی۔ میرے دکھ کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ لوگ کہتے' منگنی تھی کوئی شادی تو نہیں ہوئی' کیوں روتی ہو۔ میں انہیں کیا بتاتی میری تو دنیا اجڑ گئی۔ کیا انسان کے اختیار میں ہے کہ دل کے سنجوگ کو بھول جائے۔

خاندان کے بڑوں نے فیصلہ دے دیا اور مجھے مراد کے بڑے بھائی سے بیاہ دیا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا جب مراد نہیں تو پھر کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ اب میں اس کے اور اس

کے بچوں کی خدمت کرتی رہتی ہوں' میرا کوئی بچہ نہیں میں اب بھی مراد کو اپنی یادوں میں زندہ رکھے ہوئے ہوں وہ میرے خیالوں سے نکلتا ہی نہیں۔

مراد کا بھائی بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں لیکن اسے کوئی پروا نہیں اس کا کام چل رہا ہے۔ اس کے بچے پل رہے ہیں۔ اس کا گھر بسا ہوا ہے۔ اسے کیا اگر میری دنیا اجڑ چکی ہے۔

میں نے پوچھا ''تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

اس نے بتایا۔ بس آتا ہی ہوگا...... یہ سامنے ہمارے کھیت ہیں۔ آج کل فصل تیاری پر ہے اس کی زیادہ دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔

کیوں؟ ایک اجنبی کو اپنے گھر دیکھ کر وہ یہ بھی نہیں جاننا چاہے گا کہ میں کون ہوں؟

میں جانتی تھی کہ تم ایسا ضرور سوچو گے لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ صرف ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ اور سن سکتے ہیں' تمہیں کوئی اور نہیں دیکھ سکتا۔

''ایسا کیوں؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں ایسا ہی ہے' اس نے شوخی سے کہا' اوپر والے کی مرضی' تم ایک اور حقیقت سے لاعلم ہو' تم میری مرضی کے بغیر یہاں سے جا نہیں سکتے۔ لیکن تم پریشان نہ ہو میں روکوں گی نہیں' میں جانتی ہوں تمہاری بیوی اور بچے ہیں' میں روز دیکھتی ہوں' تمہارے گھر پیار ومحبت ہے' یقین واعتبار ہے' تم ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے ہو' میں تمہاری خوشیاں تم سے چھیننا نہیں چاہتی۔''

دیکھو میں تمہاری شخصیت سے متاثر ہوں تم سے ہمدردی رکھتا ہوں میرے لیے باعث مسرت ہے اگر میں تمہارے کام آسکوں۔

''نہیں تم اتنے بہادر نہیں ہو' تم اپنی دنیا کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری دنیا میں نہیں آسکتے' یہ میں سمجھتی ہوں تمہاری مجبوری ہے۔''

اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا ''آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔'' اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ کچھ دیر قبل اس کے چہرے پر جو بشاشت آئی تھی وہ اب معدوم ہو رہی تھی۔

''میں یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ تمہاری جدائی مجھ پر بھی شاق گزرے گی۔''

''جدائی کیسی میں تمہارے گھر کی دیوار پر ہمہ وقت موجود رہتی ہوں تم مجھے ہر وقت دیکھ سکتے ہو۔''

لیکن ایک ضروری بات تو میں نے ابھی تک نہیں بتائی کہ تم میرے مراد کے ہم شکل ہو۔ ایسے ہم شکل کہ تمہیں دیکھ کر میں تصویر میں زندہ ہوگئی۔ محبت ایک عظیم جذبہ ہے۔ ہمیں اس کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ یہ قدم قدم پر معجزے برپا کر سکتی ہے۔ اس تصویر میں تمہارا آنا بھی ایک معجزہ ہی ہے' میری سچی محبت کا معجزہ...... خدا محبت ہے اور محبت خدا۔

جاؤ مراد جاؤ' تمہیں زندگی کی سچی خوشیاں نصیب ہوں میں تمہارے لیے دکھ کا کارن نہیں بن سکتی۔ اس ابھاگن کی دعا لیتے جاؤ۔

اور میں دوبارہ اپنے ڈرائنگ روم کے مخصوص صوفے پر بیٹھا اس تصویر کو دیکھے جا رہا ہوں۔ اب یہ تصویر میرے لیے جیتی جاگتی دنیا ہے۔ وہاں نیلم ہے میں جس کا مراد نہ بن سکا۔

☆☆......☆☆

''بابا ہر انسان زندگی میں کوئی نا کوئی غلطی کرتا ہے نا...... اور اگر اس وقت جس وقت اس نے وہ کام کیا ہو...... وہ قدم ٹھیک لگے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ قدم غلط تھا اور وہ اس کی زندگی کی بھول بن جائے تو کیا پھر بھی وہ انسان سزا کا حق دار ہوتا ہے۔'' وہ اُن کے سینے سے......

''سارے نکل گئے ہیں بہو؟'' بڑے بابا بھی تیار ہو کر باہر نکلے۔

''جی بابا سارے نکل گئے ہیں بس آپ ہیں اور حیان ہیں۔'' انہوں نے سائرہ کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں سے ابھی تک اروی برآمد نہیں ہوئی تھی۔

''ہوں چلو پھر میں تم لوگوں کے ساتھ نکلتا ہوں...... حیان آجائے گا خود ہی وہ کام سے گیا ہے...... کہہ رہا تھا بعد میں آؤں گا۔'' وہ کہہ کر نکل گئے۔

''چلیں بیگم......'' نذیر صاحب اندر سے آئے۔

''جی بالکل!'' وہ مسکرائیں اور ایک نظر پھر سامنے کمرے پر ڈالی اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ نکل گئیں۔

وہ کمرے سے نکلی تو چار سو خاموشی کا راج تھا۔

''سارے نکل گئے...... کیا؟'' وہ حیران تھی کہ کسی نے اسے پوچھا بھی نہیں کیا وہ اتنی غیر اہم تھی۔ اس کی آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔

وہ نیچے آئی اور صوفے پر ڈھے گئی۔

''بی بی جی آپ گئیں نہیں کیا؟ باقی سب تو چلے گئے ہیں اور باہر تو کوئی گاڑی بھی نہیں ہے......'' ایک نوکرانی نے آ کر کہا۔

''ہں......'' وہ چونکی...... اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہے۔ وہ ہونقوں کی طرح اس ملازمہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''تم گئی نہیں؟'' حیان تیزی سے اندر داخل ہوا تو اسے وہاں دیکھ کر حیرانی سے بولا۔ اس کے مطابق اس کے علاوہ اور کسی فرد کو گھر میں ہونا نہیں چاہیے تھا۔

''جی...... میں یہاں۔'' وہ بولی اور آنکھیں صاف کیں۔

''تم پانی کا گلاس لاؤ......'' اس نے ملازمہ سے کہا جو بڑے تجسس سے اروی کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے چھوڑ گئے ہیں بہت غیر اہم ہستی ہوں

شاید۔'' وہ دکھی لگ رہی تھی۔
حیان نے افسوس سے دیکھا۔
''کوئی نہیں میں نے بھی جانا ہے آخر کو دنیا داری بھی تو نبھانی ہے۔'' وہ مسکرایا۔
اروی کو اس کی مسکراہٹ تلخ لگی۔ اس نے حیان کا چہرہ جانچا......
وہاں ہمیشہ کی طرح سپاٹ سے تاثرات تھے جس سے اندازہ لگانا بہت مشکل کام تھا کہ آخری الفاظ تلخ تھے یا نہیں......
''تم رُکو میں بس آیا......'' وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا...... اس نے صرف کوٹ کا اضافہ کیا تھا اپنے ملبوسات میں۔
''چلیں......'' وہ گھڑی باندھتے ہوئے بولا۔
''ہوں......'' وہ اٹھی۔
''آپ کی تیاری مکمل ہے؟'' اس نے اس کے پھیکے سے سراپے پر نظر ڈالی۔
''جی بالکل مکمل ہے......'' وہ بجھے دل کے ساتھ بولی۔
''ہوں...... چلیں پھر......'' وہ آگے بڑھ گیا۔
''سامنے والا ہال ہے آپ چلیں میں پارک کر کے آیا۔'' وہ اُسے اتارتے ہوئے بولا۔
''جی......'' وہ اتر کر بڑھنے لگی۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں تھی کہ کسی سے ٹکرا گئی۔
''سوری مس......'' وہ لڑکا بھی شاید کہیں گم تھا۔
''اٹس او کے......'' اروی نے سر اُٹھا کر کہا تو پتھر کی بن گئی۔
''لڑکے کے ہاتھ میں شاید کولڈ ڈرنک تھا جو اس کے کپڑوں پر گر گیا تھا وہ وہی صاف کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس نے اروی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔
''یہ یہاں؟'' اُسے لگا شاید وہ گر ہی نہ پڑے اس نے ارد گرد کوئی سہارا ٹٹولا تو کسی گاڑی کی پشت پر اس کا ہاتھ ٹک گیا وہ اس کا سہارا لے کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔
''یا خدا یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟''
''یہ میرے ماضی کا سب سے ڈراؤنا باب ہے۔ جس کو میں بھول کر بھی یاد نہیں کرنا چاہتی۔''
ایک اُسے دیکھ کر اُس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔
''ارویشہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' حیان نے اُسے یوں دیکھا تو بول پڑا۔
''تم ٹھیک تو ہو نا؟'' اُس کا رنگ سفید پڑتا دیکھ کر وہ تشویش سے بولا۔
''ہاں...... ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ فوراً سنبھلی کہ کہیں مسٹر فاروقی کو شک نہ گزر جائے۔
''چلیں پلیز......'' وہ آگے بڑھی تو حیان بھی چل پڑا۔
پورے فنکشن میں وہ بہت ڈری ڈری رہی۔
چونکہ اس ہال میں صرف ایک ہی فنکشن تھا۔ اور آس پاس بھی کوئی شادی نہیں تھی لہٰذا وہ اسی فنکشن میں ہوگا...... اروی کو پورا یقین تھا...... وہ بھول کر بھی اس کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی۔
''باجی تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم اُس کو گھر چھوڑ کر آئی ہو۔'' فائزہ نے اروی کو دیکھا تو شہلا سے آ کر کہا۔
''ارویشہ کو؟'' وہ بھی حیران تھیں۔
''ہوں...... مگر وہ تو ہے یہاں......''
''آ گئی ہوگی حیان کے ساتھ بس وہ ہی بعد میں آیا ہے۔'' شہلا مصروف سے انداز میں بولی

اور آگے بڑھ گئی۔

''اللہ اروی! تم کہاں رہ گئی تھیں۔'' عیشاء نے اسے اکیلے کھڑے دیکھا تو چلی آئی۔

''ارے تم تیار نہیں ہوئیں ٹھیک سے۔'' وہ اسے سادہ سی دیکھ کر بولی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری رنگ بھی ایک دم پھیکا پڑ رہا ہے۔'' وہ پریشان ہوئی۔

''ہاں یار...... ٹھیک ہوں...... بس ذرا تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی ناں تو بس دل نہیں کیا سجنے کا، اسی لیے جوڑا پہن لیا صرف اور آ گئی۔'' وہ مسکرائی۔

''ہوں...... چلو آؤ اسٹیج پر چلتے ہیں سارے وہیں ہیں۔'' وہ اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی۔

حیان کو ان سب فنکشنز پر عجیب بے چینی ہونے لگتی تھی اسی لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ ایسے فنکشنز اور گیدرنگ میں کم سے کم آئے۔

''ہم بہت زبردست لگ رہے ہیں حیان دیکھو ہر ایک کی آنکھ میں ستائش ہے۔'' وہ اس کے کان کے قریب آ کر ہلکے سے بولی۔

''ایک پرفیکٹ کپل ہیں ہم......'' اس کے لہجے میں غرور تھا۔ حیان نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ دلہن کے سراپے میں وہ اور بھی دلکش لگ رہی تھی۔

ان کی شادی یادگار شادی تھی۔ جس کا ایک ایک پل دونوں نے بہت انجوائے کیا تھا۔ ویسے پر بھی وہ دونوں بہت خوبصورت لگ رہے تھے...... اور ایک دوسرے کے حسن کو وہ دونوں مکمل کر رہے تھے۔

''شزا......'' اس کے اندر کوئی گرجا...... تو وہ ایک دم اٹھا اور وہاں سے نکل گیا۔

بڑے بابا نے اُسے جاتے دیکھا اس کے چہرے سے واضح تھا کہ وہ کتنی برداشت سے کام لے رہا ہے...... اس لڑکی نے میرے بچے کو بالکل ختم کر دیا ہے...... زیر لب بڑے بابا نے کہا اور افسوس سے سر ہلا دیا۔

ہال سے نکل کر اس نے باہر آ کر گہرا سانس لیا۔ ٹھنڈک کا احساس اس کے اندر سرایت کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں جس میں کچھ نمکین سا پانی ہچکولے لے رہا تھا۔

وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

☆......☆......☆

ایک بار پھر وہ اسے نظر آیا جس سے اس کا شک یقین میں بدل گیا کہ وہ یہیں ہے۔ اروی کے ہاتھ پر پسینہ آ گیا۔

''یا خدا کیا کروں؟'' وہ جلدی سے اسٹیج سے اتر گئی اور نسبتاً اکیلے گوشے میں آ گئی۔

ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی دھن میں تھے ایک تنہا تھی تو وہ اروشہ فاروقی کی ذات تھی۔

☆......☆......☆

وہ گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اسے وہ اشعار شدت سے یاد آنے لگے جو اس نے کبھی پڑھے تھے۔

مجبور تھے حالات سے اپنے
محبت ہم جتا نہ سکے
دل ہی دل میں زخم کھاتے رہے
کسی کو ہم بتا نہ سکے
چاہتوں کی حدود سے بھی بڑھ کر کیا تھا پیار تجھے
بد قسمتی تھی دو گیت پیار کے ہم سنا نہ سکے
تیرے عشق کی تپش نے جلا ڈالا دل میرا
آگ بھی ایسی تھی جسے ہم بھلا نہ سکے

☆......☆......☆

کتنی ہی دیر تک وہ سڑکوں پر پھرتا رہا بے مقصد..... اندر کی گھٹن تھی کہ کم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے محبت میں ٹھوکر کھائی تھی۔ جس سے وہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اسے اپنی ذات ریزہ ریزہ محسوس ہوتی تھی۔ جسے وہ چاہ کر بھی سنبھل نہیں پا رہا تھا۔ ہاتھ میں سگریٹ دبائے وہ بے مقصد چلا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

سوچ سوچ کر ہی اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

''اللہ یہ کہاں سے آ گیا پاکستان اور وہ وہاں پر کیا کر رہا تھا۔'' اروی کے دماغ نے کام کرنا جیسے بند کر دیا تھا۔

''کیا وہ پھوپو کی فیملی سے تعلق رکھتا ہے یا پھر مائرہ باجی کے سسرال سے.....'' کیونکہ وہاں پر دونوں ہی خاندان جمع تھے۔

''اروی یار یہاں کیا کر رہی ہو وہ بھی رات کے دو بجے؟'' فائقہ نے آ کر کہا۔

''ہاں یار بس ویسے ہی دل گھبرا رہا تھا۔'' وہ مسکرائی۔

''او کے زیادہ طبیعت خراب تو نہیں؟'' وہ فکر مندی سے بولی۔

''نہیں یار بس ویسے ہی.....'' وہ اس کا ہاتھ پیار سے تھام کر بولی۔

جیسے ہی اروی نے فائقہ کا ہاتھ تھاما تو اسے احساس ہوا کہ اروی کو تو بخار ہے۔

''یار تمہیں بخار ہے؟'' وہ اس کا ماتھا دیکھ کر بولی۔

''اچھا.....'' اروی بے دلی سے بولی۔

''لڑکی اپنا خیال رکھا کرو۔'' وہ اسے اندر زبردستی لے جاتے ہوئے بولی۔

اس نے اسے زبردستی دودھ پلایا اور پھر دوائی دی۔

''یار تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' وہ چشمہ درست کر کے بولی۔

اروی کو اس پر بہت پیار آیا جسے اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔

''ارے تم دونوں ابھی تک یہی ہو..... کیا ہوا فائقہ سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا۔ رات کے تین بجنے کو آئے ہیں۔'' عالیہ جو لائٹس آف کرنے آئیں تھیں انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

''ارے ماما اروی کو بخار ہے بس اسی لیے اسے دوا دے رہی تھی۔'' وہ بولی۔

''بیٹا زیادہ تو طبیعت خراب نہیں ہے ناں۔'' وہ بھی فکر مندی سے بڑھیں انہوں نے اسے جانچا۔

''بیٹا اپنا دھیان رکھا کرو نا..... تم بھی ناں اپنا بالکل خیال نہیں رکھتی۔'' وہ پیار سے بولیں۔

''اور بیٹا بھابی کا برا نہ مانا کرو..... درگزر سے کام لیا کرو۔'' وہ ایک مشفق سی خاتون تھیں اسی لیے وہ اروی کو سمجھا رہی تھیں۔ انہیں اس سے ہمدردی تھی آخر بن ماں باپ کی بچی یوں دربدر ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں پر سب اس کے اپنے تھے مگر اپنوں کی اپنائیت ناپید تھی۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں ماما میں نے اسے بس چٹکیوں میں ٹھیک کر دینا ہے۔ آخر کو آدھی ڈاکٹر تو میں ہوں ہی۔'' وہ فرضی کالر جھاڑ کر بولی۔

''اچھا جی.....'' وہ مسکرائی۔

''بیٹا تم آرام کرو.....'' وہ اٹھیں، اور اُسے پیار کیا۔

''جی.....!'' وہ مسکرائی۔

''لیکن ماما یہ سوئے گی کہاں؟ کیونکہ آج تو

سائرہ باجی ہیں اپنے کمرے میں اور شانزے وغیرہ کے کمرے بھی بھرے ہوئے ہیں مہمانوں سے۔'' فائقہ کو یاد آیا تو بولی۔

''ہوں...... بیٹا جو بھی کمرہ خالی ہے وہاں اسے سلا دو۔''

''اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' وہ جاتے جاتے بولیں۔

''ہوں...... اروی میرا خیال ہے حیان بھائی تو چلے گئے ہیں۔ تم اُن کا کمرہ استعمال کرسکتی ہو۔''

''اچھا وہ چلے گئے۔'' وہ حیران ہوئی۔

''سارے یہ ہی کہہ رہے تھے کہ انگری مین چلا گیا ہے۔ اُن کا پتہ ہی نہیں چلتا کب آئے اور کب گئے...... آخر کو وہ حیان فاروقی جو ہیں۔'' وہ مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔

''ہوں میں واقعی آرام کرنا چاہ رہی ہوں سر میں بہت درد ہے میرے۔'' وہ اور کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اٹھ گئی۔

فائقہ اسے حیان کے کمرے کے باہر چھوڑ کر چلی گئی۔

''تھینکس......'' اروی پیچھے سے بولی۔

''کوئی بات نہیں جانی۔'' وہ مسکرائی اور تیزی سے بڑھ گئی۔ وہ اندر آئی...... اسے بہت کمزوری ہو رہی تھی اوپر سے سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ سیدھی بیڈ پر آئی اور ڈھے گئی۔ چند ثانیے بعد وہ گہری نیند میں تھی۔

صبح فجر کی اذانوں کے ساتھ وہ واپس آیا...... گھر میں مکمل سکوت تھا...... وہ سیدھا کمرے میں آیا...... لائٹ جلائی تو احساس ہوا کہ کمرے میں وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ کوئی اور بھی ذی نفس موجود ہے...... اسے سخت کوفت ہوئی......

کون ہے جو میرے کمرے میں آنے کی ہمت کر بیٹھا ہے۔

اسے سخت غصہ آیا وہ چلتا ہوا بیڈ کے قریب آیا تو سامنے بے خبر اروی کو سوتے پایا۔

''یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟'' غصے اور کوفت کے مارے اس کا حال برا تھا۔ اوپر سے تھکن الگ تھی۔

وہ پاؤں پٹختا ہوا واپس مڑا...... اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس نے ٹائم دیکھا تو 5 بج رہے تھے۔ وہ صوفے کی پشت پر سر رکھ کر خود ریلیکس کرنے لگا۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو صوفے پر پایا۔

''اوہ...... میں تو سو گیا تھا۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے بولا۔ گھڑی پر نظر گئی تو 7 بج رہے تھے۔ اوہ دو گھنٹے ہو گئے۔ وہ اٹھا فریش ہوا اور الماری سے کچھ ٹٹولنے لگا۔

اس کے بعد اس نے چند جوڑے اور کچھ فائلز بیگ میں رکھیں...... اور جاتے جاتے پھر سے ایک نظر بے سدھ پڑی اروی پر ڈالی اور نکل گیا۔

''رمضو بابا ایک کپ کافی اور کچھ کھانے کو دے دیں۔'' وہ ڈائننگ ٹیبل پر آیا۔

''ارے بیٹا تم اتنی صبح......'' عالیہ بھی ڈائننگ ٹیبل پر آ گئیں۔

''جی......'' وہ اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔

''رمضو بابا میرے لیے پانی لا دیں۔'' وہ بولیں۔

''تم جانے کا ارادہ رکھتے ہو کیا؟'' انہوں نے پاس پڑے بیگ کو دیکھا تو بولیں۔

''جی......'' جواب مختصر تھا۔

''ہوں خیر سے جاؤ۔'' وہ مسکرائیں۔

اس نے جلدی سے کافی ختم کی اور اٹھ گیا۔
''اللہ حافظ۔'' وہ بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔
''جاؤ بیٹا...... اللہ حافظ۔'' وہ مسکرائیں۔ اور بڑھ کر سر پر ہاتھ پھیرا۔
وہ پلٹ گیا۔
ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ بڑے بابا آ گئے۔
''السلام علیکم بابا جان......'' وہ باادب تھیں۔
''وعلیکم السلام...... بیٹا جیتی رہو۔'' وہ پیار دیتے ہوئے بولے۔
''کون صبح صبح ناشتہ کر کے گیا ہے۔'' وہ سامنے پڑے توس اور کپ کو دیکھ کر بولے۔
''حیان بابا جان...... وہ چلا گیا ہے۔'' وہ چائے کا کپ انہیں تھما کر بولیں۔
''کیا وہ چلا بھی گیا؟'' وہ افسوس سے بولے۔
''جی......'' وہ چائے کا سپ لے کر بولیں۔
''ہوں......''
''باقی سب تو سو رہے ہوں گے......''
''جی بابا...... شادی کی تھکن ہے ناں ابھی۔'' وہ مسکرائیں۔
''اچھا اروی کہاں ہے مجھے تو وہ نظر ہی نہیں آئی تھی کل؟'' وہ فکرمندی سے بولے۔
''وہ ولیمے میں تو موجود تھی ناں؟''
''وہ بابا اسے بخار تھا ناں تو رات ہی دوا دی تھی اسے وہ بھی آرام کر رہی ہوگی۔''
''جی بابا تھی وہ وہاں پر۔''
''اوہ اچھا اچھا...... بیٹا تم ذرا اس کا خیال رکھا کرو...... وہ امانت ہے میرے پرویز کی...... شہلا ذرا گرم مزاج کی ہے...... اوپر سے اس کی بہن بھی آج کل یہیں ہے۔''

بڑے بابا سمجھ دار انسان تھے حالات کی نزاکت کا انہیں اچھے سے احساس تھا۔ یقیناً وہ پرویز کی غلطی کو بھلا نہیں پائی ہوں گی۔
''جی بابا میں سمجھتی ہوں مجھے خود بھی اس کا بہت خیال رہتا ہے۔''
''جیتی رہو بیٹا...... جیتی رہو۔'' وہ دعا دیتے ہوئے اٹھ گئے۔

☆......☆......☆

شادی کے ہنگامے سرد پڑنے لگے تو زندگی دوبارہ معمول پر آنے لگی۔ وہ بھی تھوڑی سنبھل گئی تھی۔ اس نے اپنے ماضی کے بارے میں فکرمند ہونا چھوڑ دیا تھا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا کیا پتہ عمر بھر کسی کو خبر ہی نہ ہو۔ وہ خود ہی سوچتی اور خود ہی اپنے آپ کو تسلی دے لیتی کہ سب ٹھیک ہوگا۔
سائرہ باجی کے بعد فائقہ بھی واپس ہاسٹل چلی گئی تھی۔ اس لیے وہ تھوڑی تنہا ہوگئی تھی۔ شانزے من موجی تھی۔ دل کرتا تو ڈھیروں باتیں کر ڈالتی اگر موڈ نہ ہوتا تو کئی کئی دن تک بات نہ کرتی۔ اروی خود کو حد درجہ مصروف رکھنا چاہتی تھی تاکہ غلط قسم کی سوچیں اس کے دل میں نہ آئیں۔
''ارے بھابی آیئے نا بیٹھیے۔'' اروی نے سحرش کو دیکھا تو اخلاقاً بولی۔
''ہوں، بھئی میں تو بور ہوگئی تھی اندر سوچا باہر ہی آ جاؤں۔'' وہ کرسی پر براجمان ہوئی۔
اروی مسکرا دی۔
''چائے لیں گی بھابی......'' وہ بولی۔
''ہاں بھئی کیوں نہیں لیں گے بلکہ ساتھ میں کچھ چٹ پٹا بھی ہونا بنتا ہے موسم بہت مزے کا ہو رہا ہے نا۔'' وہ آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ جہاں شام کی سرخی گہری ہو رہی تھی۔ مشرق سے چلنے والی تیز ہوائیں پتوں کو جھومنے پر مجبور کر رہی

تھیں۔ پتوں کی سنسناہٹ عجیب سر بکھیر رہی تھیں۔ پرندوں کی آوازوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کر دیا تھا۔

''لے لیں بھابی آپ بھی چائے کہاں گم ہیں؟'' اروی نے سحرش کو کھوئے ہوئے دیکھا تو بولی۔

''آ...... ہاں...... لاؤ بھئی......'' وہ چونکی اور ہاتھ بڑھا کر کپ تھام لیا۔

وہ اروی کو غور سے دیکھنے لگی۔ سنہری مائل گھنگھریالے بال' شفاف رنگ' گھنی پلکیں' خوبصورت آنکھیں اور مترنم ہونٹ...... وہ کتنی پیاری اور معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں بھابی؟'' وہ اسے یوں گھورتا پا کر تھوڑی کنفیوژ ہوئی۔

''کچھ نہیں میں ذرا تمہیں پہلی بار Dctail میں دیکھ رہی ہوں جناب۔'' وہ چائے کی چسکی لے کر بولی۔

''اچھا......'' وہ حیرانی سے بولی۔

''تم بہت پیاری ہو اروی۔'' وہ اس کی کھلے دل سے تعریف کر کے بولی۔

''تھینکس......'' وہ تھوڑا شرما گئی۔

''تم آئی نہیں نا کبھی ہماری طرف جب سے پاکستان آئی ہو؟''

''جی بھابی ابھی آئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے ہیں۔''

''بس کہیں آنا جانا ہی نہیں ہوا ہے...... میں تو آپ کی فیملی مطلب پھوپو والی ان سب سے بھی ٹھیک سے متعارف نہیں ہوئی ہوں۔'' وہ تفصیلی جواب دے کر چائے پینے لگی۔

''لو اس میں کیا ہے...... ابھی کیے دیتے ہیں تمہیں متعارف۔'' وہ چٹکی بجا کر بولی۔

''ہم چار بہن بھائی ہیں۔'' وہ ہاتھ کے اشارے سے بولی۔

اروی مزے سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''عامر بھائی پھر میں پھر فیضان اور پھر مہوش......''

''عامر بھائی کی شادی ہوئی ہے اُن کی بیگم کا نام صنم ہے اور اُن کی ایک بہت پیاری بیٹی ہے غانیہ......''

''پھر میں ہوں مجھے تو جانتی ہو ناں؟'' وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔

''جی جی بالکل......'' وہ فوراً سر کو زور زور سے ہلا کر بولی۔

''گڈ۔'' وہ ہنسی...... تو اروی کو بھی اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''پھر فیضی ہے میرا بھائی...... اس نے اپنی مکینیکل انجینئرنگ ختم کی ہے اسی سال اب اس کا آگے پتہ نہیں کیا کرنے کا ارادہ ہے...... اسے تم چھوڑو۔'' وہ ہاتھ کو جھاڑ کر بولی۔

''اور پھر مہوش ہے...... وہ اکنامکس میں اونرز کر رہی ہے...... لاسٹ ایئر ہے اس کا...... وہ ذرا کم ہی گھلتی ملتی ہے سب سے اسی لیے تم نے نوٹ کیا ہو گا کہ شادی میں بھی ذرا الگ تھلگ تھی وہ...... اسے شور ہنگاموں سے بالکل بھی شغل نہیں ہے۔ میں تو اسے آدم بیزار کہتی ہوں...... جب دیکھو تب کتابوں میں سر دیے رہتی ہے...... اور چھٹیوں میں یہ موٹے موٹے ناولز اور فلاسفی...... اور نجانے کیا کیا پڑھتی رہتی ہے۔'' ہاں تو یہ ہے ہماری چھوٹی سی فیملی وہ چھوٹی کو کھینچ کر ادا کر کے بولی۔

''اب ہو گئی ناں متعارف۔'' وہ مسکرائی۔

''جی بھابی ہو گئی ہوں۔'' وہ مسکرانے لگی۔

"تھینک یو سوچ بھائی آپ نے میرا موڈ بہت فریش کردیا ہے۔" وہ مشکور تھی۔

"ارے ہمارے ساتھ رہو گی تو خوش خوش رہو گی۔" وہ فرضی کالر جھاڑ کر بولی۔ تو دونوں ہنس دیں۔

☆......☆......☆

شانزے اور اروی کے ایگزامز ہو رہے تھے۔ اسی لیے دونوں دیر رات تک پڑھتی تھیں۔

"یار حد ہوگئی ہے کب سے یہ نوٹس پکڑے بیٹھی ہوں کہ کچھ تو پلے پڑے مگر حد ہے جو کچھ بھی سمجھ آیا ہو۔" وہ نوٹس بیڈ پر پٹخ کر بولی۔

اروی کو ہنسی آ گئی۔

"تم کیوں دانت نکوس رہی ہو لڑکی؟" اسے یوں ہنستا دیکھ کر اس کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔

"میں کب ہنس رہی ہوں بھئی؟" وہ یکدم سنجیدہ ہوئی۔ مگر لبوں پر اب بھی دبی دبی ہنسی موجود تھی۔

"یار مجھے نہیں یاد ہو رہا ہے......" وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر رنجیدہ ہوگئی۔

"ارے تمہیں اس لیے یاد نہیں ہو رہا ہے کیونکہ تمہیں تھوڑا فریش ہونے کی ضرورت ہے۔" اروی نے نوٹس سائیڈ پر کیے اور بیڈ پر ٹانگیں پھیلا لیں۔

"ایک کام کرو...... باہر جاؤ ایک چکر لگا کر آؤ اور ہو سکے تو چائے بنا کر لاؤ خود بھی پیو اور مجھے بھی پلاؤ پھر دیکھنا یوں چٹکیوں میں یاد ہو جانا ہے تمہیں۔" وہ چٹکیاں بجاتے ہوئے بولی۔

شانزے منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا بھی تو صبح پیپر ہے نا تم پھر بھی اتنی ریلیکس ہو یار اروی۔"

وہ اسے اتنا فری اور ریلیکس دیکھ کر متاثر لگ رہی تھی اور خود اس کا ٹینشن کے مارے برا حال تھا۔

"ہوں اس کا ایک آسان نسخہ ہے۔" اسے شرارت سوجھی۔

"کیا؟" وہ ایک دم اچھل کر قریب ہوئی۔

"تم سارا ٹائم برباد نہ کیا کرو...... موویز میں، گیمز میں شاپنگ میں اور ساتھ ساتھ پڑھ لیا کرو تو تم بھی لاسٹ موومنٹ پر میری طرح فری رہو گی۔" وہ مسکرا کر بولی جبکہ آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"کیا......؟ تم چپ کرو۔" وہ کشن اس کو مار کر پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

پیچھے اروی ہنستی رہی۔

☆......☆......☆

"عالیہ تمہیں پتہ ہے وہ جو سائرہ کی پھوپی ساس ہے نا وہ آنا چاہ رہی ہیں ہمارے ہاں۔" شہلا جو ابھی فون سن کر کمرے سے نکلیں تھیں بہت پُرجوش لگ رہی تھیں۔

"اچھا کیوں بھابی؟" وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔

"ارے کوئی کیوں جوان بچیوں کے گھروں میں آتا ہے؟"

وہ الٹا ان سے سوال کر کے بولیں۔

"اچھا تو یہ بات ہے...... اچھی بات ہے بھابی یہ تو بچیاں جتنی جلد اپنے گھروں کی ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"پتہ ہے وہ شادی میں بھی شانزے کی بہت تعریف کر رہی تھیں...... مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھیں کہ کہیں میں نے اس کی بات تو پکی نہیں کی کہیں۔" وہ بہت خوش لگ رہی تھیں۔

"ہوں......" وہ مسکرا دیں۔

''تم بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے..... فائقہ کا......دونوں تقریباً ہم عمر ہی تو ہیں؟''

''بھابی ابھی تو وہ اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی کررہی ہے...... میرا ابھی تو اس کے لیے کوئی ارادہ نہیں ہے البتہ میں عثمان کے لیے سنجیدہ ہوں.....سوچ رہی ہوں کہ اس کے ابو سے بات کروکہ اب اس کی شادی کردینی چاہیے۔''

''ہوں صحیح کہہ رہی ہوتم.....تم بھی اب اپنی بھولے ہی آؤ۔'' وہ اپنے تئیں مفید مشورے سے نوازرہی تھیں۔

''کوئی لڑکی ہے نظر میں؟'' وہ متجسس ہوئیں۔

''لڑکیاں تو بہت ہیں بھابی بس پہلے عثمان کی مرضی معلوم کرلو۔'' وہ ٹال گئیں۔

''آپ بتائیں شہزاد کا کیا سوچا ہے آپ نے؟'' وہ بات کارخ پلٹ گئیں۔

''بھئی سوچنا کیا ہے اپنی فائزہ کی ہی بیٹی لاؤں گی۔''

''اچھا.....'' عالیہ حیرانی سے بولیں۔

''کبھی ذکر نہیں کیا آپ نے؟''

''بھئی اس میں ذکر کی کیا بات ہے' میرے میکے میں سوائے میری بہن کے ہے ہی کون؟'' وہ افسردہ ہوگئی۔

''جیسے آپ کی مرضی بھابی۔'' وہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

''ہونہہ.....جیسے آپ کی مرضی بھابی۔'' وہ منہ بگاڑ کر بولی۔

''تو اسے کیا لگا کہ اس کی بیٹی اٹھا لاؤں گی اپنے شہزاد کے لیے میں تو اپنی بھانجی ہی لاؤں گی۔'' وہ زیرلب بڑبڑائیں۔

☆......☆......☆

رات میں وہ ناصر فاروقی سے بولیں۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اب عثمان کی بھی شادی کردی جائے کیا خیال ہے آپ کا اس بارے میں۔''

وہ بیڈ کے ایک کونے میں ٹک گئیں۔

''ہوں......ٹھیک بات ہے بیگم۔'' وہ ان سے متفق دکھائی پڑتے تھے۔

''تو پھر لڑکی بھی دیکھ لی ہے کیا؟'' وہ مسکرائے۔

''بھئی لڑکیاں تو بہت ہیں..... سنبل' ثمرین کی بیٹیاں ہیں پھر بھائی کی بھی بیٹیاں ہیں اور پھر......اروی۔'' اروی کا نام انہوں نے آہستگی سے لیا۔

''اس کے نام پر آواز کیوں مدھم ہوگی بیگم آپ کی۔'' انہوں نے فوراً پکڑلیا۔

''بچی تو دیکھی بھالی ہے وہ بس ذرا اس کا ماضی مشکوک ہے۔'' وہ سنجیدہ تھیں۔

''اور ایسی لڑکی کا انتخاب......''

''ہاں یہ بھی ہے ویسے۔'' وہ بھی بولے۔

''یہ تو وہ جانتی ہے یا خدا ہی جانتا ہے کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔''

''خیر آپ نے شانزے کا تو کہیں ذکر ہی نہیں کیا۔'' وہ شرارتاً بولے۔

''رہنے دیں آپ اسے......شاید بھابی کے مزاج سے آپ واقف نہیں...... ہے ناں؟'' وہ طنزاً بولیں۔

''اور بیٹی ماں کا پرتو ہوتی ہے جناب...... شانزے میں واضح بھابی کی جھلک ہے...... ہاں اگر بات سائرہ کی ہوتی تو میں ضرور لچک پیدا کرتی......مگر اب تو خیر سے وہ اپنے گھر بار والی ہوگئی ہے۔''

وہ لیٹے ہوئے بولیں۔

تو ناصر صاحب مسکراتے ہوئے دوبارہ کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔

☆......☆......☆

آج کتنے دنوں بعد سب اکٹھے ہوئے تھے۔ آج سائرہ باجی بھی آئیں ہوئی تھیں۔ اسی لیے گھر میں خوب رونق تھی۔ سارے سٹنگ روم میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔

''بھئی کافی دن ہوگئے ہیں کہیں آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔'' شانزے نے کہا۔

''کیا خیال ہے آپ سب کا؟'' وہ سب کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہوں اچھی بات ہے آپ سارے بچے ہو آؤ کہیں پر۔'' نذیر صاحب نے کہا۔

''کیوں بھئی بڑے کیوں نہیں چلیں گے؟'' شہریار نے کہا۔

''بھئی اب ہمارے گھومنے پھرنے کے دن تو ہیں نہیں تم جاؤ عیش کرو...... ہم نے اپنے وقتوں میں خوب عیش کی تھی۔''

ناصر صاحب اپنی جوانی یاد کرکے بولے اور مسکرادیے۔

''لو یہ کیا بات ہوئی بھئی سب چلتے ہیں۔'' ریحان نے مداخلت کی۔

''یار وہ جو ڈیل تھی جس پر کل ہم بات کررہے تھے اس کا کیا بنا ہے۔''

نذیر صاحب کو کچھ یاد آیا تو وہ شہریار' عثمان اور شہزاد کی طرف متوجہ ہوئے۔

''لو جی...... ایک تو انہیں کام کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوجھتا۔'' شہلا فاروقی نے سر پکڑ لیا۔

جبکہ وہ سب اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

''بڑے بابا آپ بھی اپنی رائے دیں ناں۔'' عثمان نے انہیں بھی شامل کیا۔

''کیوں نہیں یار بالکل!'' وہ اٹھے۔

''تم لوگ آؤ ذرا باہر بیٹھے ہیں۔'' وہ اٹھے تو پیچھے ہی ناصر' نذیر' شہریار' شہزاد اور عثمان بھی چلے گئے۔

''لو ہوگئی پکنک......'' ریحان برا سا منہ بنا کر بولا۔

اس کے چہرے کے بگڑتے زاویوں پر شانزے اور اروی ہنسے بنا نہ رہ سکیں۔

''سائرہ ذرا تم آنا میرے ساتھ۔'' شہلا فاروقی سائرہ کو سب کے درمیان میں سے نکال کر لے گئیں جبکہ عالیہ سمجھ گئیں کہ کیا بات ہوگی۔

''میں بھی نماز پڑھنے جارہی ہوں بچوں اب تم خود ہی فیصلہ کرلو کہ کہاں جانا ہے کیونکہ باقی سب تو ہوگئے ہیں مصروف......'' وہ مسکرائیں۔

''ماما مذاق تو نہ اڑائیں ہمارا......'' ریحان چڑ گیا۔

''ایسا کرتے ہیں یار ہم چلتے ہیں کہیں۔'' شانزے نے کہا۔

''کہاں جانا ہے بھئی...... ہمیں بھی لیتے جاؤ۔'' فیضی اندر آیا۔

''ارے آؤ یار تم ہی آجاؤ باقی تو سب مصروف ہیں۔'' ریحان نے کہا تو وہ ہنستا ہوا آ گیا۔

''کیسی ہو باجی۔'' وہ سحرش کا ماتھا چوم کر بولا۔

''ٹھیک ہوں بھئی تم سناؤ۔'' وہ مسکرائی۔

وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ جبکہ ریحان' اروی اور شانزے نیچے فرش پر کشنز پر بیٹھے تھے۔

''آپ کیسی ہو اروی؟'' وہ خصوصاً اروی

سے مخاطب ہوا۔
''گڈ......'' وہ مسکرائی۔
''اوہ...... بھائی ہم بھی ہیں راہوں میں۔''
شانزے نے یاد دلایا۔
''پتہ ہے مجھے......موٹو......'' وہ منہ چڑا کر بولا۔
وہ پُرشوق نگاہوں سے اروی کو دیکھ کر بولا جس سے وہ تھوڑی Concious ہو رہی تھی۔
''خیریت ہے ناں...... یہ تمہارا پچھلے دس دنوں میں تیسرا چکر ہے۔'' سحرش اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔
''باجی اتنا تو تمہیں سمجھ جانا چاہیے تھا کہ میرا یہ تیسرا چکر کیوں ہے؟'' وہ اُلٹا اُسے دیکھ کر مسکرا اٹھا۔
''پہلے نانو کے گھر کوئی ایکٹویٹی نہیں تھی ناں اب زندہ سالم سامنے بیٹھی ہے۔'' وہ کھسیانہ ہو کر ہنس دیا۔ آواز اتنی ہی تھی کہ سحرش ہی سن سکے۔
''بھئی کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ بہن بھائیوں میں؟'' شانزے ان کو کھوجتی نظروں سے دیکھ کر بولی۔
''بھئی اپنی بہن کو مفید مشوروں سے نواز رہا تھا کہ شوہر پر کیسے دوڑیاں کس کر رکھنی ہیں۔'' وہ مسکرایا۔
''اوہ......یعنی الٹی پٹیاں وہ بھی میرے بھائی کے خلاف......''
''اچھا جی......'' وہ ہنسی۔
''جی بالکل اُلٹی پٹیاں وہ بھی آپ کے بھائی اور میرے بہنوئی کے خلاف۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں بولا۔
اور سب ہنس دیے۔

''ہم لوگ کہیں جا رہے تھے شاید؟'' اروی نے اصل موضوعِ گفتگو یاد دلایا۔
''ہاں بالکل......'' ریحان نے بھی ساتھ دیا۔
''ہاں تو سائرہ تم بتاؤ ناں پھر کیا کہا ہے تمہاری پھوپو ساس نے؟'' شہلا انہیں اپنے روم میں لے آئیں اور اپنے سامنے بٹھا کر بولی۔
''کس بارے میں امی۔'' وہ انجان تھی۔
''ارے تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے فون کیا تھا کہ وہ آنا چاہ رہی ہیں ہمارے گھر رشتے کے سلسلے میں۔'' وہ حیرت سے بولیں۔
''ہاں......انہوں نے نمبر مانگا تھا مگر کس لیے مانگا تھا پتہ نہیں مجھے......''
''اوہ......اچھا......''
''کب آیا تھا فون اُن کا؟''
''کچھ دنوں پہلے آیا تھا...... کہہ رہی تھیں کہ آئیں گی وہ کسی دن مجھے لگا شاید تم سے مشورہ کر کے ہی بات کر رہی ہوں۔''
''نہیں امی ایسا تو کچھ نہیں ہے......مجھ سے تو نہیں کہا کچھ بھی۔ چلیں جب آئیں گی تو دیکھا جائے گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔
''اچھا اگر بات ہو تو تمہاری تو بتانا۔'' وہ اُسے دیکھ کر بولیں۔
''جی امی بتا دوں گی......'' وہ کمرے سے نکل گئی۔
رات اُس کا رُکنے کا ارادہ تھا لہٰذا وہ اپنے کمرے میں ہی چلی آئی جہاں اروی پہلے ہی موجود تھی۔
''May I Come In'' وہ اندر جھانک کر بولی۔
''ارے باجی آئیں ناں آپ مجھے شرمندہ

کر رہی ہیں۔'' وہ خود دروازے تک اسے لینے کے لیے آئی۔

''بھئی اب ہم تو ہوگئے پرائے اب تو یہ اروشہ فاروقی کا کمرہ ہے بھئی۔'' وہ اس کے چہرے پر پیار کر کے بولی۔

''نہیں باجی پہلے بھی یہ کمرہ آپ سے منسوب تھا اب بھی یہ کمرہ آپ کا ہے اور ہمیشہ رہے گا...... مہمان تو میں ہوں یہاں۔'' وہ افسردہ سی ہوگئی۔

''نہیں بالکل نہیں اب یہ کمرہ میری پیاری اروی کا ہے..... اور یہاں کی ہر چیز بھی اُس کی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''تھینکس باجی..... آئیں ناں بیٹھیں باتیں کریں مجھ سے اتنے دن ہوگئے ہیں میری آپ سے بات ہی نہیں ہوئی ہے..... مجھے آپ سے ڈھیروں باتیں کرنی ہیں۔''

''اور مجھے بھی تم سے ڈھیروں باتیں کرنی ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی پھر دونوں مسکرادیں۔

☆......☆......☆

وہ کب سے اپنی فائلز میں سے کام کی فائل تلاش کر رہا تھا۔

''ارے کہاں گئی ہے۔''

آج چھٹی کا دن تھا تو وہ اپنی پرانی فائلز کو کھنگال رہا تھا۔

سبھی فائلز مل گئی تھیں مگر جس فائل کی اسے تلاش تھی وہی ندارد تھی۔

''شانی...... شانی......'' اس نے ملازم لڑکے کو آواز دی۔

جی بھائی۔'' کچھ ہی دیر میں وہ آ گیا۔

''یار میری ساری فائلز کیا یہیں پر ہیں؟''

''تم نے کہیں اور تو نہیں رکھیں؟'' وہ پریشان سا لگ رہا تھا۔ اُکتایا اُکتایا سا......

''بھائی میں نے تو نہیں رکھیں البتہ آپ کچھ اور فائلز بھی لائے تھے واپسی پر۔'' وہ بولا۔

''ہاں...... وہی یار...... جاؤ جلدی سے لے کر آؤ۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر بولا۔

''جی......'' وہ مسکراتا ہوا پلٹ گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چند فائلز تھیں۔

''گڈ یار......'' وہ مسکرایا۔

''اچھا اب مجھے ایک کپ اچھی سی چائے پلاؤ اور ساتھ میں کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو بھی لیتے آنا۔'' وہ فائلز تھام کر بولا۔

''جی......'' وہ پلٹ گیا۔

اس نے فائلز جانچنا شروع کیں۔

''ارے یہ فائل تو میری نہیں ہے۔'' ایک لال رنگ کی فائل پر اس کی توجہ مبذول ہوئی۔

اس نے پہلے وہی فائل کھولی۔

اس میں پرویز فاروقی سے متعلق پیپرز تھے۔

''اوہ...... یہ تو چاچا کی فائل ہے...... میں اروشہ کو دینا ہی بھول گیا۔''

وہ پیپرز کو پڑھنے لگا۔ اس میں کچھ میڈیکل ہسٹری تھی چاچا کی کچھ پیپرز اُن کی پراپرٹی سے متعلق تھے۔ پیپرز دیکھتے ہوئے اُس کی نظر اُس خط پر پڑی۔ اس نے وہ خط نکالا اور اُسے پڑھنے لگا۔

وہ خط اروشہ نے اپنے بابا کے نام لکھا تھا۔

جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جا رہا تھا ویسے ہی اس کے چہرے کے تاثرات واضح طور پر بدل رہے تھے۔

''اوہ...... تو یہ مسئلہ ہے۔'' خط پڑھ کر اس کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی اسی خط سے متعلق

دوسری چیزیں بھی ملیں۔
''ہوں...... او کے اب جاؤں گا تو دے دوں گا۔'' اس نے خود کلامی کی پھر دوبارہ فائل بند کردی۔

☆......☆......☆

آج صبح ہی سائرہ کا فون آیا تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ شام کو آئیں گے...... تبھی سے شہلا بیگم خوب تیاریوں میں مصروف تھیں۔
شہلا بیگم نے شانزے کو بھی ہدایت کردی تھی کہ یونیورسٹی سے جلدی آجائے۔
ریحان کچن میں داخل ہوا تو چار سو کھانے کی خوشبوؤں نے بانہیں کھول کر خوش آمدید کہا۔
''واؤ تائی امی خیریت ہے......'' وہ سالن بھونتی شہلا بیگم کے عقب میں آکر کھڑا ہوگیا اور ساتھ ہی للچائی نظروں سے بھونتے گوشت کو دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی کٹے کھیرے جو سلاد کی غرض سے کاٹے گئے تھے اُن کو کھانے لگا۔
''ہاں بیٹا خیریت ہے بس کچھ مہمان آرہے ہیں شام میں تو بس اسی کی تیاری ہے۔'' وہ چمچ ہلاتے ہوئے بولیں۔
''لگتا ہے خاص مہمان ہیں جبھی تو اتنی تیاری ہورہی ہے۔'' وہ دوسرے سالن کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے بولا۔
''جیو تائی امی کیا مزے کا پالک گوشت لگ رہا ہے۔'' وہ اُس کی اشتہا انگیز خوشبو سونگھتے ہوئے بولا۔
''مطلب آج تو مزے ہی آجائیں گے کھانے کے، واہ جی واہ......'' وہ ناچنے لگا۔
''چٹورہ ہے یہ لڑکا تو۔'' تائی نے اسے سائیڈ پر کیا اور ہنس دیں۔
''بیٹے مزے تو تب آئیں گے نا جب مہمانوں سے کچھ بچے گا۔'' سحرش نے اُس کے کان کھینچے۔
''اوہ...... بھابی پیار سے' پیار سے......'' وہ کان کو پکڑتے ہوئے بولا۔
''اور دیکھنا ضرور بچے گا بھئی آخر کو ریحان فاروقی کی نظریں ہیں اس پر اگر نہ بچا تو مہمانوں کو بھی ہضم نہیں ہونا۔'' وہ کہہ کر بھاگ گیا چنداں کہ تائی کچھ سنائیں۔ دونوں مسکرانے لگیں۔
''امی کچھ اور کرنا ہے تو بتادیں۔'' سحرش نے کاؤنٹر پر آکر اپنی خدمات پیش کیں۔
''ہاں بیٹا میں چاہ رہی تھی کہ کھانے تو دیسی ہیں کیوں نہ میٹھا ذرا جدید سا ہو...... تم کچھ اچھا سا بنالو۔'' وہ مصروف سی بولیں۔
''کیوں نہیں۔'' سحرش مسکرانے لگی اور ساتھ ہی سامان نکالنے لگی۔
شام میں سائرہ کے ہمراہ وہ عورتیں آئیں جن میں ایک اُس کی ساس دوسری لڑکے کی ماں اور ایک بہن تھی۔
انہیں ڈرائنگ روم میں بطورِ خاص بٹھایا گیا۔ سائرہ کی ساس چونکہ پہلے بھی آچکی تھیں لہٰذا وہ نارمل تھیں۔ مگر دونوں خواتین جو پہلی بار آئی تھیں وہاں کی سجاوٹ سے کافی مرعوب نظر آرہی تھیں۔
میرون کلر کے مخملی صوفے تھے جن کے اوپر ریشمی آف وائٹ کلر کے گداز سے کشن تھے۔ چنیوٹی لکڑی کے صوفے پرانے اور نئے امتزاج کا خوبصورت ملن تھے۔
اسی کمبی نیشن کا خوبصورت قالین بچھا تھا اور درمیان میں شیشے کی جدید طرز کا میز تھا جن پر کرسٹلز کے بہت سے پیس تھے۔
آف وائٹ کلر کی دیواریں تھیں اور میرون

اور آف وائٹ امتزاج کے پردے تھے۔ جنہیں خوبصورت طریقے سے بڑے بڑے ربی دانوں سے مقید کیا گیا تھا۔

درمیان میں چھت پر ایک بڑا فانوس تھا۔ اور دیواروں پر مختلف پینٹنگز تھیں۔

ڈرائنگ روم کے دو دروازے تھے ایک دروازہ لان میں راہ داری میں کھلتا تھا جبکہ دوسرا اندر کی طرف کھلتا تھا۔ لان والا دروازہ بھاری لکڑی کا تھا۔ جس پر خوبصورت نقش بنے تھے جبکہ اندر والا گلاس کا تھا۔ جس پر مختلف رنگوں سے بیل بوٹے بنے تھے گلاس پینٹ کے......

''امی گھر تو عالیشان ہے۔'' آنے والی نے ماں کے کان میں کہا۔

''ہوں چیزیں مہنگی اور قیمتی معلوم ہوتی ہیں۔'' ماں بھی بہت مرعوب دکھائی دے رہی تھی۔

''آنٹی لیں ناں کچھ۔'' سحرش نے آدابِ میز بانی نبھایا اور ٹرے آگے کی۔

''کیوں نہیں بیٹا۔'' عورت نے بڑھ کر چکن پیس اٹھا کر اپنی پلیٹ میں ڈالا۔

''السلام علیکم!'' عالیہ بیگم بھی اندر آئیں۔

مہمانوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔

''انہیں تو آپ جانتی ہی ہوں گی ناں پھوپو۔ میری چاچی جی ہیں۔'' سائرہ نے تعارف کا فرض ادا کیا۔

''ہاں بھئی کیوں نہیں تمہاری شادی میں ملاقات رہی تھی اِن سے۔'' آنے والی خوش مزاجی دکھا رہی تھیں۔

''کیا حال ہیں آپ سب کے۔'' عالیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے...... آپ سنائیں بہن۔''

''اللہ نے بہت کرم کر رکھا ہے...... اس کا جتنا شکر ادا کریں کم ہی معلوم ہوتا ہے۔'' وہ شہلا کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔

''سحرش دیکھو بیٹا شانزے کہاں ہے بھئی بلاؤ اسے۔'' شہلا بیگم نے کہا۔

جی وہ اٹھ کر باہر نکلی تو سامنے اروی سے ٹکرا گئی۔ وہ ابھی یونیورسٹی سے آئی ہی تھی۔

''آرام سے بھابی کیا ہو گیا۔'' اروی نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

''سوری یار...... میں نے دیکھا ہی نہیں۔''

''او ہو...... خیر ہے خیر ہے میرا کون سا سر پھٹ گیا ہے۔'' اروی ہنسی تو سحرش بھی ہنسنے لگی۔

ڈرائنگ روم میں دونوں کی ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کیونکہ سحرش نے واپسی پر دروازہ کھلا ہی چھوڑا ہوا تھا۔ البتہ پردے کی وجہ سے خواتین دیکھ نہیں پائیں تھیں کہ ہنس کون رہا ہے۔

''اچھا تم جاؤ میں ذرا شانزے کو بلا لاؤں۔''

''کوئی آیا ہے کیا؟'' اروی نے دروازہ کھلا دیکھا تو اشارہ کر کے بولی۔

''ہوں...... شانزے کو دیکھنے آئی ہیں سائرہ کے سسرالی رشتے دار ہیں۔''

''اوہ...... اچھا...... چلیں ٹھیک ہے پھر آپ بلائیں میں ذرا چینج کرلوں۔'' وہ بیگ سنبھالتے ہوئے چلی گئی۔

''آؤ بیٹا اندر آؤ۔'' شہلا بیگم نے مسکرا کر شانزے کو بلایا جو تھوڑی کنفیوز سی دروازے پر کھڑی تھی۔ سحرش اسے چھوڑ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

اندر کمرہ روشنی میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ پردوں کی اوٹ سے کالا آسمان نظر آ رہا ہے۔ شام ڈھلے اب کافی وقت بیت گیا تھا۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھی۔ اور سلام کیا......
وہ سائرہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
''بہن جی یہ میری بیٹی ہے شانزے۔'' وہ تعارف کرا کر بولیں۔
''آنے والی تھوڑی پریشان سی لگیں شانزے کو دیکھ کر...... پنک کلر اور پیلے خوبصورت کمبی نیشن میں جدید طرز کا سوٹ پہنے ساتھ میں میچنگ جیولری میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔
''امی اُس لڑکی کے بال تو گھنگھریالے نہیں تھے؟'' لڑکی نے کان میں کہا۔
''ہوں......'' عورت نے تشویش سے کہا۔
''کیسی ہو بیٹا تم؟'' سائرہ کی ساس نے کہا۔
''ٹھیک ہوں آنٹی میں۔'' شانزے مسکرائی۔
''باجی یہ گھور کیوں رہی ہیں کیا میں عجیب لگ رہی ہوں۔'' آنے والیوں کو گھورتا پا کر شانزے نے سائرہ کے کان میں کہا۔
''ایسے ہی ہوتا ہے بیٹے جانی۔'' سائرہ دانت چبا کر مسکرائی۔
''اچھا......!'' اُس کے منہ سے بس اتنے ہی الفاظ نکلے......اور وہ زبردستی مسکرانے لگی حالانکہ دل تو کر رہا تھا کہ اس طرح دیکھنے پر کچھ سنا ڈالے اُن آنٹیوں کو...... مگر اپنی امی کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ کیونکہ وہ مسلسل اسے ہی گھور رہی تھیں۔
''آئیں امی کھانا لگ گیا ہے۔'' سحرش نے آ کر کھانے کی دعوت دی۔
''چلیں آئیں آپ لوگ......'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔
''ارے بہن آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی...... دیکھیں ماشاء اللہ سے کتنا کچھ تو آپ نے کر دیا تھا'' سائرہ کی ساس نے سامنے سجے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا جو مختلف انواع کے اسنیکس وغیرہ سے سجا تھا۔
''ارے بہن کھانے کا وقت ہے اب اچھا تو نہیں لگتا ناں کہ آپ کھانا کھائے بغیر ہی چلے جائیں۔''
عالیہ نے نرم لہجے میں کہا جو اُن کا خاصہ تھا۔
''اروی ذرا یہ باؤل رکھ آؤ میں رکھنا بھول گئی ہوں۔'' سحرش بدحواس لگ رہی تھی پہلی بار وہ اتنی بڑی ذمہ داری اٹھا رہی تھی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔
''ریلیکس بھابی......'' وہ مسکرائی اور باؤل لے کر نکلی۔
سامنے بیٹھی خواتین کو دیکھ کر جیسے وہ پتھر کی بن گئی تھی۔
''یہ تو اسی کی ماں اور بہن ہیں؟'' وہ شاک تھی۔ وہ انہیں اچھے سے پہچانتی تھی۔ کیونکہ اُس کے لیپ ٹاپ میں وہ اُن کی بہت سی تصاویر دیکھ چکی تھی۔
''ارے بیٹا وہاں کیوں ہو لاؤ نا......'' عالیہ نے اُسے یوں بت بنے دیکھا تو بولی۔
باقی خواتین بھی متوجہ ہوئیں۔
اپنی روایتی حلیے میں بال کھولے وہ کھڑی تھی۔
''جی...... جی جی......'' وہ آئی خاموشی سے باؤل رکھا اور مڑ گئی۔ شہلا بیگم نے اُس کے اطوار کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔
''امی یہ ہے وہ......؟'' لڑکی نے پھر ماں کے کان میں کہا۔
''بہن یہ کون ہے؟'' آنے والی کافی متجسس تھیں۔
''یہ......'' انہیں لگا جیسے بہت ہی کڑوا بادام

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آ گیا ہے منہ میں۔

''میرے دیور کی بیٹی ہے یہ۔''

''اچھا آپ کی۔'' وہ عالیہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''نہیں نہیں...... میری نہیں مجھ سے چھوٹے دیور ہیں اُن کی ہے۔''

''اچھا مگر نظر نہیں آئے کبھی۔''

سائرہ کی ساس نے کہا تو عالیہ نے شہلا کو دیکھا۔

''وہ دراصل اُن کا انتقال ہو گیا ہے نا...... اسی لیے......''

''یہ لندن سے آئی ہے وہیں پلی بڑھی ہے۔'' عالیہ نے کہا۔

''اور آپ تو جانتے ہی ہیں ناں کہ وہاں کے بچوں میں ہمارے ہاں کے بچوں کی طرح تمیز تہذیب کہاں آتی ہے...... بس ایسی ہی ہے یہ۔'' انہوں نے طنز کیا...... مبادا بات ارویٰ کی ہی نہ ہو۔ کیونکہ اروٰی بے شک شانزے سے زیادہ خوبصورت تھی۔

''ہوں...... صحیح کہا ہے آپ نے۔'' پھوپو نے کہا مگر اُن کی سوچ کچھ اور ہی تھی۔

☆......☆......☆

اروٰی اپنے کمرے میں آ کر ٹہلنے لگی۔ کبھی وہ ایک کونے میں جاتی تو کبھی دوسرے کونے میں...... وہ بہت پریشان تھی۔

''اللہ کیا کروں میں......'' اُن کی آمد کا اُسے اندازہ تھا۔ بقول اس کے اُس کی ایک ہی بہن ہے اور بھائی کوئی نہیں ہے۔ یعنی یہ عورتیں یقیناً اُسی کا رشتہ لے کر آئی ہیں میں کیسے بتاؤں سب کو...... اللہ جی......'' وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔

''اگر احتشام کا بتاؤں گی تو یقیناً میرا اپنا بھی راز افشاں ہو جائے گا......'' سوچ سوچ کر اُس کا سر گھومنے لگا۔

نیم تاریک کمرے میں وہ خود بھی تاریکی میں ڈوبتا ہوا محسوس کر رہی تھی خود کو۔

''کروں تو آخر کیا کروں......'' وہ سر تھام کر باہر دیکھنے لگی۔ باہر لان میں مکمل خاموشی تھی۔ بس پودوں کے درمیان لگی پیلی روشنی جگمگا رہی تھی۔ جس سے پودے روشنی میں نہانے لگتے تھے۔

سوچ سوچ کر اُس کا دماغ شل ہونے لگا تھا۔ اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں ہوئی تھیں اور باہر کھوئی ہوئی تھی۔

''آج وہ لوگ آئے تھے۔'' شہلا فاروقی کافی جوش سے بتا رہی تھیں۔

''اچھا پھر......'' نذیر صاحب متوجہ ہوئے۔

''پھر کیا دیکھ گئے ہیں وہ شانزے کو......'' وہ مسکرائی۔

''کوئی جواب نہیں دیا؟''

''لو اتنی جلدی......'' وہ حیران ہوئیں۔

''مگر مجھے یقین ہے کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے...... ہم نے آؤ بھگت ہی تھوڑی کی ہے کیا؟'' وہ مغرور تھیں۔

''سنیں...... مجھے ایک ہی بات کا خدشہ ہے۔'' یکدم وہ متفکر ہوئیں۔

نذیر صاحب نے انہیں دیکھا۔ لیمپ کی روشنی میں اُن کے چہرے کی اُلجھن صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

''کیا؟'' وہ سنجیدہ ہوئے۔

''اروٰی کو دیکھ کر جو اُن کا انداز تھا مجھے وہ چونکا گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود سے مطلب جان بوجھ کر نہیں آئی تھی۔ مگر وہ اسے بڑی پذیرائی سے دیکھ رہی تھیں۔ سنیں نذیر صاحب میں کہے دیتی

ہوں..... اگر اس بار کچھ ہوا نا تو میں بھی چپ نہیں رہوں گی۔'' وہ انگلی سے تنبیہ کرتے ہوئے بولیں۔

''میں اسے اپنی بیٹی کے حق پر ڈاکہ مارنے ہرگز نہیں دوں گی۔ جس طرح اس کی ماں نے فائزہ کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا۔'' وہ غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔ نذیر صاحب اُن کے چہرے کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

☆......☆......☆

''بڑے بابا میں آ جاؤں۔'' وہ اندر جھانک کر بولی۔

''ہاں آؤ نا بیٹا!'' وہ سیدھے ہوئے اور اُسے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

وہ ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''کیسی طبیعت ہے آپ کی بڑے بابا...... مجھے بتایا تھا کہ آپ بیمار تھے؟'' وہ فکری مندی سے اُن کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''ارے نہیں بیٹا یہ بیماری کیا ہے...... بس عمر کا تقاضا ہے یہ...... چھوٹی چھوٹی بیماریاں تو چلتی رہتی ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر مسکرائے۔

''تم بتاؤ تم اور بھی کمزور لگ رہی ہو۔'' وہ اس کا چہرہ تھام کر بولے۔

''نہیں...... بالکل نہیں۔'' وہ مسکرائی تاکہ اندر کا حال کہیں چہرے سے عیاں نہ ہو جائے۔

''بابا میں بالکل ٹھیک ہوں آپ بالکل فکر نہ کریں بس ذرا پڑھائی کا اسٹریس ہے اور تو کچھ نہیں اسی لیے کمزور لگ رہی ہوں۔''

''چلو تم کہتی ہو تو مان لیتے ہیں بھئی...... ویسے بھی آج کل کے بچوں سے جیتنا وہ بھی بحث میں بالکل ناممکن سی بات ہے ہم بڈھوں کے لیے۔'' وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولے۔

اروی نے پیار سے اپنے دادا کو دیکھا سفید بال جیسے چاندی اتر گئی ہو بالوں میں چہرے پر جھریاں بہت نمایاں تھیں جو اُن کی ماہ و سال جو گزار لیے تھے اس کی ترجمانی کر رہی تھیں کہ کیسی کیسی بہار اور خزاں اس نے دیکھ لیں ہیں۔ تبسم سے ہونٹ تھے جو اُن کی مشفق ہونے کی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ کتنے بارعب مگر شفیق سے لگتے تھے۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔

''کیا کھوج رہی ہو ہماری گڑیا ہمارے چہرے میں۔'' وہ اس کی ناک کھینچ کر بولے۔

اروی کی آنکھیں ایک دم نم ہو گئیں۔ وہ بڑھ کر اُن کے سینے سے لگ گئی۔ جیسے دنیا میں واحد سائبان بس یہ ہی باہیں ہوں۔

''آئی لو یو بابا......'' وہ رو دی۔

''آئی لو یو ٹو میری جان......'' وہ گرم جوشی سے اُس کا ماتھا چوم کر بولے۔ وہ دیر تک اُن کے سینے سے لگی باپ کی لو دیتی محبت کو محسوس کرتی رہی۔ وہ اسی طرح اپنے بابا کے سینے سے لگ کر ان سے ڈھیروں باتیں کرتی تھی مگر آج اس کے پاس جیسے الفاظ گم ہو گئے تھے۔ آج وہ بس اپنے اندر کی گھٹن کو کم کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

''بابا ہر انسان زندگی میں کوئی نا کوئی غلطی کرتا ہے نا...... اور اگر اس وقت جس وقت اس نے وہ کام کیا ہو...... وہ قدم ٹھیک لگے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ قدم غلط تھا اور وہ اس کی زندگی کی بھول بن جائے تو کیا پھر بھی وہ انسان سزا کا حق دار ہوتا ہے۔'' وہ اُن کے سینے سے الگ ہوئی اور آنکھوں کو صاف کر کے بولی۔

''کیوں بیٹا تم ایسا سوال کیوں کر رہی ہو؟ وہ

بھی یوں اچانک؟'' وہ حیرانی سے بولے۔
''بس بابا ویسے ہی دل میں خیال آیا تو پوچھ لیا۔'' وہ ٹالتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی نظریں چرا گئی۔
''کیا تم نے بھی کوئی بھول کی ہے ارویٰ۔'' اب وہ سنجیدہ تھے۔
''ن...... ن...... نہیں...... نہیں بابا...... بس یوں ہی پوچھ بیٹھی تھی۔'' اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔
''اوہ دیکھیں 11:30 ہوگئے ہیں اور مجھے صبح یونیورسٹی بھی جلدی جانا ہے تو میں چلتی ہوں۔'' وہ اپنا دامن بچانا چاہتی تھی اسی لیے اٹھ گئی۔
جبکہ اُن کے چہرے پر گہری سوچ تھی جو اس کے اطوار دیکھ کر گہری ہورہی تھی۔
وہ ایک دم بوکھلا گئی تھی جیسے چوری پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔
''گڈ نائٹ بابا......'' وہ بڑھی اور اُن کا ماتھا چوم لیا اور مسکرا کر نکل گئی جبکہ وہ اب بھی گہری سوچ میں غرق تھے۔

☆......☆......☆

آج سنڈے تھا لہٰذا سبھی ناشتے سے فارغ ہوکر ابھی ٹیبل پر ہی تھے کہ شہلا کا موبائل بج اٹھا۔
''سائرہ کا نمبر ہے۔'' وہ مسکرائی اور فون اٹھالیا۔
شانزے اور سحرش دونوں بڑے تجسس سے دیکھ رہے تھے۔
''کیا حال ہے تمہارا؟'' وہ مسکرائی۔
''ٹھیک ہوں امی آپ سنائیں سب کیسے ہیں۔'' وہ ٹہلتی ہوئی ٹیرس میں آ ئی جہاں ہوا کے جھونکے نے اُس کو خوش آمدید کہا۔
''سب ٹھیک ہیں...... بھئی تم جب سے گئیں پلٹ کر خبر ہی نہیں لی تم نے......''

''بس امی مصروف تھی میں...... یونیورسٹی میں پیپرز ہورہے تھے ناں......'' وہ پریشان تھی۔ کبھی ریلنگ پر کھڑی ہوتی تو کبھی دوسرے کونے میں پودے رکھے تھے وہاں جا کر پتے نوچنے لگتی اس کے اطوار سے واضح لگ رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔
''اچھا یہ بتاؤ پھر احتشام کے گھر والوں نے کیا کہا۔'' وہ متجسس تھیں۔
شانزے کے چہرے پر سرخی بکھر گئی۔ جبکہ اروٰی کا سارا جسم اُس کی سماعت بن گیا اس کا ہاتھ ہوا میں جہاں تھا وہیں تھم گیا۔
سائرہ نے ہونٹ کاٹے......
''کیسے بتاؤں میں؟'' وہ ماتھے سے پسینہ پونچھ کر بولی۔
اگر بتایا تو گھر میں قیامت سی آ جانی ہے......
وہ سر تھام کر کھڑی تھی۔
حالانکہ اُس نے اسی لیے فون کیا تھا مگر اب اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے۔
''بولو بھی سائرہ...... کب آرہے ہیں پھر وہ لوگ باقاعدہ رسم کے لیے......'' وہ مغرور سے لہجے میں بولیں۔
یہاں پر بھی سبھی متوجہ تھے۔
''لو اِسے دیکھو کیسے گلابو بی بن رہی ہے۔'' ریحان اُس کی شکل دیکھ کر ہنس دیا۔
''چپ کرو تم......'' وہ خفا ہوئی۔ سبھی ہنس دیے سوائے اروٰی کے...... جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔
''وہ...... وہ امی پھوپو لوگوں کو اروٰی پسند آئی ہے اور وہ احتشام کا رشتہ اروٰی سے کرنے کے خواہاں ہیں۔'' وہ بمشکل بول پائی۔
''کیا......'' یہ الفاظ سن کر اُن کے تن بدن

میں آگ لگ گئی۔
''کیا کہا تم نے؟'' وہ غصے میں بولیں۔
سارے سنجیدہ ہوگئے۔ جبکہ اروی کا دل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔
''جی...... امی انہوں نے یہ ہی کہا ہے کہ انہیں شانزے سے زیادہ اروی پسند ہے اور وہ گھر بھی اروی کے لیے ہی آئے تھے انہیں لگا کہ اروی میری بہن ہے۔'' وہ خفیف سی بولی۔
شہلا نے غصے میں آکر فون بند کر دیا۔
سائرہ کا رنگ یکدم متغیر ہو گیا۔
''اللہ اروی پر رحم کرنا۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
''کیا ہوا ہے بھابی...... '' عالیہ بھی اُن کے چہرے کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔
''کیا انکار کر دیا انہوں نے؟'' نذیر صاحب نے کہا۔
''انکار کرتے تو اتنا دکھ نہ ہوتا مجھے مگر......''
اُن کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ سبھی پریشان ہو گئے۔
وہ یکدم اروی کی طرف پلٹی۔
''مگر انہوں نے اروی کا رشتہ مانگا ہے۔'' وہ اُسے گھور کر بولیں۔
''کیا کہا امی اروی کا؟'' سحرش کو بھی شاک لگا۔
''ہاں اِس منحوس کا......'' وہ اُس کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔
شانزے کا چہرہ یکدم مرجھا گیا۔ جبکہ اروی کی وہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں اُس کا رنگ سفید پڑ گیا۔
''چلو ٹھیک ہے ابھی تم خاموش رہو ہم انکار کر دیں گے۔'' نذیر صاحب انہیں ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بولے۔

''تایا ابو......'' اروی کی آواز بلند ہوئی۔
سبھی متوجہ ہوئے۔
''اگر مناسب سمجھیں تو آپ ہاں کر دیں......'' اُس کی آواز بالکل صاف تھی۔ زبان پر ذرا برابر بھی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ اُسے خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی ہے۔
''سن لیا آپ نے...... میری بیٹی کے حق میں ڈاکہ ڈال دیا نا اس منحوس نے آخر جس کا ڈر تھا وہی ہوا ناں۔'' شہلا غصے سے اونچی اونچی بول رہی تھی جبکہ وہ سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ دروازہ بند کرتے ہی اس نے لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیا جیسے بہت دور سے بھاگتی آ رہی ہو۔ جیسے بہت لمبی مسافت طے کی ہو۔

☆......☆......☆

''میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ نذیر صاحب سن لیں آپ کان کھول کر۔'' وہ غصے میں زور زور سے بول رہی تھیں۔
''اچھا امی آپ چپ تو کریں......'' شہریار بڑھ کر انہیں سنبھالنے لگا۔
''سحرش پانی لاؤ یار۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا تو وہ کچن کی طرف دوڑی۔
''یہ کیا ہو رہا ہے نذیر......'' بڑے بابا جلال میں باہر آئے۔
''کب سے ہمارے گھر کا یہ شیوہ ہو گیا کہ یہاں کی عورتیں حلق کے بل چیخیں۔'' وہ انتہائی غصے میں تھے۔
''بابا آپ بیٹھیں۔'' ناصر صاحب نے انہیں تھاما۔
''ہٹو پیچھے۔'' انہوں نے انہیں جھٹکا دیا۔

بابا کو غصے میں دیکھ کر شہلا کی زبان بھی تالو سے جا لگی۔

''ایسی بھی کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے اس گھر میں کہ تمیز تہذیب کو ایک طاق پر رکھ چھوڑا ہے تم لوگوں نے...... میں تمہارے معاملات میں بولتا نہیں ہوں اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی شہلا کو اروی پر گرجتے دیکھا ہے مگر کچھ کہا نہیں ہے۔ لیکن اب بس بہت ہوگیا۔ زندہ ہوں میں ابھی سمجھے سب......'' وہ زور سے گرجے تو سب ساکت ہوگئے۔ بڑے بابا کو اتنے غصے میں پہلے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

''بابا آپ بیٹھ جائیں پلیز...... پانی دو بابا کو ورنہ طبیعت نہ بگڑ جائے۔'' عالیہ نرمی سے بولیں۔

اروی کو اپنا جسم لرزتا ہوا لگ رہا تھا۔ اسے سب کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی اور ہاتھوں میں پسینہ آ رہا تھا جسے بار بار وہ رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔

''ہوا کیا ہے؟ یہ معاملہ ابھی نمٹ جائے گا......'' وہ جیسے تمام معاملات ابھی ختم کرنے کے درپے تھے۔

نتیجتاً نذیر صاحب نے قصہ مختصر طور پر سنا ڈالا۔

انہوں نے خاموشی سے سنا۔

''اس سب میں اروی کا کیا قصور ہے اگر رشتہ اُس کے لیے آیا تھا تو......'' وہ اُلٹا شہلا پر برسے۔

''بابا وہ میری بیٹی کا حق مار رہی ہے جیسے اس کی ماں نے میری بہن کا مارا تھا۔'' وہ اب بھی اپنے موقف پر ڈٹی تھیں۔

''اور بابا ویسے بھی آپ جانتے ہی کتنا ہیں اُسے جو اُس کے حمایتی بنے بیٹھے ہیں۔'' وہ بے ادب ہو رہی تھیں غصے میں۔

''شہلا......'' نذیر صاحب بولے۔

''خاموش رہو تم......''

''کیوں خاموش رہوں ہاں...... بتائیں مجھے...... بابا کو بھی اپنی چہیتی کا پتہ ہونا چاہیے...... کہ کیا کیا گل کھلا کر آئی ہیں وہ باہر سے۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔ جیسے سارے حساب بے باق کرنا چاہتی ہوں۔

''بلائیں ناں ذرا اپنی اس چہیتی کو ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح بولیں جس کی اولاد پر دشمنوں نے دھاوا بول دیا ہو۔

بڑے بابا کا چہرہ ضبط کے مارے لال ہو رہا تھا اپنی بہو کے گستاخ رویے پر وہاں پر موجود سبھی لوگوں کی سانس ساکت تھی۔

''ناصر بلاؤ اسے بھی۔'' وہ اُن کی طرف دیکھ کر بولے۔

''تم سب بھی بیٹھ جاؤ اب یہ معاملہ یہاں پر ہی نمٹ جائے گا۔'' وہ غصے میں سب کو دیکھ کر بولے جو ابھی تک کھڑے تھے۔ سارے چپ چاپ بیٹھ گئے۔

''بھائی کیا ہونے والا ہے؟'' ریحان عثمان کے کان میں بولا۔

عثمان نے کندھے اُچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ شانزے، سحرش، شہریار اور شہزاد کی حالت بھی اُن سے الگ نہیں تھی۔

اروی ڈرتے ڈرتے نیچے آئی جیسے اسے پھانسی کے تختے تک لایا جا رہا ہو اور جلاد بالکل تیار ہو کہ کب ملزم آئے اور کب وہ اپنا کام کر گزرے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

وہ سب کے درمیان بالکل کسی ملزم کی طرح کھڑی تھی اور باقی سب تماشائی بن کر دیکھ رہے تھے۔

''جی بڑے بابا......'' اس کی ہلکی سی آواز نکلی۔ اسے اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''پوچھیں ناں بڑے بابا اس سے...... کہ کہاں بھاگ گئی تھی یہ اپنے گھر سے...... اور کس کے ساتھ منہ کالا کرا کر آئی ہے۔ پوچھیں بابا پوچھیں ناں......'' وہ گرجی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم شہلا......'' انہیں اپنی سماعت پر یقین نہ ہوا۔

''جی سچ کہہ رہی ہوں میں......'' وہ گردن اکڑا کر بولیں۔

اروی کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا...... اس کا دل کر رہا تھا کہ یا تو آسمان سر پر گر جائے یا وہ دھرتی میں سما جائے۔ لیکن بس وہ یہاں نہ رہے...... کسی ڈروانے خواب کی طرح حقیقت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ یہ ہی وہ وقت تھا جس سے وہ بچنا چاہتی تھی...... جس سے وہ بھاگ رہی تھی۔

''کیا یہ صحیح کہہ رہی ہے اروشہ......'' وہ اب اس سے مخالف تھے۔

وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا جھکا ہوا سر خود بخود اعتراف جرم کر رہا تھا۔

''اروشہ......'' اُن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

جبکہ وہ فخر سے اپنے کارنامے پر مسکرا دیں...... سینے میں جیسے ٹھنڈی پھوار پڑی تھی جو انہیں اندر تک شاداب کر گئی تھی۔

''ہوں...... انداز تو دیکھو جیسے دنیا میں ان سے بڑا کوئی پارسا پیدا ہی نہ ہوا ہو...... ہونہہ...... نہ جانے کتنی راتیں باہر گزار کر آئیں ہیں یہ محترمہ...... داغ دار دامن کے ساتھ...... اور چلے ہیں میری بیٹی کا مقابلہ کرنے......''

آگ کے شعلے جو تائی کے منہ سے نکل رہے تھے اسے جلا کر بھسم کر رہے تھے۔

وہاں موجود سبھی تائی کے الفاظ سے شرم سار لگ رہے تھے مگر جس کو کہا گیا تھا وہ سر جھکائے سن رہی تھی اس نے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔

وہ اندر داخل ہوا تو سامنے کا ماحول کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اروشہ کسی ملزم کی طرح کمرے کے وسط میں کھڑی تھی جھکے سر کے ساتھ جبکہ بابا جانی سامنے سر تھامے بیٹھے تھے باقی سب بھی شرمندہ سے موجود تھے اور تائی گرج رہی تھیں۔

''جیسی ماں ویسی ہی بیٹی نکلی تھی ناں...... اس نے میری بہن کے حق پر ڈاکہ ڈالا اور یہ بدچلن' بدذات لڑکی چلی ہے میری بیٹی کے حصے کی خوشیاں چھیننے...... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔''

بڑے بابا کو لگا جیسے اُن کے سر پر ٹنوں وزن آن پڑا ہو جو وہ اٹھا نہیں پا رہے تھے۔ اُن کو اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''بابا...... میری امانت......'' پاس ہی پرویز کی آواز اُن کے کان میں گونجی۔

''میری بیٹی بابا...... میری امانت......'' اروی باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی مگر زبان پر قفل تھا۔

حیان تائی کی گوہر افشانی کو حیرانی سے سن رہا تھا۔ اللہ اس عورت کے منہ میں زبان ہے یا انگارے چبائے بیٹھی ہیں یہ...... اوپر سے اسے اروی پر الگ غصہ آ رہا تھا کہ وہ یوں خاموش کیوں

ہے سچ بتاتی کیوں نہیں......''

''ارے میں اتنا کیوں بول رہی ہوں......
جب والدین ہی بے غیرت ہوں تو اولاد کون سی غیرت مند پیدا ہوگی۔''

''بس تائی امی بس......'' آخری الفاظ اروی کی برداشت سے باہر تھے، وہ گرجی۔

''بہت سن لیا میں نے...... سمجھیں آپ......''
نہ جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ گرج پڑی۔

''جو منہ میں آ رہا ہے وہ بولے جا رہی ہیں آپ اور میں سن رہی تھی لیکن خبردار جو میرے ماں باپ کو کچھ بھی کہا تو...... میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔'' وہ انگلی سے تنبیہ کرتے ہوئے بولی۔

اس کے انداز سے سبھی لوگ ذرا ہل گئے۔

''میں یہاں کسی کو صفائی دینے کی مجاز نہیں ہوں لیکن چونکہ بات میرے والدین کی ہے اس لیے بتا دیتی ہوں۔'' سبھی پوری سماعتوں سے متوجہ تھے۔ بڑے بابا نے بھی پہلی بار سر اٹھایا۔

''کیا بدچلن، داغ دار دامن اور نہ جانے کیا کیا کی رٹ لگائی ہوئی ہے آپ نے ہاں...... نہ میں بدچلن ہوں اور نہ میرا دامن داغ دار ہے سمجھے آپ، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔''

''ہاں میں گھر سے بھاگی تھی...... یہ سچ ہے مگر میں نے نکاح کیا تھا۔ سمجھے آپ سب......'' اس نے سب کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے نکاح کیا کیونکہ اس کا حق مجھے میرے مذہب نے دیا تھا۔ میں بالغ تھی اپنا فیصلہ کر سکتی تھی۔ میں ماما بابا کے جھگڑوں سے تنگ آ گئی تھی۔ اسی لیے ایک پاکستانی لڑکے نے مجھے پرپوز کیا۔ میں ناسمجھ تھی۔ بھاگنا چاہتی تھی اپنے حالات سے تنگ آ گئی تھی۔ میں روز روز کے جھگڑوں سے اسی لیے میں نے پرپوزل قبول کر لیا۔ میں نے نکاح کیا تھا گھر سے نکلنے سے پہلے...... مگر وہ لڑکا ...... ہونہہ...... وہ ٹیپیکل پاکستانی سوچ تھی اس کی جلدی ترقی کرنے کا خواہش مند...... جلدی سیٹل ہونا چاہتا تھا۔ گرین کارڈ کا لالچی تھا وہ...... اسے جب پتہ چلا کہ میں گھر سے کچھ بھی نہیں لائی ساتھ بلکہ خالی ہاتھ ہوں تو ایک رات خاموشی سے طلاق کے پیپر میرے سرہانے رکھ کر بزدلوں کی طرح چلا گیا وہ......'' وہ رو دی اور فرش پر ڈھے گئی۔

''میں نے کوئی گناہ نہیں کیا سمجھے آپ سب، میرا دامن بالکل صاف ہے......'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

سارے لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

''اور ہاں یہ لڑکا احتشام جس کا رشتہ آیا ہے نا میرے لیے یہ وہ ہی بزدل انسان ہے جو مجھے چھوڑ آیا تھا۔ میں تو اسے سبق سکھانا چاہتی تھی کہ لڑکی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی جس کے ساتھ جب دل کیا کھیل لیا...... اور جب دل بھر گیا تو زندگی سے نکال کر پھینک دیا۔''

''میں تو شانزے کو ایسے انسان سے بچانا چاہتی تھی۔'' وہ شانزے کو دیکھ کر بولی۔ جو شرمندگی سے آنسو بہا رہی تھی۔

وہاں پر موجود ہر آنکھ پُرنم تھی سوائے شہلا کے جو جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھیں۔ ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا تھا انہیں۔

لیکن اَنا کی دیوار اب بھی مضبوط تھی وہ کسی بھی طرح ہار ماننے کو تیار نہ تھیں۔

'ہم کیسے یقین کر لیں بی بی تمہاری باتوں پر ہاں...... کیا پتہ کہانی سنا کر ہمیں بے وقوف بنا رہی

ہو۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولیں تو اروی نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''ثبوت میرے پاس ہے کہ اروبشہ کا کہا گیا ایک ایک لفظ سچ ہے۔'' حیان دروازے کی اوٹ سے باہر آیا وہ کب سے باہر کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سب نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''حیان تم......!'' بڑے بابا کے منہ سے پہلی دفعہ الفاظ ادا ہوئے۔

''میرے پاس اس کے نکاح اور طلاق دونوں کے پیپرز ہیں۔'' وہ آگے بڑھا اور اروی کو اٹھایا۔

''تم فکر نہ کرو اروبشہ...... جاؤ اب اوپر باقی میں دیکھ لوں گا۔'' وہ اسے دیکھ کر بولا۔

''سحرش' شانزے......'' اس نے کہا تو دونوں فوراً آگے بڑھیں اور اسے تھام لیا۔

پھر وہ سیدھا بڑے بابا کے سامنے گیا اور دو زانو جھک گیا۔

''بابا...... آپ کو اس پر یقین ہے یا نہیں؟ مجھے دوسروں کی پرواہ نہیں ہے بس آپ کو تو اپنے خون پر یقین ہے نا...... کہ اس نے جو کہا بالکل سچ ہے۔'' وہ کچھ بھی ثابت کیے بنا جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا سوچتے ہیں...... کیونکہ اُن کی بات اس کے لیے سب سے اہم تھی۔

''بھئی تم ٹال مٹول سے کیوں کام لے رہے ہو اگر کوئی ثبوت ہے تو دکھاؤ میاں ورنہ ہمیں الو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' نذیر صاحب بھی غصے میں تھے۔

''بابا آپ کیا سوچتے ہیں وہ اہم ہے۔'' وہ پھر بولا۔

'مجھے اروبشہ کی کہی ہوئی ہر بات کا یقین ہے مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی سچ کہہ رہی ہے۔''

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولے۔

''جانتے ہیں بابا میں نے ایسا کیوں کیا تاکہ آپ گلٹی فیل نہ کریں کہ آپ کو اپنے خون پر یقین کرنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت پڑی تھی۔''

''حالانکہ میرے پاس سارے ثبوت ہیں کہ اس نے جو کہا بالکل سچ تھا۔'' وہ مسکرایا اور اُن کا ہاتھ چوم کر اٹھ گیا پھر بیگ سے فائل نکالی اور ان کو تھما دی جس میں اروبشہ کا خط تھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ وہ کسی احتشام نامی شخص سے نکاح کر چکی ہے اور اب وہ اس کے ساتھ جا رہی ہے ساتھ میں نکاح کے پیپرز تھے اور طلاق نامہ بھی تھا جو محض نکاح کے پندرہ دنوں بعد کا تھا۔

''اب اس موضوع پر کبھی بات نہ ہو۔'' شہلا بیگم کی طرف گھور کر بڑے بابا نے کہا تو وہ سر جھکا گئیں مگر غصے اور بے عزتی کے احساس سے خون کھول رہا تھا۔ جبکہ حیان انہیں لے کر اندر بڑھا...... اس نے ایک مسکراتی نظر شہلا بیگم کے شکستہ چہرے پر ڈالی اور بڑھ گیا۔

''ہوں......'' وہ پیپرز صوفے پر اچھال کر غصے سے پیر پٹختی اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

☆......☆......☆

اروی کا رو رو کر برا حال تھا۔ سحرش اور شانزے اسے خاموش کرانے میں لگیں تھیں۔ سحرش نے اسے زبردستی پانی کے کچھ گھونٹ پلائے...... تو اس کی حالت تھوڑی سنبھلی۔ وہ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی...... اور ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

شانزے پشیمان سی اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں اب بھی بندھی ہوئی تھیں۔

''شانزے تم رُکو اس کے پاس میں ذرا نیچے دیکھ کر آتی ہوں کہ کیا صورت حال ہے۔'' سحرش کہہ کر اروی کے کندھے پر تھپکی دے کر چلی گئی۔

''اروی......'' کچھ لمحوں بعد شانزے کی شرمندہ سی آواز آئی۔ اروی نے سر اٹھا کر دیکھنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ اس وقت اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ شانزے نے اروی کو افسوس سے دیکھا اور پھر اپنے اور اس کے درمیان چند ہاتھ کے فاصلے کو عبور کر کے اس کے مقابل ہوئی اور اس کے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔

''مجھے معاف کر دو اروشہ...... میں نے تمہیں بہت غلط گردانا ہے۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

اروی اب بھی بالکل خاموش تھی۔

''پلیز اروی...... مجھے معاف کر دو یار میں اپنے ہر برے رویے کے لیے تم سے انتہائی شرمندہ ہوں۔'' اُس کی آواز بھر آئی۔

اروی نے سر اٹھایا اور دقت سے مسکرائی۔

''میں تم سے بالکل بھی خفا نہیں ہوں شانزے میں تو کسی سے بھی خفا نہیں ہوں۔'' وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔

''میں تو خفا نہیں ہو سکتی کسی سے بھی...... میں کیسے خفا ہو سکتی ہوں...... ہاں......'' پھر خاموش ہو گئی جبکہ اس کی نظریں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

شانزے اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی کہ وہ پھر بول اٹھی۔

''ہاں...... میں خفا ہوں...... خود سے کہ یہاں کیوں آئی...... اپنی تقدیر سے کہ ایسا کیوں ہوا ہے...... ہاں میں خفا ہوں...... بہت خفا ہوں۔'' ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں برسات سی ہونے لگی اور آنسو بارش کی بوندوں کی طرح اس کے رخساروں پر چھم چھم گرنے لگے۔

شانزے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی۔

''آئی ایم سوری......'' وہ رو پڑی۔

☆......☆......☆

''اب کیسی حالت ہے اُس کی؟'' سحرش اسے نیند کی دوا دے کر آئی تو عالیہ نے اسے نیچے اترتے دیکھ کر پوچھ لیا۔

''چاچی جان اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔'' وہ تشویش سے بولی۔

''میں اسے نیند کی دوا دے کر آ رہی ہوں اسے سکون کی بہت ضرورت ہے۔'' وہ بولی۔

''ہوں تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! آج تو اس بیچاری بچی کے ساتھ بہت زیادتی کر دی ہے بھابی نے...... بہت غلط باتیں کیں ہیں اس سے۔'' وہ سحرش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر افسوس سے بولیں۔

''ہوں چاچی جی...... ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ عثمان کب سے ایک زاویے پر بیٹھا آج ہونے والے واقع پر سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے اور عالیہ کے درمیان پرسوں رات ہونے والی گفتگو پر بھی غور کر رہا تھا۔

''ماما آخر برائی کیا ہے اس میں؟''

''بیٹا کوئی برائی نہیں بظاہر مگر بیٹا جو بھی ہے ہمارے سامنے اُس کا ماضی بہت بڑا سوال ہے...... مجھے بس اس بات پر اعتراض ہے۔''

''ماما میں مانتا ہوں کہ تائی امی نے اس کا کردار بہت مشکوک کر دیا ہے مگر ماما وہ کئی مہینوں سے ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نے آج تک اس میں کوئی بھی برائی نہیں پائی ہے ماما......''

''ہوں......'' وہ خاموش تھیں۔ ان کی

خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ماما آپ نے مجھ سے میری پسند پوچھی تھی اور میری پہلی پسند اروی ہی ہے۔ آپ اسے میری خواہش بھی سمجھ سکتی ہیں۔ وہ الگ ہے دوسروں سے...... سمپل ہے...... شوخ نہیں ہے...... ہمیشہ مسکرا کر بات کرتی ہے۔ وہ ایک آئیڈیل ہے۔ آگے آپ بہتر جانتی ہیں۔'' وہ کہہ کر اٹھ گیا۔ جبکہ وہ عثمان کی باتوں پر غور کر رہی تھیں۔

''اب مجھے ماما سے دوبارہ بات کرنی چاہیے۔ یہ بالکل ٹھیک وقت ہے بات کرنے کا۔'' وہ کہہ کر اٹھا۔

☆......☆......☆

سائرہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح پورے گھر میں پھر رہی تھی۔

''اللہ پتہ نہیں وہاں کیا ہو رہا ہوگا؟ امی تو آگے ہی اروی کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اوپر سے یہ نئی افتاد......'' وہ بہت پریشان تھی۔

''اوپر سے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے کہ میں خود ہی چلی جاؤں۔ اچھا ان سے پوچھتی ہوں کہ کب تک آنا ہے انہوں نے؟'' اس نے فون کیا۔

''جی کب تک آنے کا ارادہ رکھتے ہیں آپ؟''

''اچھا...... چلیں ٹھیک ہے۔'' اس نے بے دلی سے فون رکھا۔ اگلے ہی پل اس نے شانزے کے نمبر ڈائل کیا۔

تیسری بیل پر فون اٹھایا گیا۔

''ہیلو شانزے اروی کیسی ہے؟'' اس نے جلدی سے سوال کیا۔

''باجی وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آج تو امی نے حد ہی کر دی تھی۔ آج بڑے بڑے راز کھلے ہیں۔''

''اچھا......'' وہ اور زیادہ پریشان ہوگئی۔

''شانزے پلیز...... اس بیچاری کا خیال رکھنا اوکے۔'' وہ تاکید کر کے بولی۔

''ہو سکے تو آ جاؤ باجی...... اسے تمہاری ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ تم ہی سے اٹیچ ہے۔'' وہ بولی۔

''یار میرا تو اپنا بھی یہ ہی ارادہ تھا مگر گھر پر کوئی نہیں ہے۔ وہ صبح ہی سے اپنے دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر ہیں اور ساس بھی گھر پر نہیں ہیں اب میں خالی گھر کو چھوڑ کر تو نہیں آ سکتی ناں۔''

''ہوں...... ٹھیک ہے باجی...... لیکن جب بھی فرصت ملے تم چکر لگا لینا اوکے۔'' شانزے نے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں...... میں فوراً آؤں گی۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے پھر تم خیال رکھنا اُس کا......''

''اوکے اللہ حافظ۔'' رات کے 10 بج رہے تھے۔ رات کے کھانے کا بھی کسی کو ہوش نہیں تھا۔ شہلا بیگم اپنے کمرے سے باہر نہیں آئیں تھیں۔ باقی سب بھی اپنے اپنے کمرے میں ہی تھے۔

''بابا کیا سوچ رہے ہیں؟'' حیان بڑے بابا کے سامنے اُن سے پوچھ رہا تھا۔

وہ بہت گہری سوچ میں تھے۔ جیسے بہت اہم فیصلہ کرنے کے خواہش مند ہوں۔

دوسری طرف سے جواب نا پا کر وہ خاموش ہوگیا۔ نیم تاریک کمرے میں لیمپ کی مدھم سی روشنی میں اُن کے چہرے پر سنجیدگی بہت نمایاں تھی اور ماتھے کی لکیریں اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہیں۔

وہ خاموشی سے بڑے بابا کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے وہ مسلسل انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''بابا میری امانت میری اروبشہ۔'' بار بار اُن کے کانوں میں یہ ہی الفاظ گونج رہے تھے۔

''آج جو ہوا وہ میرے لیے ناقابل برداشت سی بات ہے۔ میرا گھر کب میرے کنٹرول سے نکل گیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا......''

''ہمارے ہاں کی بہو بیٹیوں میں کب سے اتنی جرأت پیدا ہوگئی کہ وہ گھر میں گلے کے بل چیخیں۔ اور تذلیل کرنے کی آخری حدوں کو چھوئیں۔''

''آج جو بھی ہوا وہ ہرگز ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا حیان۔'' وہ متفکر سے گویا ہوئے۔

''مجھے معلوم ہے بابا...... ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ بولا۔

''میں چند ایک اہم فیصلے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں...... مجھے امید ہے کہ کم از کم تم میرا مان نہیں توڑو گے۔'' وہ عجیب باتیں کر رہے تھے جو حیان کی سمجھ میں ہرگز نہیں آرہی تھیں۔

''بابا...... مگر میرا ان سب سے کیا واسطہ؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہے نہیں مگر ہو جائے گا۔'' وہ عجیب پہیلیاں بجھوا رہے تھے۔ حیان خاموش رہا۔

''جانِ بابا...... بس تم میرا مان قائم رکھنا کیونکہ مجھے اور کسی سے بھی امید نہیں ہے۔ بس ایک بات کا یقین رکھنا کہ موجودہ حالات میں یہ سب سے صحیح فیصلہ معلوم ہو رہا ہے۔'' وہ پُر امید نظروں سے حیان کو دیکھ کر بولے۔ جس کے چہرے سے واضح پریشانی جھلک رہی تھی۔ مگر لب ہنوز جڑے تھے۔

☆......☆......☆

''ماما آپ جاگ رہی ہیں؟'' عثمان ناک کر کے اندر آیا۔

''ہاں آؤ بیٹا......'' ناصر صاحب نے اپنے فرمانبردار بیٹے کو پیار سے بلایا۔ عالیہ بیگم بھی اٹھ کر بیٹھیں۔

''خیریت ہے عثمان تم اتنی رات گئے۔'' وہ گھڑی کو دیکھ کر بولیں۔

''جی ماما مجھے لگا کہ یہ صحیح وقت ہے آپ سے بات کرنے کا۔'' وہ مسکرایا۔ اور بیڈ کے کونے پر ٹک گیا۔

''کیا بات ہے جوان کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔'' ناصر صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرائے۔

''پاپا...... بس بات ذرا اہم ہے ناں اس لیے۔'' وہ بھی مسکرایا۔

''بولو جان کیا بات ہے تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔'' وہ نرمی سے بولیں۔

''ماما میں آپ سے اروی کے متعلق بات کرنے آیا ہوں۔'' وہ نظریں جھکا کر باادب ہوا۔

''ہوں...... بولو میں سن رہی ہوں۔'' وہ ناصر صاحب کی طرف دیکھ کر بولیں۔ جو مکمل طور پر متوجہ معلوم ہو رہے تھے۔

''ماما...... آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' وہ ہاتھ مسلتے ہوئے بولا۔

''بیٹا تم بتاؤ کہ اب ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہیے جبکہ معلوم ہو گیا ہے کہ اس نے شادی کی تھی؟'' وہ اُلٹا اس سے سوال کر رہی تھیں۔

''لیکن ماما اس میں ایسا بھی کیا ہے کیا انسان دوسری شادی نہیں کر سکتا؟''

''بیٹا تم سمجھو...... ایک انسان کے لیے کسی دوسرے کی ٹھکرائی ہوئی چیز کو اپنانا بہت کٹھن ہوتا ہے۔تم میں اتنا حوصلہ ہے کیا کہ تم ایک ٹھکرائی ہوئی عورت کو اپنا سکو؟'' ناصر صاحب نے پہلی بار مداخلت کی۔

''پاپا؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

ساتھ میں عالیہ کی طرف دیکھا جو اپنے شوہر کی ہمنوا لگ رہی تھی۔

''بیٹا ہر انسان اپنی چیز کو خالص دیکھنا چاہتا ہے۔ خاص کر زندگی کے ساتھی کو تو وہ بالکل خالص اور اپنا دیکھنا چاہتا ہے۔ٹھکرائی ہوئی چیز کو انسان ہمدردی میں تو اپنا سکتا ہے مگر......'' وہ بات ادھوری چھوڑ گئے۔

عثمان بالکل خاموش ہو گیا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔

''پاپا مجھے اس سے ہمدردی ہے میں مانتا ہوں۔مگر اس کے ساتھ میں اسے پسند کرتا ہوں اور یہ بھی میں مانتا ہوں......اور جہاں تک ٹھکرائی ہوئی چیز کو اپنانے کی بات ہے تو ہاں میں اتنا حوصلہ رکھتا ہوں کہ اسے پوری ایمانداری سے اپنا سکوں۔ آپ اسے میری خواہش سمجھ لیں مگر میں اروی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ ٹھوس مگر دھیمے لہجے میں بولا۔

اس نے سر اٹھا کر دونوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جس میں امید کے جگنو جگ مگ کر رہے تھے۔ جیسے یقین سا ہو اپنے فیصلے پر کہ غلط نہیں ہے۔

ناصر صاحب نے عالیہ بیگم کی طرف دیکھا۔ انکی نگاہوں میں نیم رضامندی تھی۔ وہ مسکرائے۔

''مجھے فخر ہے تمہاری سوچ پر بیٹا...... ہمیں تمہارا فیصلہ منظور ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔''

''تھینک یو۔'' وہ مسکرایا۔

''ہم جلد ہی بات کرتے ہیں بابا سے۔'' عالیہ بیگم بھی مسکرائیں۔

''تھینک یو سو مچ ماما......'' وہ بڑھ کر اُن کے گلے لگ گیا۔

''جیتے رہو...... سدا خوش و آباد رہو۔'' وہ اسے پیار کر کے ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے بولیں۔ وہ کمرے سے نکلا تو بہت مطمئن تھا۔

☆......☆......☆

حیان ساری رات بڑے بابا کے فیصلے کو لے کر پریشان رہا۔

''آخر ایسا کیا ہوگا۔'' یہ سوال اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ جبکہ بڑے بابا یہ فیصلہ لینے کے بعد بہت مطمئن تھے۔

اروی ساری رات بے سدھ سی بستر پر پڑی رہی۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ آخر کو وقت کون سی کروٹ لے گا اور آگے اور کتنے امتحان باقی ہیں۔

اگلے دن کا سویرا فاروقی ولا کے لیے نہایت اہم تھا۔

''رمضو...... جاؤ سب کو کہو کہ نیچے آئیں۔'' بڑے بابا نے غیر معمولی طور پر سب کو بلایا۔

وہ آرام سے صوفے پر براجمان سب کے منتظر تھے۔ ابھی سب لوگ گھر پر ہی موجود تھے کیونکہ ابھی صرف 7 بجے تھے۔

15 منٹ کے بعد سب اُن کے سامنے تھے۔ ہر ایک کے چہرے سے واضح پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' شانزے پریشان سی اتری تھی۔

''پتہ نہیں......'' سحرش نے لاعلمی کا اظہار

کیا۔
ابھی بھی سب کی آنکھوں میں نیند کی رمق باقی تھی۔ سوائے جیان، اروی اور شہلا بیگم کے جو ساری رات آنکھوں میں کاٹ کر آئے تھے۔
''بابا خیریت ہے۔'' نذیر آگے بڑھے اور ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔
''تمہیں لگتا ہے کہ تمہاری بیوی کی کل کی حرکت کے بعد اس گھر میں خیریت ہونی چاہیے۔'' وہ بنا لحاظ کیے اُن کی طرف منہ کر کے گرجے...... تو نذیر فاروقی کو ڈھیروں شرم نے آن گھیرا۔ جبکہ شہلا فاروقی بھی چورسی بن گئیں۔
''مگر بابا جان آپ نے یوں سب کو بلایا ہے۔ خیریت تو ہے ناں؟'' عالیہ فاروقی دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئیں آ بیٹھیں۔
''ہوں...... میں نے کچھ اہم فیصلے کیے ہیں۔'' وہ سنجیدہ تھے۔
''اہم فیصلے......''
اروی کے لیے کھڑا ہونا بہت کٹھن معلوم پڑ رہا تھا وہ اپنے اردگرد سہارا تلاش کرنے لگی۔ کیونکہ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ جیان نے سب سے پہلے اس کے قدم ڈگمگاتے دیکھے تو فوراً بڑھ کر سہارا دیا۔ جیسے ہی اس نے اسے پکڑا تو احساس ہوا کہ اُس کا جسم بہت گرم تھا۔ وہ اسے سنبھالتے ہوئے بولا۔
''اسے تو بہت تیز بخار ہے۔''
''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کل جو تائی کے ہاتھوں زخم لگے تھے اس کی شدت دنیا میں لگے ہر گھاؤ سے زیادہ تھی۔ وہ زخم اس نے روح پر کھائے تھے۔ جن کے سامنے جسمانی زخم کی بھلا کیا حیثیت رہ جاتی تھی۔ اور بخار وغیرہ تو کسی کھاتے میں ہی بھلا کب تھے۔ کل سے اب تک اس کے دماغ میں صرف وہی الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔ جو تائی کے منہ سے نکلے تھے۔
اس کا ہاتھ بے اختیار سر کی طرف بڑھا اور وہ اسے مسلنے لگی۔ وہ شاید کبھی نیچے نہ آتی اگر بڑے بابا کا حکم نہ ہوتا۔
کمرے میں جامد خاموشی تھی۔ سب بڑے بابا کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر ایسا کیا اہم فیصلہ ہوگا کہ جس کے لیے انہوں نے یوں صبح ہی صبح اکٹھا کیا ہے وہ بھی سب کو...... ورنہ گھر کے فیصلے صرف بڑوں کے درمیان ہوا کرتے تھے۔ چھوٹوں کو دخل اندازی کرنے کا بالکل بھی اختیار نہیں تھا۔
''آخر کیا بات ہے؟ بڑے بابا اتنا سسپنس کیوں کریٹ کر رہے ہیں؟'' ریحان سے رہا نہ گیا تو چڑ کر بولا۔
''کیا مسئلہ ہے دس منٹ چپ نہیں رہا جاتا تم سے؟'' عثمان خشم سا اُسے آنکھیں دکھا کر بولا۔ تو وہ چپ ہو گیا۔
''سب سے پہلے تو جو رشتہ آیا تھا ارویشہ کا......'' آخر کار وہ بولے۔ تو سب اپنی پوری سماعتوں سے متوجہ ہوئے۔
وہ رکے پل بھر کو پھر سب کی طرف دیکھا ہر کوئی انہی کی طرف متوجہ تھا۔
''اُسے انکار کر دیا جائے...... ہم اس جگہ اپنی کسی بیٹی کا رشتہ نہیں کریں گے۔'' شہلا فاروقی نے سر مارا غصے سے......
''ہونہہ......''
''ٹھیک ہے بابا...... ہم کر دیں گے۔'' نذیر فاروقی باادب تھے۔
''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اروی کا جلد از جلد

نکاح کر دیا جائے تا کہ بچی اور تماشہ بننے سے بچ جائے کیونکہ جب سے یہ آئی ہے لوگوں کی نظروں میں بہت کھٹک رہی ہے۔'' وہ خصوصاً شہلا کو دیکھ کر بولے۔

''جی بابا بالکل درست بات ہے۔'' عالیہ فاروقی نے کہا۔ اور عثمان کو دیکھا وہ مسکرا دیا۔

''میں خود بھی یہ بات کرنا چاہ رہی تھی آپ سے۔'' وہ بولیں۔

''رکو بہو......'' میری بات مکمل نہیں ہوئی ابھی تک۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کرا دیا۔

ارویٰ نے اپنی قسمت کے فیصلے کرتے بڑے بابا کو دیکھا۔ بڑے بابا نے اسے دیکھا جس کی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی بالکل اجڑ اور ویران سی آنکھیں تھیں کملایا ہوا چہرہ تھا۔ جسم بھی بہت کمزور لگ رہا تھا۔ بال عجب چار سو بکھرے ہوئے تھے جیسے جینے کی امنگ نے دم توڑ دیا ہو۔

''بہت سوچا ہے میں نے کہ آخر وہ کون ہے جو اسے سنبھال سکتا ہے...... اس کا ساتھ دے سکتا ہے۔ میرے ذہن میں بہت سے نام آئے مگر میں نے جس کا انتخاب کیا ہے وہ مجھے بہترین معلوم ہوا ہے، اروی کے لیے ضروری ہے کہ اس گھر اور خاص کر یہاں کے مکینوں کی نظروں سے دور اپنی زندگی گزارے مگر میں اسے غیروں کے حوالے بھی نہیں کر سکتا...... کیونکہ یہ میرے پرویز کی امانت ہے میرے پاس......'' وہ رنجیدہ ہو گئے۔

اروی کی آنکھیں ایک بار پھر بہنے لگیں جبکہ حیان بڑے بابا کے الفاظ سے کوئی نتائج نہ نکال سکا۔

عثمان نے سوالیہ نگاہیں اپنی ماں کی طرف کیں...... اُن کی نگاہیں بھی مختلف نہیں تھیں۔

''اسی لیے میں نے آج اروِیشہ اور حیان کے نکاح کا فیصلہ کیا ہے اور نکاح آج ہی ہوگا۔'' اُن کا فیصلہ اٹل تھا۔

''بابا......'' حیان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہاں پر سب پر ایک بم پھٹا تھا۔ مگر جیسے اروِیشہ کو پرواہ ہی نہیں تھی۔ اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ نہ خوشی' نہ غم...... اس کے تو جیسے سارے احساسات دم توڑ چکے تھے۔ اسے جیسے فرق ہی نہیں پڑ رہا تھا کہ بڑے بابا اس کی زندگی کی ڈور کس کو تھما رہے ہیں۔ وہ بالکل خاموش تھی۔

''بابا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' ناصر فاروقی نے آخر کو ہمت کر کے کہا۔

انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا جس کے چہرے پر مایوسی سی بکھر رہی تھی۔

''بابا میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''ناصر میں نے رائے نہیں مانگی کسی کی بھی اپنا فیصلہ سنایا ہے۔''

''مجھے یہ بالکل ٹھیک لگتا ہے۔''

''پھر بابا ہماری بات......'' عالیہ نے بھی کہا۔

''بس بہو فیصلہ ہو چکا...... آج اروِیشہ اور حیان کا نکاح ہے اور رخصتی بھی آج ہی ہوگی...... حیان اسے اپنے ساتھ لاہور لے جائے گا۔''

''مگر بابا آپ اچھے سے جانتے ہیں کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' حیان کوشش کر لینا چاہتا تھا ایک آخری بار حالانکہ وہاں موجود بھی افراد اچھے سے جانتے تھے کہ شمشیر فاروقی اپنے فیصلے سے ایک انچ نہیں ہٹیں گے۔''

''حیان...... یہ میرا فیصلہ ہے...... اور تمہیں

مانناہی ہوگا۔'' اب لہجہ بے لچک تھا۔ حیان نے سر جھکالیا مگر اندر ایک طلاطم برپا تھا۔ وہ اٹھے اور چلتے ہوئے اروی کے پاس آئے جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''بیٹا جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔ مگر یقین مانو میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اندر چلے گئے۔

''ماما......'' عثمان نے ماں کو کہا۔

''سوری ...... بیٹا مگر تم اپنے بابا کو جانتے ہو۔'' انہوں نے اسے تسلی دی۔

حیان غصے سے بابا کے پیچھے گیا۔

''لو ہو گیا فیصلہ......'' شانزے نے سر مارا۔

''اچھا ہے بلا ٹلی......'' شہلا فاروقی اروی کے پاس سے گزرتی ہوئی طنز کے تیر ایک بار پھر برسا تی گئیں۔

سحرش سب سے پہلے اُس کے پاس آئی۔

''تم ٹھیک ہو اروی؟'' وہ پیار سے مسکرائی۔

اروی بالکل خاموش تھی۔

''بھئی حد ہے...... بڑے بابا کو پوری دنیا میں حیان فاروقی کے علاوہ کوئی انسان نہیں ملتا کیا؟......'' ریحان کو غصہ چڑھا ہوا تھا۔

''ہاں نہیں ملتا شاید......'' عالیہ نے بھی تلخی سے کہا۔ جنہیں اپنے بیٹے کے ارمان ٹوٹنے کا بہت افسوس ہوا تھا۔

''اچھا اگر حیان نہ ہوتا تو کیا تم کرتے اروی سے شادی؟'' شانزے اُلٹا اس پر چڑھ دوڑی۔ یہ سوچے بغیر کہ جس ہستی کی وہ بات کر رہے ہیں وہ انہی کے درمیان موجود ہے۔

''ہاں اگر میں اس سے تھوڑا بڑا ہوتا تو کر لیتا اور تمہیں کیا شہزاد فیضان یا پھر عثمان یہ تینوں نظر نہیں آتے۔'' وہ غصے سے بولا۔

''ایک وہی کھڑوس رہ گیا ہے کیا؟ جو بندے سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا جس کا غصہ ہر وقت ناک پہ رہتا ہے۔ جس سے بات کرنے سے پہلے انسان 10 بار سوچتا ہے کہ کرے یا نہ کرے؟ اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنا آسان بات ہے کیا......ہونہہ......''

''اچھا بس...... بہت ہو گیا تم لوگ یہ بات کرنا چھوڑ دو......'' آخر کو عثمان زور سے گرجا......

وہ غصے سے اٹھا اور صدر دروازہ عبور کر گیا۔

''ناصر میرا بیٹا!'' وہ آہستگی سے بولیں جبکہ آنکھیں نم تھیں۔

''عثمان نے پہلی بار اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا مجھ سے وہ بھی بابا نے کسی اور کی جھولی میں ڈال دی......وہ بھی زبردستی......'' وہ بولیں۔

''صبر کرو عالیہ تماشہ نہ بناؤ۔ ابھی یہ بات کسی کو پتہ نہیں ہے۔ تو چپ رہو۔'' وہ اٹھے اور انہیں بھی ساتھ لے گئے۔

''اروی چلو تمہیں کمرے میں چھوڑ آؤں۔''

سحرش اسے لے کر اوپر کی طرف بڑھی۔

''بابا آپ یہ کیسے کر سکتے ہیں میرے ساتھ آپ جانتے ہیں ناں کہ میں دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتا پھر بھی؟'' حیان شدید غصے میں تھے۔

''ہاں پھر بھی......'' جواب مختصر تھا۔

''But Baba......'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔

''میں کیسے ایک شخص کی ذمہ داری لے لوں ہاں...... آپ بتائیں...... میں زندگی میں اکیلے چلنا سیکھ رہا ہوں...... ابھی اپنے قدم مضبوط نہیں کر پایا کہ ایک اور شخص کو اپنے ساتھ چلنے پر کیسے تیار ہو جاؤں۔''

''شادی کوئی مذاق نہیں ہے...... اور میں ہی کیوں...... باقی بھی تو ہیں ناں۔'' وہ چڑ چڑا لگ رہا تھا۔

''ہاں ہیں...... لیکن جتنا اعتبار میں تم پر کرتا ہوں اتنا میں کسی اور پر نہیں کرسکتا اور انسان امانت اسی کو سونپتا ہے جس پر یقین ہو کہ وہ سنبھال پائے گا...... اور دیکھنا اروبشہ جیسی پیاری بچی تمہیں دوبارہ جینا سکھا دے گی۔'' حیان خاموش رہا۔ اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ایک اور ضرب ماری۔

''بیٹا میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ میرا مان قائم رکھنا۔ وہ مان جو مجھے تم پر ہے۔ سمجھے ناں۔'' وہ اس کے کندھوں کو تھام کر بولے۔ گویا اس کے فرار کے سارے راستے ختم ہو گئے۔

''اروی تم شانزے اور ریحان کی باتوں کو زیادہ سیریس نہ لینا وہ تو ایسے ہی کچھ بھی بولتے رہتے ہیں۔ بڑے بابا نے یقیناً بہت اچھا فیصلہ لیا ہے۔'' سحرش اُس کی ہمت بندھاتے ہوئے بولی۔

اروی نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ جیسے سنا ہی نہ ہو۔

☆......☆......☆

سائرہ دن چڑھتے ہی فوراً آ گئی۔ نیچے وہ شانزے سے ٹکرا گئی۔

''کیا ہوا ہے شانو؟'' وہ پریشان تھی۔

''ہونا کیا ہے...... بڑے بابا نے فیصلہ سنایا ہے صبح......'' وہ کندھے جھٹک کر بولی۔

''فیصلہ...... کیسا فیصلہ......'' اس کا چہرہ سوالیہ تھا۔

''انہوں نے آج اروی اور حیان کے نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔''

''چھن......'' سائرہ کے اندر کچھ ٹوٹا۔

''حیان مان گئے......'' آواز خستہ تھی۔

''ہوں مان گئے ہیں وہ۔'' شانزے نے اس کے اڑتے رنگ کو دیکھ کر کہا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے...... تمہارا رنگ کیوں اڑ گیا؟''

''ک...... ک کچھ نہیں اروی اوپر ہے۔'' وہ فوراً سنبھلی۔

''ہاں بیچاری اوپر ہے جاؤ۔'' وہ اشارہ کر کے بولی۔

''بیچاری کے تو نصیب ہی پھوٹ گئے ہیں۔'' شانزے کو پوری ہمدردی تھی۔

سائرہ کمرے میں آئی کمرے میں دن چڑھے ہونے کے باوجود رات کو سما تھا۔ بھاری پردے کھڑکیوں پر گرائے ہوئے تھے۔ تمام بتیاں بند تھیں۔ عجب سوگ کا سماں تھا۔

''اروی جان......'' سائرہ نے پکارا اور لائٹس جلائیں۔

سائرہ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں۔

''رہنے دیں اندھیرا باجی روشنی اب آنکھیں جلاتی ہے میری۔''

سائرہ اروی کو دیکھ کر دکھی ہو گئی۔ وہ سوگوار سی لگ رہی تھی۔ جیسے اپنی قسمت پر ماتم کر بیٹھی ہوں۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ کیسی ہو...... بس یہ کہوں گی کہ یقین مانو حیان بہت بہترین جیون ساتھی ہوگا۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھیں گے...... مجھے یقین ہے۔ بس تم اپنے دل سے تمام وہم اور خدشے نکال دو۔'' وہ اس کا چہرہ تھام کر بولی۔

''سچ کہوں باجی تو مجھے فرق نہیں پڑتا کہ کون ہے جس کے ہاتھ میری زندگی کی دوڑ ہے۔ میرا

دل تو کب کا مردہ ہو چکا ہے۔ جسم کا کیا ہے آج نہیں تو کل ساتھ چھوڑ ہی دے گا۔ مجھے اب خوشی غمی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ زندگی اب بوجھ سی لگنے لگی ہے۔ اتنی تکلیفیں اتنے دکھ اتنی کڑوی باتیں سن لی ہیں کہ اب بس...... مرنے کو جی چاہتا ہے۔ یقین مانیں باجی میں کب کی یہ زندگی ختم کر چکی ہوتی اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو......'' وہ بالکل مایوس ہو چکی تھی بے کار زندگی سے......

''اروی پلیز...... یار تم اتنی دل دہلانے والی باتیں تو نہ کرو ناں......'' سائرہ اس کے الفاظ سے واقعی دہل گئی تھی۔

''انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا...... تم دیکھنا......'' وہ مسکرائی۔ جواباً وہ بھی طنزیہ مسکرائی۔

''دیکھا جائے گا۔''

☆......☆......☆

''فیضی تم میرے ساتھ چلو ابھی......'' سنبل نے اسے اندر آتے دیکھا تو بولیں۔

''کہاں امی ابھی تو میں باہر سے آیا ہوں۔'' وہ تھکا سا صوفے پر ڈھے گیا۔

''پتہ ہے مجھے......'' وہ بوکھلائیں ہوئی تھیں مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔

''تمہارے ابو اور بڑا بھائی نہیں ہیں تم چلو میرے ساتھ نانا کے ہاں۔''

''کیوں کیا ہوا ہے؟'' وہ سیدھا ہوا امی کا پریشان چہرہ دیکھا تو فکرمندی سے بولا۔

''خیریت......''

''پتہ نہیں......'' جواب عجیب تھا۔

''کیوں؟'' وہ سیدھا ہوا۔

''وہ سحرش کا فون آیا تھا شام کو حیان اور اروشیہ کا نکاح ہے۔''

''واٹ......'' وہ اچھل ہی پڑا تقریباً اسے اس خبر سے بہت بری طرح دھچکا لگا تھا۔

''ہاں...... جلدی کرو اب تم......'' وہ کہہ کر اٹھ گئیں جبکہ پیچھے وہ حیران و پریشان سا بیٹھا تھا۔

سہ پہر میں پھوپو اور گھر کے سبھی افراد جمع تھے۔ عیشاء بھی آئی تھی ثمرین پھوپو کے ساتھ جبکہ سنبل پھوپو نے گھر پر فون کر کے باقی کے افراد کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ چھوٹی سی گیدرنگ ہوگئی تھی گھر میں۔ فیضی نے سحرش کو تنہا پایا تو جالیا۔

''باجی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا۔'' وہ پریشان بھی تھا اور اُداس بھی تھا۔ وہ بھی تو اروی کا خواہاں تھا۔ اسی لیے یوں اچانک اس کے نکاح اور رخصتی سے اسے بھی ٹھیک سے دھچکا لگا تھا۔

''میں تمہاری فیلنگ سمجھ سکتی ہوں فیضی مگر یقین مانو جو ہو رہا ہے بالکل ٹھیک ہو رہا ہے۔'' وہ ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔

''کیا ٹھیک ہو رہا ہے؟ ابھی تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں میری فیلنگز کا احساس ہے اوپر سے تم مجھے تسلی دے رہی ہو کہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ چڑ گیا۔

''تمہیں نہیں پتہ تھا کہ میں اروی کے لیے واقعی سیریس تھا۔'' وہ اس سے ناراض ہوا۔

''آواز دھیمی رکھو تم...... سمجھے۔'' وہ غصے سے اردگرد نگاہ دوڑا کر بولی کہ کہیں کوئی سن نہ لے۔

''ابھی میرے پاس تمہیں سمجھانے کا وقت نہیں ہے سمجھے......'' وہ پیار سے بولی۔

''مگر پلیز میری ریکویسٹ ہے کہ تم اس اچھی لڑکی کے لیے کوئی اور مصیبت مت کھڑی کر دینا...... آگے ہی اس پر کم مصیبتیں نہیں ٹوٹی ہیں۔'' وہ کہہ کر چلی گئی۔

سائرہ نے زبردستی اس کے کپڑے چینج

کرائے اور ہلکا سا میک اپ بھی کر دیا حالانکہ نہ تو اس کی طبیعت ٹھیک تھی نہ ہی اس کا ذرا برابر بھی دل کر رہا تھا۔

شام کو مولوی صاحب آئے اور حیان اور اروشہ کا نکاح سادگی سے کر دیا گیا...... اروشہ ...... اروشہ پرویز فاروقی سے اروشہ حیان فاروقی بن گئی۔

سائرہ نے ہی اس کی پیکنگ کی۔ چند جوڑے رکھے ساتھ میں کچھ اور ضروریات کا سامان بھی ہمراہ کر دیا۔ جس میں عیشاء اور شانزے نے مدد کی۔

حیان نے اپنا بیگ گاڑی میں رکھوایا۔

''چلتا ہوں بڑے بابا۔'' وہ ان سے ملنے آیا۔

''بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تم خفا ہو مجھ سے مگر یقین مانو بہت جلد تمہیں میرے فیصلے کا ادارک ہو گا کہ کس قدر درست ہے یہ فیصلہ۔'' انہوں نے اپنے روٹھے ہوئے بیٹے کو گلے لگایا۔

''اس کا بہت خیال رکھنا وہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔'' انہوں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہوں......'' اس نے اتنا ہی کہا اور نظریں چرا کر چلا گیا جس سے وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

''اچھا بیٹا خدا کی امان ہیں۔'' پھوپوؤں چاچی اور سب کزنز سے وہ بار بار ملی سوائے تائی اماں کے جو اپنے کمرے میں موجود تھیں۔

حیان گاڑی میں بیٹھا اس کا منتظر تھا۔

''اپنا بہت خیال رکھنا اروی جان......'' سائرہ نے اسے ڈھیروں پیار کیا اور گاڑی تک چھوڑنے آئی۔

اس نے مڑ کر سب گھر والوں پر نگاہ دوڑائی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''ایک ان چاہا بوجھ...... حیان فاروقی۔'' اور لمبا سانس کھینچا۔

حیان نے ساتھ بیٹھی اروی پر ایک اچٹتی سی نگاہ دوڑائی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆......☆......☆

شاید دوائیوں کا اثر تھا کہ وہ تمام راستے سوتے ہوئے آئی تھی۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ نکلا تو وہ اب بھی سو رہی تھی۔

''اُف......'' حیان نے اس پر نگاہ دوڑائی۔ ایک تھکن، دوسرا غصہ اس ٹائم عروج پر تھا۔

''اروشہ......'' اس نے پکارا۔

مگر وہ گہری نیند تھی اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ حیان اسے پکار رہا ہے۔ اس نے تین چار بار دھیمی آواز میں پکارا۔

''کیا مصیبت ہے یار......'' اس نے اپنی طرف کا دروازہ زور سے بند کیا جس سے اروشہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

ابھی وہ اپنے حواس میں واپس نہ آئی تھی اور حیرانی سے اردگرد کا جائزہ لے کر دکھ رہی تھی کہ وہ ہے کہاں۔

شام کب رات میں ڈھلی اسے معلوم ہی نہیں ہوا تھا۔

حیان پر نظر پڑتے ہی اس کے منہ سے اچانک نکلا۔

''اوہ...... مسٹر فاروقی ...... ہم...... آ گئے ہیں؟'' شام میں ہونے والا واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ ذہن میں روز روشن کی طرح واضح ہوا۔

''ہوں......'' باوجود غصے کے وہ خود کو کنٹرول کر کے بولا۔

''آؤ اندر......'' وہ کہہ کر اندر کی طرف بڑھا۔
وہ چپ کر کے نکلی اور اردگرد سے بے نیاز اس کے پیچھے چلنے لگی۔ حالانکہ اسے چلنے میں دشواری تھی۔
''شانی...... شانی......'' اس نے کسی کو زور سے آواز دی۔
کچھ ہی دیر میں ایک لڑکا اندر سے بدحواس سا برآمد ہوا۔
صاحب کے ساتھ یوں ایک لڑکی کو دیکھ کر تھوڑا حیران اور پریشان ہوا مگر کچھ پوچھنے کی اس کی جرأت نہیں تھی۔
''سامان گاڑی سے نکال دو......اور کمرے میں رکھوا دو۔''
''میرے لیے کافی بنا کر لاؤ......تم کچھ کھاؤ گی؟'' وہ اروشیہ کی طرف پلٹا۔
''کافی......'' جواب مختصر تھا۔
''ان کے لیے بھی کافی۔'' اس نے اشارہ کیا اروی کی طرف......
''جی صاحب......'' وہ فرمانبرداری سے جواب دیتا تیزی سے حرکت میں آیا۔
''آؤ......'' وہ تیزی سے آگے بڑھا۔
لابی سے ہوتا ہوا وہ اپنے روم میں گیا۔
''آج تم یہی سوجانا...... او کے...... کل تمہارے لیے روم سیٹ کروا دیں گے۔'' وہ اپنی طرف سے کوشش کر رہا تھا کہ تلخ نہ ہو۔ مگر شاید مزاج کی یہ تلخی اس کی عادت بن کر اس کی شخصیت میں رچ بس گئی تھی۔
''جی......'' اس نے سر جھکایا۔
''ہوں...... میں چینج کر لوں۔'' وہ کہہ کر الماری کی طرف بڑھا جبکہ وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔
کمرہ کافی کشادہ تھا۔ بلو اور بلیک کلر کمرے پر کافی حاوی لگتے تھے۔ جس سے گھٹن کا احساس بڑھ رہا تھا۔
اس نے اپنے عکس کو سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں دیکھا...... کتنی اداسی اور پژمردگی تھی اس کے چہرے پر...... تھکن بھی بہت نمایاں تھی۔
''کیا ہوگیا ہے میرے ساتھ؟'' اندر سے عجیب سا سوال اٹھا...... اس نے کمرے پر پھر نظر دوڑائی۔
''میں...... میں مسٹر فاروقی کے بیڈروم میں بیٹھی ہوں۔ اروشیہ حیان فاروقی بن کر...... کل تک میں کتنی آزاد تھی کتنی پُرسکون تھی۔ مگر آج حالات کہاں سے کہاں لے آئے ہیں۔''
''یہ کیا ہوگیا ہے میرے اللہ......'' اس نے سر تھام لیا...... اور آگے بھی نہ جانے اور کیا کیا ہوگا......'' دل میں عجیب سے خدشوں نے جنم لے لیا تھا اس کے...... وہ واپس آیا تو وہ سر تھامے بیٹھی تھی۔
''ہوں...... قصور تو بیچاری کا ہی نہیں ہے...... قصور تو میرا بھی نہیں ہے...... پھر قصور کس کا ہے۔ حالات کا؟ وقت کا؟ بڑے بابا کے فیصلے کا؟ یا تائی کی زبان اور مزاج کا؟'' پھر سے سوالات اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ دروازے پر ناک ہوئی تو دونوں متوجہ ہوئے۔
''آجاؤ......'' حیان نے تولیے سے بال رگڑے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر بال بنانے لگا۔
''صاحب کافی......'' لڑکا ٹرے لیے آیا اور ٹیبل پر رکھ کر پلٹ گیا۔
اروشیہ نے نکھرے نکھرے حیان کو دیکھا

ٹراؤزر اور شرٹ میں وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی وہ الگ لگ رہا تھا۔
''کافی......'' حیان نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔
''تھینکس......'' کہہ کر اس نے تھام لیا۔
اسے اس کی شدید طلب ہو رہی تھی کیونکہ اس کا سر پھٹ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر سامنے بڑے جدید طرز کی کرسی پر بیٹھ گیا اور کافی پینے لگا۔
''طبیعت ٹھیک ہے اب؟'' بھاپ اڑتے کپ کو وہ ٹیبل پر رکھ کر اروی کی طرف متوجہ ہوا۔
''جی......'' وہ کپ کو گھورتے ہوئے بولی جس میں سے بھاپ اڑ رہی تھی۔
''ہوں...... اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ شانی ہے بچہ......'' اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔
''اسے کہہ دینا او کے......''
''ہوں......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
کپ سے اڑتی بھاپ کے پار وہ حیان کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں جھکائے گہری سوچ میں تھا شاید آنے والے حالات کے لیے حکمت عملی ترتیب دے رہا ہو۔
چہرے پر ہلکا ہلکا غصہ واضح جھلک رہا تھا آنکھوں میں سوچ تھی...... وہ ان سب میں بھی بہت ہینڈسم لگتا تھا۔
''جو بھی ہو حیان فاروقی جیسا بندہ قسمت والوں کو ہی ملتا ہے شانزے چاہے تم اسے جو بھی کہو مگر مجھے وہ بہت پسند ہے۔'' فائقہ کے کہے گئے الفاظ اچانک اس کے دماغ میں گونجے...... جنہیں سوچ کر اس کے لب مسکرا دیے۔
''تو کیا میں اسے اپنی خوش بختی کہوں کہ حیان فاروقی نام کا ہیرا میری جھولی میں گرا ہے...... یا امتحان کہوں کہ اینگری مین سے اب میرا رشتہ ہم سفر کا ہو گیا ہے......'' یہ سوچ کر اس کے ہونٹوں کا تبسم ایک دم غائب ہو گیا۔
اس کے اس بدلتے تاثرات کو وہ بغور دیکھ رہا تھا۔
''اب سونا چاہیے رات کے بارہ بج رہے ہیں مجھے صبح آفس بھی جانا ہے۔'' وہ کہتا ہوا اٹھا اور بیڈ کی دوسری طرف جا کر چادر منہ تک تان کر سو گیا۔ مگر نیند شاید اروشہ سے روٹھ گئی تھی۔ اس نے ایک لیمپ کی بجائے ساری لائٹس آف کر دیں اور خود جا کر اس کرسی پر بیٹھ گئی جہاں سے وہ اٹھا تھا۔
سوچنے کے لیے شاید اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ اسی لیے وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ریلیکس ہو گئی۔

☆......☆......☆

آج صبح ٹیبل پر بہت خاموشی تھی۔ کل یہاں ایک طوفان اٹھا تھا اور اپنے ساتھ اروی کی زندگی بھی بہا لے گیا تھا۔
''ریحان جلدی کرو مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔'' شانزے نے ریحان سے کہا جو چائے پی رہا تھا۔
''ہوں...... چلو چلتے ہیں۔'' وہ اٹھا اور باہر جا کر گاڑی نکالنے لگا۔
''اچھا ابو اللہ حافظ۔'' شانزے نے شہلا کو سلام نہیں کیا یہ واضح ناراضگی کا اظہار تھا۔
شہلا نے نظریں اٹھا کر شانزے کو دیکھا مگر وہ آنکھیں چراتی ہوئی نکل گئی۔
''عثمان یار تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی...... تم بے شک آج نہ آؤ اور تم ابھی تیار بھی نہیں ہو۔'' شہریار نے عثمان سے کہا جو سامنے پلیٹ کو گھور رہا تھا' جبکہ کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔

(جاری ہے)

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر
جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے قسط نمبر 12

بی بی جان کو ہوش آیا تو اصم اپنی وہیل چیئر پر بالکل اُن کے قریب بیٹھا تھا۔ پہلے تو انہیں سمجھ ہی نہیں آئی کہ اصم اُن کے قریب کیوں ہے۔ اُسی بے خیالی میں انہوں نے اصم سے استفسار کیا۔

''اصم...... تم...... یہا......ں؟''

''بی بی جان آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ ٹھیک ہیں ناں...... آپ......'' اصم اپنے احساسات میں اُن کا ہاتھ تھام کر بے اختیار پوچھتا چلا گیا۔

''مجھے...... کیا ہوا...... میں تو......!'' بی بی جان کو بولتے بولتے یکدم یاد آ گیا کہ انعم کے کمرے سے نکلتے ہوئے انہیں سب کچھ گھومتا محسوس ہوا تھا اور پھر اروی کی پکار کے بعد اُس کا تھام لینا تک یاد تھا۔ پھر کیا ہوا انہیں خبر نہیں تھی۔

نگاہ دیوار گیر گھڑی پر جا ٹھہری تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے گویا کئی گھنٹوں سے وہ ہوش وخرد سے بیگانہ تھیں۔ ذہن کے ساتھ جسم میں بھی تناؤ سا پیدا ہوا۔ انعم کی باتیں اُس کا رویہ اُس کی ہٹ دھرمی انہیں پھر سے بے کل کر گئی۔

''بی بی جان آپ کو کچھ نہیں ہوا ہے...... آپ ٹھیک ہو جائیں گی...... میں بابا جان کو بلاتا ہوں۔'' اصم بچوں کی طرح گرمجوش ہوا۔ بی بی جان نے اُس کی محبت وفکر دیکھ کر خود کو سنبھالا۔

''بیٹا تم لوگوں کے ہوتے مجھے واقعی کچھ نہیں ہوگا۔ تم کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو۔'' انہوں نے ساتھ ہی حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دوسرے ہاتھ کو اُس کے ہاتھ پر رکھ کر تھپتھپایا......

اُسی لمحے پہلے اروی...... پھر بابا جان اور پھر سبھی ایک ایک کر کے کمرے میں چلے آئے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اظہار تشکر کر رہے تھے۔ اروی نے نوٹ کیا تھا کہ بی بی جان انعم کی کسی بات پر توجہ نہیں دے رہی ہیں۔

''اصم بیٹا! اب تم کھانا کھالو..... تمہاری وجہ سے اروی بھی اب تک بھوکی ہے..... تمہیں اپنی میڈیسن بھی لینی ہوگی۔'' بابا جان نے اچانک ہی اصم کو مخاطب کیا تو وہ کچھ توقف سے بولا۔

''مجھے بھوک تو نہیں لیکن..... آپ کہتے ہیں تو تھوڑا سا کھالیتا ہوں۔''

''ہاں بیٹا جاؤ..... اب تم آرام بھی کرو..... نجانے کب سے یہاں بیٹھے ہو۔'' بی بی جان نے اُس کا ہاتھ پھر سے تھپتھپایا۔

''ہم تو دونوں کو ہی کہہ چکے ہیں بی بی جان مگر یہ یہاں سے ہٹنے کو تیار ہی نہیں تھے۔'' ثمن نے تائیداً بات بڑھائی۔ تو انعم جھٹ بولی۔ اُس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

''ثمن بھابی پریشان تو ہم بھی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں دکھاوا کرنا نہیں آتا۔'' اُس کے انداز پر سبھی نے پہلے اُسے اور پھر بی بی جان کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر واضح ناگواری تھی۔

''دکھا..... وا.....؟'' اصم نے بے ساختہ پوچھا۔

''ٹھیک کہتی ہو تم، تمہیں صرف مجھے پریشان کرنا آتا ہے اور کچھ نہیں آتا۔'' وہ لیٹی سے اٹھ بیٹھی تھیں۔ اُن کی بات پر سبھی حیران سے تھے۔ انعم کے لیے ایسا لہجہ..... ایسی بات..... اصم مسلسل حیرت میں تھا۔ انعم کے رویے پر۔

''بی بی جان میں نے آپ کو ایسا کیا پریشان کردیا.....'' انعم کو بھی اُن کا رویہ برا لگا تھا۔

''تم سب لوگ چلے جاؤ میں ابھی سونا چاہتی ہوں۔'' بی بی جان جواب دیے بغیر دوبارہ لیٹ گئیں تو ثمن نے اپنا فرض نبھانے کی کوشش کی۔

''بی بی جان آپ پہلے کچھ جوس وغیرہ لے لیں..... پھر آرام کر لیجیے گا۔''

''فی الحال نہیں، جب ضرورت ہوگی کہہ دوں گی۔'' ثمن کے لیے لہجے میں ذرا تبدیلی تھی۔ یہ بات سبھی نے نوٹ کی۔

بابا جان نے سبھی کو جانے کا اشارہ کیا۔ سبھی باری باری اُن کے کمرے سے نکل گئے۔ لاؤنج میں آتے ہی ضیغم نے بے ساختہ انعم کو سرزنش کی۔

''انعم..... کیا ضرورت تھی تمہیں بی بی جان سے اس طرح بات کرنے کی، تمہیں معلوم ہے نا اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہاں..... اُن کی طبیعت کی خرابی کی ذمہ دار بھی مجھے ہی ٹھہرا دیں۔ میں تو اُن کی دشمن ہوں۔'' وہ بڑے بھائی کو بھی غصہ و تیور دکھا کر وہاں سے چلی گئی۔

''میں..... نے اُس کو کیا کہا؟'' ضیغم کو بھی انعم کے ردِعمل کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔

''چھوڑیں اُس کا موڈ ایسا ہی ہے آج کل.....'' ثمن نے بات ختم کرنا چاہی۔ اُس کا موڈ ایسا کیوں ہے کہ وہ سبھی کو ہرٹ کر رہی ہے۔'' شارم کو بھی اُس کا رویہ محسوس ہوا تھا۔

''وجہ تو سبھی جانتے ہیں..... شا..... رم اُس کی اپنی ساس اور شوہر سے 'اَن بن' چل رہی ہے..... ہم تو خیر اُسے کچھ کہہ نہیں سکتے..... بی بی جان اُسے سمجھاتی ہیں تو اُس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔'' سبرینہ نے بڑی سادگی سے جتاتے ہوئے دھماکہ کیا تھا۔ اصم اور اروی تو انعم کے حوالے سے ہر معاملے سے بے خبر ہی

تھے۔ ثمن نے سبرینہ کو بے بسی سے دیکھا۔ جیسے اُس سے ایسی نادانی کی توقع نہ ہو۔

''فا...... ئق سے...... اُس کا کوئی جھگڑا چل رہا ہے؟ مجھے کسی نے بتایا کیوں نہیں......'' اصم کی پریشانی دیدنی تھی۔ کچھ دیر پہلے انعم کے رویے سے پیدا ہونے والی کبیدگی یکدم فکر میں بدل گئی تھی۔

''اصم...... ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم پریشان نہیں ہو...... آؤ کھانا کھالو...... ضیغم آپ بھی آجائیں۔''

ثمن نے اپنے طور پر بات ختم کر کے اروی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی ذہن میں ابھرتے سوالات کو دبا کر اصم کی وہیل چیئر لے کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

''ایسی کیا پریشانی ہے زبدہ...... تم مُجھے تو بتا سکتی ہو۔'' شریح خان نے بچوں کے کمرے سے جانے کے بعد کافی دیر تک اُن کے بولنے کا انتظار کیا تھا۔ بالآخر پوچھ ہی لیا۔ وہ بالکل خاموش جو تھیں۔

''ایسی کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے......'' انہوں نے اُسی سنجیدگی سے جواب دیا تو شریح خان بہ اصرار بولے۔

''بات تو ضرور کوئی ہے...... ورنہ تمہاری برداشت اتنی کم نہیں ہے زبدہ کہ خود کو سنبھال نہ سکو۔''

''کبھی کبھی معمول کی باتیں بھی برداشت آزمانے لگتی ہیں۔ میں بھی انسان ہی ہوں۔'' زبدہ شریح آخر بول ہی پڑیں۔ اندرونِ ذات وہ بڑی تکلیف سے گزر رہی تھیں۔ اُن کی اپنی بیٹی اُن کی ہی تربیت کو جھٹلاتی اُن کے مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ کس طرح خود کو ہارتا ہوا دیکھیں۔

''آخر مسئلہ کیا ہے زبدہ...... کہیں اروی تو تمہاری برداشت نہیں آزمانے لگی۔'' شریح خان نے ڈرتے ڈرتے دل میں اٹھتا سوال لفظوں میں ڈھال ہی دیا۔ اروی اُن کا انتخاب تھا۔

''ایسا آپ نے کیوں سوچا...... وہ بچی تو......'' زبدہ یکدم چونک اٹھیں۔ شوہر کی آنکھوں میں عجیب سا خوف تھا۔ انہوں نے توقف سے اپنی بات مکمل کی۔

''بے زبان سی ہے وہ بچی...... اُس نے تو شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔''

''پھر...... کون؟ مجھے لگا شاید وہ مختلف ماحول سے آئی ہے تو یہاں کے اصول و قاعدے سمجھ نہیں پا رہی ہو گی۔ تبھی تم ٹینس ہو جاتی ہو گی۔''

''بخدا مجھے اُس سے کوئی مسئلہ نہیں ہے...... میں تو ا...... نعم کی وجہ سے......'' شوہر کی فکر دور کرتے کرتے وہ اپنی وجہ فکر بتاتے ہوئے یکدم ہچکچا گئیں۔

''انعم...... اُس نے کیا کیا؟'' شریح خان پہلے سے بھی زیادہ بے کل ہو کر پوچھنے لگے وہ سنجیدگی سے بولیں۔

''وہ...... جو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''کیا؟ کیا مطلب؟'' شریح خان کے چہرے پر اُلجھن نظر آنے لگی۔ بی بی جان نے نظریں چرا کر جواب دیا۔

''وہ...... اپنی سسرال واپس نہیں جانا چاہتی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو زبدہ..... کیا میں نے جو سنا.....؟'' شریح خان کو اپنی سماعت پر شبہ سا ہوا۔
''وہ الگ گھر کا مطالبہ کر رہی ہے خان صاحب......'' وہ ٹھنڈی گہری سانس بھر کر بڑی تکلیف سے بولیں۔
''خود سوچیں...... فائق اُس کا مطالبہ کیسے مانے گا...... وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے...... میرا تو سوچ سوچ کر ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے کہ کہیں اُس کی بے جا ضد بات نہ بڑھا دے۔'' شریح خان کو ہنوز بے یقینی تھی۔ بات بڑھنے کا تو یقینی امکان تھا۔ اُن کی پریشانی چہرے پر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ جو چیز وہ اپنے لیے نہیں سوچ سکتے تھے دوسرے کو اس پر قائل کرنا بہت مشکل تھا۔
''ت......م نے پوچھا......''
''کئی بار پوچھا ہے۔ اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے یہ...... ساس اُسے اُس کی ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے تو برا لگتا ہے اُسے۔'' زبدہ کی اندرونی جھنجلاہٹ لہجے میں بھی اتر آئی۔
''ہوسکتا ہے صالحہ بھابی کا رویہ روایتی ساسوں والا ہو...... اسی لیے اُسے برا لگتا ہو'' شریح خان کو بیٹی کی محبت نے جراح پر اُکسایا۔
''اسے تو میرا سمجھانا بھی برا لگتا ہے خان صاحب...... اُسے سب کچھ اپنی مرضی کا چاہیے۔ جو کہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پہلے خود کو اس قابل بنانا پڑتا ہے۔ پھر اپنی مرضی چلائی جا سکتی ہے۔'' وہ مزید چڑ کر بولیں۔
''اچھا...... ابھی تم اس مسئلے کو چھوڑ دو...... تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے...... تم فکر نہیں کرو...... میں انعم کو سمجھاؤں گا...... مجھے امید ہے وہ میری بات سمجھ جائے گی۔ بس تم ٹینشن مت لو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''آ......ہ...... اللہ کرے کہ وہ سب سمجھ جائے۔'' اُن کے رویے سے مایوسی صاف عیاں تھی۔ وہ مجبوراً قائل ہوئی تھیں ورنہ انعم سے انہیں انجانا سا خوف تھا...... اُن کے چہرے پر تفکر کم نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

سبرینہ اور ثمن کچن سمیٹ رہی تھیں۔ جب سبرینہ کی مما زیب النساء کا فون آگیا۔ انہوں نے بی بی جان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔
''تمہاری ساس کی طبیعت کیا واقعی زیادہ خراب ہے؟'' زیب النساء نے رسمی گفتگو کے بعد دبے دبے لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ سبرینہ بتا چکی تھی کہ وہ کچن میں کھڑی ہے۔
''جی...... جی بس اچانک ہی بی بی جان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے۔ بی پی شوٹ کر گیا تھا اُن کا...... شکر ہے کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔'' سبرینہ کچن اسٹول پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بے فکری سے بولی تو دھلی پلیٹوں کو صاف کرتے ہوئے ثمن نے ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ سبرینہ کا اطمینان اُسے عجیب سا لگا۔
''ایسا کیا ہوا کہ بی پی شوٹ کر گیا...... خیریت ہے نا...... کہیں انعم......'' زیب النساء نے حسب عادت کُریدا۔

''مما...... ابھی تو بی بی جان آرام کر رہی ہیں ...... آپ کل آ جایئے گا اُن کی عیادت کے لیے۔''
سبرینہ نے ثمن کی وجہ سے بات پلٹ کر جواب دیا۔ زیب بھی سمجھ گئیں کہ کوئی قریب ہے۔
''چلو ٹھیک ہے پھر...... کل لگاتی ہوں چکر...... دراصل میں نے فون بھی اسی لیے کیا تھا کہ ابھی شہری کا موڈ نہیں ہے۔'' زیب النساء نے پہلی بات آخر میں کی۔ سبرینہ نے شہری کے موڈ کی وجہ جاننے کی بے چینی رکھتے ہوئے بھی بے دلی سے 'اللہ حافظ' کہہ کر رابطہ منقطع کیا۔
اُس کے فون سننے تک ثمن بھی اپنے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر بولی۔
''سبرینہ میں بی بی جان کے پاس جا رہی ہوں۔ تم باہر آؤ گی تو کچن کا ڈور اچھی طرح بند کر دینا پلیز۔''
''ٹھیک ہے۔'' لہجہ معمول کا تھا مگر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔
''پہلے ہی کچن سے چلی جاتی تو میں شہری کے موڈ کی وجہ تو جان لیتی...... اب کمرے میں جا کر کال کروں گی تو شارم ہوں گے اور یہاں ٹھہری تو مزید کوئی فرمائش گلے پڑ جائے گی۔'' وہ باورچی خانے کے دروازے سے نکلتے ہوئے دل میں بڑبڑائی۔
''خیر کل معلوم کر لوں گی کہ اب اُس کے موڈ کو کیا ہوا؟'' اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے جیسے خود کو اطمینان دلایا۔
اصم اپنے کمرے میں آ کر بھی انعم کے حوالے سے پریشان سا تھا۔ اُس کے ذہن میں یہ بات اٹک گئی تھی کہ گھر والے اُس سے کچھ چھپا رہے ہیں۔
''کیا تمہیں معلوم تھا کہ انعم کسی پرابلم میں یہاں آئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ فائق اور انعم کے درمیان؟'' اصم نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اچانک اروٰی سے پوچھا تو وہ یکدم چونک کر متوجہ ہوئی وہ بھی اُسی احساس میں تھی۔
''مجھے...... مجھے تو کچھ معلوم نہیں ہے اصم...... اور انعم کیا؟ گھر کے کسی فرد کے حوالے سے کبھی کسی نے میرے سامنے کچھ ڈسکس نہیں کیا۔'' اروٰی کے لہجے میں شکایت سی بھی تھی۔ جیسے احساس دلانا چاہتی ہو کہ اُسے گھر کا فرد نہیں سمجھا جاتا۔ وہ بھی اکثر یہی محسوس کرتی تھی۔
''ہمارے کسی فیملی ممبر کا ایسا کیا ایشو ہے جو تم سے ڈسکس کیا جاتا؟'' اصم نے ذرا تلخ ہو کر پوچھا۔ وہ آج کل ایسا ہی ہو رہا تھا۔
''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا...... میں تو......'' وہ کہہ کر جیسے شرمندہ ہوئی آواز نم ہو گئی تھی۔
''ایسا مطلب نہیں تھا تو تم نے کہا کیوں؟ یہاں ایسا کوئی میٹر نہیں ہے جو تم سے کیا؟ کسی سے بھی چھپایا جائے۔'' اصم کا موڈ بگڑا ہوا ہی تھا۔
''سوری...... آئندہ میں خیال رکھوں گی کہ میری کسی بات سے آپ ہرٹ نہ ہوں۔'' وہ اپنے آنسو چھپاتی اُس کے سامنے سے اُٹھ کر پانی لینے کے لیے روم فریج کی طرف بڑھ گئی۔ پانی کی بوتل اور گلاس لے کر وہ بیڈ کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی تا کہ اصم سے روبرو نہ ہو سکے۔
''بات صرف میرے ہرٹ ہونے کی نہیں ہے۔ میرے گھر والوں سے بدگمان ہونے کی تکلیف ہے

مجھے۔''
اصم جتائے بغیر نہ رہا۔ مجھے اندازہ ہے کہ انعم کی اپنے ہزبینڈ سے کوئی ناراضگی ہے بھی تو یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ چند دنوں میں وہ مان جائیں گے۔ اسی لیے بی بی جان یا کسی نے ہمیں بتانا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔''

''یقیناً ایسی ہی بات ہوگی۔'' اروی نے بھی مصلحتاً ہاں میں ہاں ملائی۔ اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اصم اپنے گھر والوں کے معاملے میں کس قدر حساس ہے۔ اُس کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

☆......☆......☆

بیت الجنت میں صبح کا آغاز معمول کے مطابق ہوا تھا۔ صرف بی بی جان ہی آج اپنے کمرے سے نکل کر نہیں آئی تھیں۔ اروی فجر کی نماز ادا کرتے ہی اصم کو سوتا چھوڑ کر نیچے چلی آئی تھی۔ اُسے اپنا فرض یاد تھا اور گھر کے افراد کے معمولات بھی...... بابا جان اور بی بی جان کے لیے چائے بنا کر وہ اُن کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر جواب کے انتظار میں کھڑی تھی۔ تبھی بابا جان بیرونی دروازے سے اندر آتے ہوئے اُس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

''ارے...... بیٹا یہاں کیوں کھڑی ہو...... اندر چلی جاؤ۔ وہ جاگ رہی ہیں۔ تسبیح پڑھ رہی ہوں گی۔ اسی لیے جواب نہیں دیا ہوگا۔'' کہنے کے ساتھ ہی شریح خان نے درواز کے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول بھی دیا۔ بی بی جان اپنی مخصوص جگہ پر واقعی تسبیح ہاتھ میں لیے دعا مانگتی نظر آئیں۔

آہٹ پر انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیر کر توجہ دی۔

''السلام علیکم!'' اروی نے قدرے شرمندہ ہو کر سلام کیا کیونکہ اپنی بوکھلاہٹ میں وہ بابا جان کو سلام کرنا بھول گئی تھی۔

''وعلیکم السلام...... جیتی رہو' خوش رہو۔'' بی بی جان نے سر کے اشارے سے جبکہ بابا جان نے گرمجوشی سے جواب دیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے دھیمی مسکراہٹ کا تشکر دکھاتی بی بی جان سے پوچھنے لگی۔

''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے بی بی جان؟''

''اللہ کا شکر ہے بیٹا...... اب پہلے سے بہتر ہوں...... تم سناؤ اصم کیسا ہے...... وہ کل میری وجہ سے کافی ڈسٹرب لگ رہا تھا۔'' بی بی جان کے لہجے میں محبت کے ساتھ نقاہت بھی نمایاں تھی۔

''جی...... کافی رات تک بے چین رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے دوا کھا کر سوئے ہیں۔'' اروی نے چائے بنا کر دونوں کو باری باری کپ تھمائے۔

''تو تم بھی ابھی آرام کرتیں...... نیچے ہیں نا سبھی کام کرنے کے لیے۔'' بی بی جان نے سنتے ہی پھر محبت سے کہا۔ تو بابا جان بھی تائیداً بولے۔

''تمہاری بی بی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں...... تم بھی تو اُس کے ساتھ جاگی ہوگی۔ تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔''

''بابا جان صبح اٹھنا میرا بچپن کا معمول ہے۔ میں نماز کے بعد سو نہیں پاتی...... رہی میرے آرام کی

بات تو مجھے آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر زیادہ آرام محسوس ہوتا ہے۔'' وہ بہت سادگی سے بولتی اُن کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ بی بی جان اور بابا جان نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی اُس سے متاثر سے نظر آرہے تھے۔ بی بی جان کو احساس ہوا کہ انعم اور نیلم کے معاملے میں کہیں نہ کہیں کوتاہی ہوگئی ہے اُن سے...... لڑکپن تک اپنے ساتھ اپنی نگرانی میں سونے اٹھنے کا معمول مرتب کرنے کے بعد انہوں نے بیٹیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا تھا کہ بڑھتی عمر کے ساتھ اپنی سمجھداری اور تابعداری میں اُسی معمول پر چلیں گی۔ گھریلو ذمہ داریوں میں انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ بیٹیوں کے معمولات غیر محسوس انداز میں بدلتے چلے گئے۔ اپنے کمروں میں کھانا پینا...... صبح صبح بھی اٹھنا کبھی نہ اٹھنا...... بہوؤں کے آکر کچن سنبھالتے ہی وہ جیسے فراموش کر چکی تھیں کہ کچھ ذمہ داریاں بیٹیوں پر بھی عائد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ انہیں شدت سے اپنی کوتاہی کا احساس ہورہا تھا۔ وہ اپنے احساسات میں گم تھیں جبکہ شریح خان اور اروی باتوں میں مصروف تھے۔ شریح خان نے کسی بات کی تائید مانگی تو وہ چونکیں۔

''آ...... ں...... ہا...... ں کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

''بھئی میں کہہ رہا تھا کہ زہرا بھابی اور زہیر آرہے ہیں تو انہیں دو چار دن یہاں رُکنا پڑے گا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔'' شریح خان نے بات دہرا کر پھر تائید مانگی۔

''اچھا...... کب آرہے ہیں وہ......''

''ایک دو روز میں شاید...... میں بابا جان کو وہی بتا رہی تھی کہ بھائی کے سی ایس ایس کے ایگزام ہونے والے ہیں۔ امی اور وہ رُک نہیں سکتے۔ بس ملنے آرہے ہیں وہ۔'' اروی نے وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''چلو آتے ہیں تو بتانا...... ڈرائیور انہیں پک کرے گا۔'' بی بی جان نے معمول کے لہجے میں بات ختم کی تھی۔ وہ اپنی الجھنوں میں تھیں۔ وہ سر ہلا کر اٹھ گئی۔

''اروی بیٹا...... جاتے ہوئے نیلم کو جگاتی جانا...... اُسے کہنا کہ کالج جانے سے پہلے مجھ سے مل کر جائے۔''

''جی بی بی جان......'' وہ سعادت مندی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

''شکر ہے زبدہ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں تینوں بہوئیں ہی بیٹیوں جیسی دی ہیں۔ اللہ انہیں شاد و آباد رکھے۔'' شریح خان نے بے ساختہ اظہار کیا تو بی بی جان نے بھی دل سے 'آمین' کہا۔

☆......☆......☆

دستک دیتے ہاتھ دستک دینے سے پہلے ہی رک گئے تھے۔ اندر سے آتی آواز نے اروی کو ٹھٹک کر کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

''نیلم...... اس وقت...... کس سے بات کر رہی ہے؟'' اُس کے اندر سوال اٹھا تھا۔ اندر سے آواز آرہی تھی۔ نیلم کی آواز...... شوخ' چنچل' مترنم آواز......

''یا اللہ...... نیلم کو کیا ہوگیا ہے؟ یہ کس راہ پر جارہی ہے۔'' اروی کے دل نے بے اختیار دہائی دی۔ اُسے کچھ اچھا محسوس نہیں ہورہا تھا۔ اُسے نیلم جیسی سلجھی ہوئی لڑکی سے ایسی توقع جو نہیں تھی۔

''نہیں آج آپ شرفِ دیدار نہیں پا سکیں گے جناب...... میں کالج نہیں آرہی؟'' نیلم کی آواز میں کھنک سی تھی۔ وہ نجانے کب سے بیدار تھی۔

''کیوں؟ کیونکہ میری بی بی جان بیمار ہیں۔ اور وہ ٹھیک نہ ہوں تو مجھے کچھ بھی ٹھیک نہیں لگتا۔'' کسی کے سوال کا جواب اُس نے کچھ اُداسی' کچھ بچپنے والے انداز میں دیا تھا اروی کو یکدم گھبراہٹ سی ہوئی۔ وہ زور سے دستک دے کر دروازہ کھولتی اندر چلی گئی۔ نیلم اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ بوکھلا کر اُس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل فوراً بند کر کے تکیے پر پھینک دیا۔ اروی اُس کی حرکت دیکھ چکی تھی۔

''آ......پ؟ اروی بھابی...... کو......ئی...... کا......م تھا......؟'' اُس کا لہجہ صاف چغلی کھا رہا تھا۔ اُس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

''ہا......ں بی بی جان نے کہا تھا کہ تمہیں جگا دوں لیکن......'' اروی نے ذرا توقف کیا۔ نیلم کے چہرہ مزید زرد ہو گیا۔

''لیکن تم تو پہلے سے ہی جاگ رہی ہو۔ کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں شاید۔'' اروی نے غیر محسوس انداز میں اُسے جتایا۔

''ہا......ں...... نہ......یں تو بھابی۔'' وہ صاف مکر گئی۔

''میں تو ابھی جا......گی ہوں...... جب آپ نے ڈور بجایا ہے تو......'' وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی۔

''اچھا...... پھر میرے کانوں نے غلط سنا ہوگا...... مجھے لگا تم اپنی کسی دوست سے بات کر رہی ہو...... شاید تمہارا آج کالج جانے کا موڈ نہیں ہے...... بی بی جان نے تمہارے لیے پیغام دیا تھا کہ کالج جانے سے پہلے اُن سے مل کر جانا۔'' اروی نے اپنے انداز میں اُسے احساس دلانے کی کوشش تو کی تھی۔ نیلم چور بنی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُسے خاموش دیکھ کر اروی مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

ثمن بچوں کے لیے لنچ باکس پیک کر رہی تھی۔ جب سبرینہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔ اُس کے لہجے سے غصہ عیاں تھا۔

''توبہ ہے کس قدر چالاک اور گُھنی ہے یہ عورت۔''

''کس کی بات کر رہی ہو؟ شمو کو بخار ہے میں نے ہی اُسے آرام کے لیے واپس بھیجا ہے۔'' ثمن نے ٹفن پیک کر کے ایک طرف کاؤنٹر پر رکھے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شمو کے لیے یہ سب کہہ رہی تھی۔

''اُس کی بات کون کر رہا ہے وہ تو ہے ہی کام چور...... یہاں اور بھی چھپے رستم گھس آئے ہیں۔ جو اندر ہی اندر اپنا ہنر دکھا رہے ہیں۔'' سبرینہ نے یکدم محتاط لب و لہجہ استعمال کیا۔

''مطلب......؟'' ثمن نے ناسمجھی سے پوچھا۔

وہ ناشتہ بنانے کے لیے انڈے' ڈبل روٹی فریج سے نکال رہی تھی۔

''ہمیں اتنے سال ہو گئے شادی ہو کر آئے ہوئے۔ کبھی یہ ڈرامے نہیں کیے...... جو پہلے اٹھ کر کچن میں آ گیا۔ بی بی جان بابا جان کو چائے بنا کر دے آیا...... مگر یہ محترمہ بھی کیا کہنے...... ہمیں برا ثابت

کرنے کے چکروں میں ہیں۔''

''اروی...... کی بات کر رہی ہو...... اُس نے کیا کیا؟''

ثمن سبرینہ کے رویے پر کچھ حیران تو تھی۔ مزید پریشانی سے پوچھنے لگی۔

''اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے منہ اندھیرے ہی بی بی جان' بابا جان کو چائے پلا چکی ہے۔ میں لے کر گئی تو کہنے لگے۔ اُن کی چھوٹی بہو یہ سعادت حاصل کر چکی ہے۔ انہیں مزید طلب نہیں ہے۔'' سبرینہ نے ایک ایک لفظ چبا کر اپنی بھڑاس نکالی۔

''تو اس میں برا ماننے والی کیا بات ہے سبرینہ...... اچھا ہے وہ بھی گھر کی ذمہ داریاں بانٹ رہی ہے۔ تم کیوں محسوس کر رہی ہو۔'' ثمن کو ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسی لیے معمول کے لہجے میں بولی۔

''کیا فرق پڑتا ہے اگر......''

''فرق تو پڑتا ہے ثمن بھابی...... بی بی جان سمجھیں گی ہم تو پڑے سوتے رہتے ہیں' ایک وہی اپنی نیندیں قربان کرتی ہے اور......'' سبرینہ مزید تیزی سے بولی۔

''بی بی جان کی سبھی کے معمولات پر نظر ہے۔ تم فکر نہیں کرو بی بی جان کو 'متاثر' کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' ثمن نے اُس کی تسلی کے لیے اپنے لہجے میں ذرا سی شوخی بھری' سبرینہ کہاں مطمئن ہوتی...... ناشتے تک اُس کا موڈ اسی بات پر خراب رہا...... اُس کا مسئلہ تھا کہ اپنے سے آگے وہ کسی کو بڑھتا دیکھ نہیں سکتی تھی۔

☆......☆......☆

بی بی جان ناشتے کے لیے آج ڈائننگ روم میں نہیں آئی تھیں۔ ثمن نے اُن کا ناشتہ اُن کے کمرے میں بھجوا دیا تھا۔ نیلم کالج نہیں گئی تھی۔ وہ بھی بی بی جان کے کمرے میں تھی۔ بابا جان کی خاص ہدایت تھی کہ انہیں کسی بات اور معاملے کے لیے پریشان نہ کیا جائے۔ سو اسی لیے سارا نظام اپنے معمول سے چل رہا تھا۔ انعم اپنی فطرت کے مطابق دوپہر تک کمرے سے ہی نہیں نکلی تھی۔

نیلم بھی بظاہر بی بی جان کے پاس بیٹھی تھی لیکن ذہنی طور پر وہ بھی حاضر نہیں تھی۔ اُس کے اندر دو طرح کی کشمکش چھڑی ہوئی تھی۔ ایک تو یہ کہ اروی نے اُس کی باتیں سن لی ہیں۔ اُسے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں وہ بی بی جان یا اصم سے اُس کی شکایت نہ لگا دے۔

اگر اُس نے ایسا کر دیا تو پھر گھر والوں کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اس کا اُسے اندازہ تھا...... دوسری طرف دل اُسے بہکا رہا تھا کہ اُسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں...... اُس نے کچھ غلط نہیں کیا۔

''تم آج کالج کیوں نہیں گئیں نیلم؟'' بی بی جان اپنی دوا کے زیر اثر نیم غنودگی سے بیدار ہوئی تھیں۔ پاس نیلم کو نیم دراز پایا تو پوچھنے لگیں۔

''آپ کے لیے بی بی جان...... آپ کل بیمار ہوگئیں تو میں ڈر گئی تھی بی بی جان...... میں نے اللہ سے بہت دعائیں کیں کہ آپ کو کچھ نہیں ہو۔'' وہ ایکدم لاڈ سے کندھے پر سر رکھے بولنے لگی۔

''میں جانتی ہوں میرے بچے مجھے بہت چاہتے ہیں۔ تم لوگوں کی محبت ہی میری ہمت ہے میری

جان۔'' بی بی جان مسکرا کر شفقت سے بولتی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔ نیلم کو بھی اپنا سر اُٹھا کر دور ہونا پڑا۔
''بی بی جان آپ کو کیا ٹینشن ہے...... اچانک آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ ہمارے گھر میں تو کوئی پرابلم نہیں ہے پھر آپ؟'' وہ بچوں کی طرح بولتے ہوئے انہیں بے حد معصوم لگی۔
''کچھ مسائل بظاہر نظر نہیں آرہے ہوتے بیٹا...... لیکن وہ ہماری زندگیوں کو متاثر کر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں بچے محسوس نہیں کرتے لیکن والدین...... والدین کی نگاہیں اندر تک جھانک لیتی ہیں۔'' بی بی جان کے انداز و لہجے پر نیلم یکدم ٹھٹک کر دیکھنے لگی۔ ذہن میں یکدم جھماکا ہوا۔
''کہیں...... اروی بھابی نے تو...... لیکن...... بی بی جان تو کل سے بیمار ہیں...... مگر......''
''نیلم...... بیٹیاں والدین کی تربیت پر حرف بن جائیں تو بڑی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ اور جگ ہنسائی سے ماں باپ جیتے جی مر جاتے ہیں۔'' بی بی جان بیٹی کے سامنے اپنے اندر بسے دُکھ کو باہر لے آئی تھیں۔ انہیں بیٹی سے زیادہ اپنا غمگسار کوئی نہیں لگا تھا۔ نیلم بی بی جان کی باتیں سن کر کانپ سی گئی۔
بی بی جان نے کبھی اُس سے ایسی باتیں جو نہیں کی تھیں۔
''بی...... بی جان...... آ...... پ کیسی باتیں کر رہی ہیں...... ایسا کیا ہوا کہ......'' اُس کا لہجہ ڈرا جھجکا ہوا تھا۔ چہرے پر گھبراہٹ کے مارے پسینہ بھی نمودار ہو گیا تھا۔
''انعم کو احساس ہی نہیں ہے اپنی ذمہ داریوں کا اور نہ ہی ہماری تربیت کا...... وہ ساس سسر سے الگ ہونا چاہتی ہے۔'' بی بی جان اُسے بتا رہی تھیں یا اپنا دکھ سنا رہی تھیں۔
''ا...... چھا......'' نیلم کی جیسے جان میں جان آئی۔ جیسا وہ سوچ رہی تھی ایسا کچھ نہیں تھا۔
''ہاں...... اُس نے اپنے دل کی بات بتا دی ہے...... لیکن اُس کا یہ مطالبہ بہت غلط ہے بیٹا...... میں بھی ماں ہوں میں اپنے بچوں کو خود سے الگ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی پھر فائق کے سامنے بیٹی کی ناجائز خواہش کی حمایت کیسے کر سکتی ہوں۔'' بی بی جان کی وجہ پریشانی نیلم کو اب سمجھ آئی۔
''تو آپ انعم آپی کو سمجھائیں کہ وہ غلط خواہش کر رہی ہیں۔''
''وہ کہاں سمجھتی ہے...... آج یہ اپنے مطالبے منوائے گی کل کو میری بہوؤں کو بھی الگ رہنے کی جرأت مل جائے گی۔ مائیں اس لیے بیٹے پیدا نہیں کرتیں کہ کل کو بہوئیں آکر انہیں ماؤں سے دور کر دیں۔'' بی بی جان کی آواز نم ہو گئی تھی۔ اُسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور اروی اندر چلی آئی۔ اُس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا۔
''بی بی جان ثمن بھابی نے آپ کے لیے جوس بھیجا ہے۔'' اُس نے اپنے آنے کی وضاحت دی۔ نیلم اس کے چہرے کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اُسے شک سا ہوا کہ اروی چھپ کر باتیں سنتی ہے۔ مگر اس وقت اُس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں تھا جو یقین دلاتا۔
''بیٹا...... تمنا کہاں ہے کچھ کھانے پینے کی...... خیر لے آئی ہو تو رکھ دو...... ابھی پی لوں گی۔ اصم اٹھ گیا ہے؟'' بی بی جان نے بے دلی ظاہر کر کے استفسار کیا۔
''جی...... اٹھ گئے ہیں...... میں انہی کے لیے ناشتہ لینے آئی تھی۔'' اروی گلاس ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر واپس مڑ گئی۔

''ٹھیک ہے جاؤ...... اُسے بتا دینا میں ٹھیک ہوں...... ورنہ پریشان ہو کر پھر نیچے آ جائے گا......'' بی بی جان نے پیچھے سے ہدایت دی۔ وہ 'جی اچھا' کہہ چلی گئی۔ نیلم نے بھی اپنا ذہن اُس کی طرف سے جھٹک دیا۔ فی الحال اُسے بی بی جان کی دلجوئی کرنا تھی۔

☆......☆......☆

اصم نے محسوس کیا تھا کہ اروی گزشتہ روز سے کچھ چپ چپ ہے ناشتہ کروا کر گیلے تولیے سے اُس کا چہرا اور ہاتھ صاف کروا کر وہ گیلا تولیہ دھونے کے لیے کمرے سے باہر رکھ کر پلٹی تو اصم جو مسلسل اُسے ہی چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔ یکدم پوچھنے لگا۔

''تم ناراض ہو مجھ سے؟'' وہ یکدم چونک کر متوجہ ہوئی۔

''نہیں تو...... آپ کو کیوں لگا؟'' معمول کے لہجے میں بولتی وہ اپنے لیے پانی کا گلاس بھر کر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں نے محسوس کیا ہے...... تم بہت چپ چپ ہو۔'' اصم نے اپنی بات پر زور دیا۔

''میں اتنا بولتی ہوں؟ جو آپ کو میری ذرا سی خاموشی محسوس ہو رہی ہے۔'' اروی نے چہرے پر مسکراہٹ اور لہجے میں شوخی بھری۔

''ذرا سی خاموشی......؟ تم صبح سے بالکل خاموش ہو...... کسی روبوٹ کی طرح بس کام کیے جا رہی ہو۔'' اصم نے شکوہ کیا۔

''ایسا بھی نہیں ہے...... میں نے ابھی آپ کے ساتھ ناشتہ کیا...... بی بی جان کی طبیعت کا بتایا کہ وہ اب ٹھیک ہیں الحمدللہ...... شمو کے بخار کا بھی بتایا۔ اور کتنا بولوں۔'' اروی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اپنی باتیں تو نہیں کیں ناں؟'' اصم نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تو وہ پانی کا آخری گھونٹ بھر کر اٹھی اور اُس کے پاس پہلو میں آ بیٹھی۔

''اپنی باتیں......؟ کیا مطلب؟'' وہ بلاوجہ اُس کے کُرتے کا کالر درست کرنے لگی۔

''اتنی انجان مت بنو...... تم روز مجھ سے پوچھتی ہو کہ آج کس کلر کے کپڑے پہنوں...... بال کھول دوں یا باندھ لوں...... آج تم لان سے پھول بھی نہیں لے کر آئیں۔'' اصم نے بہت شدت سے سب باتیں محسوس کی تھیں۔ اروی کو حیرت ہوئی۔

''میں ابھی...... پوچھنے ہی والی تھی۔ آپ ابھی تو اٹھے ہیں...... اور پھول اس لیے نہیں لا سکی کہ صبح ہی بی بی جان' بابا جان کے پاس بیٹھی رہی اس لیے لان میں جا نہیں سکی۔ آپ تو ہر بات کو محسوس کرنے لگتے ہیں اصم......'' وہ قدرے چڑ گئی۔

''اس لیے کہ میری فیلنگز زندہ ہیں۔ تمہیں رات میری باتیں بری لگی تھیں۔ میں جانتا ہوں...... مگر یار...... کیا کروں میں اپنے رشتوں کے لیے بہت حساس ہوں شاید اسی لیے میں تم سے 'اوور ری ایکٹ' کر گیا۔''

''اصم رات کی بات رات ہی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے آپ کی فیلنگز کا احساس ہے۔ میرے دل میں کوئی بات ہی نہیں تھی۔ آپ ایسے ہی محسوس کر رہے ہیں۔''

''رئیلی......'' اصم نے بے یقینی سے پوچھا۔ تو وہ سر ہلا کر بولی۔
''اصم ہمارا رشتہ ایک دوسرے پر اعتماد بھروسے کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ میں آپ کے اعتماد کو توڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی...... آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔''
''ایسی بات...... نہیں ہے...... میں تو......'' وہ شرمندہ ہوا تو اروی نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔
''اصم آپ اور آپ سے وابستہ ہر رشتہ میرے لیے قابل تعظیم ہے۔ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا...... یہ سب باتیں اب چھوڑیں...... مجھے بتائیں آج میں کس کلر کا سوٹ پہنوں۔'' اروی نے موضوع بدل دیا تو اصم کو بھی اپنا موڈ بدلنا پڑا۔

☆......☆......☆

بی بی جان کی طبیعت اپنی سوچوں کے باعث مزید مضمحل ہوگئی تھی۔ انعم دوپہر کے بعد اُن کے پاس آئی بھی تھی تو اُسے اپنے رویے اور باتوں کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ الٹا وہ اُن کی طبیعت کی خرابی کا ذمہ دار برملا اروی کو ہی ٹھہرانے پر تلی ہوئی تھی۔ بی بی جان آخر زچ ہو کر بول اٹھی تھیں۔
''بس کردو انعم...... مجھے تو تم پریشان کر ہی چکی ہو اب اپنی ان باتوں سے اپنے بھائی کی زندگی کو متاثر مت کرو۔''
''بی بی جان...... میں نے کیا غلط کہا ہے...... جب سے وہ عورت ہمارے گھر میں آئی ہے۔ ہمارے گھر میں کیا کچھ نہیں ہوگیا۔ وہ منحوس نہیں ہے تو پھر بڑی قسمت والی ہے؟ اسی لیے اصم بھائی کا یہ حال ہے۔ میرے اور فائق کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا ہوا تھا؟ اصم بھائی کی شادی کے بعد سے ہی اچانک فائق کا موڈ میرے ساتھ خراب ہوگیا۔ وہ مجھ پر پابندیاں لگانے لگا۔'' وہ اپنی بات اور موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔
''اپنی غلطیوں کو دوسرے کی ذات سے منسوب مت کرو انعم...... ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ...... اپنی نادانی پر بہت پچھتاؤ گی تم۔'' بی بی جان نے مزید بے بسی سے سمجھانے کی کوشش کی۔
''میں نے کیا غلطیاں کی ہیں بی بی جان؟'' انعم بے یقین سے بولتی جیسے تڑپ اٹھی۔
''آپ شاید دنیا کی واحد ماں ہیں بی بی جان...... جن کی نظر میں اپنی اولاد غلط اور دوسرے صحیح ہیں۔''
''چپ ہو جاؤ انعم...... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ...... تم مجھے اپنی دشمن سمجھتی ہو تو جاؤ، تمہارے جی میں جو آتا ہے کرو...... لیکن یاد رکھو...... میں تمہارے کسی عمل کی حمایت نہیں کروں گی...... میں تمہارے بابا...... جان......'' بولتے بولتے بی بی جان کی سانس اُلجھنے لگی اور وہ کھانستے کھانستے دوہری ہوگئیں۔ انعم بھی یکدم گھبرا گئی۔
بی بی جان کو ثمن دوائی کھلانے اندر داخل ہوئی تھی وہ تیزی سے لپک کر انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ کبھی اُن کی پیٹھ سہلاتی، کبھی سینہ......
''انعم...... تم کھڑی کیا سوچ رہی ہو...... پانی لادو...... ڈاکٹر کو کال کرو...... ایمبولینس کو بلالو......'' ثمن پریشانی سے جھنجلا اٹھی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اس انداز و لہجے میں بات کی تھی۔ انعم کو بھی جیسے ہوش آیا تھا وہ فوراً کمرے سے باہر بھاگی۔ وہ حواس باختہ تھی۔ ورنہ فون تو بی بی جان کے کمرے میں بھی تھا۔ ڈاکٹر نے انہیں ہاسپٹل بلوالیا تھا۔ شارم، ضیغم، باباجان ہاسپٹل میں تھے۔ ثمن بی بی جان کے پاس ہی تھی۔

''بی بی جان کو مائنر سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔فوری طبی امداد سے اُن کی بچت ہوگئی تھی۔لیکن ڈاکٹر نے ائندہ کے لیے محتاط رہنے کے لیے کہا تھا۔

''بابا جان بے حد پریشان تھے......بہت تکلیف سے وہ ثمن سے پوچھ رہے تھے۔

'ایسا کیا ہوا تھا کہ اُن کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔'' آئی سی یو کے باہر کھڑی ثمن اُن کی سنجیدگی پر سٹپٹا گئی۔

''جب میں نے منع کیا تھا کہ اُن کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو تو پھر؟'' وہ قدرے غصے سے استفسار کررہے تھے۔

''بابا جان......ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا......ہم نے تو آج بی بی جان کو ڈسٹرب ہی نہیں کیا......پہلے نیلم اُن کے ساتھ رہی اور پھر انعم وہی تھی جب اُن کی طبیعت خراب ہوئی۔ میں تو انہیں میڈیسن دینے گئی تھی۔'' ثمن نے اپنے طور پر صفائی دی۔

''کیا......انعم تھی اُن کے پاس......تبھی۔'' بابا جان کے چہرے پر تناؤ سا آکر ڈھیلا پڑ گیا۔ثمن نے انہیں اُلجھن سے دیکھا۔اُن کا چہرہ کسی فکر کسی سوچ کی غمازی کررہا تھا۔انعم کے لیے یہ اندازِ مبہم......بالکل نئی بات تھی۔ثمن حیران سی انہیں پلٹ کر جاتا دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

زیب النساء اور شہرینہ بیت الجنت جب پہنچیں تو سبرینہ اور نیلم لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔انعم اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔اروی اور اصم کو بی بی جان کے ہاسپٹلائز ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔اروی اس وقت اصم کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔وہ بے حد بے چین تھا۔

''کیا بات ہے گھر میں بہت خاموشی ہے۔خیر تو ہے۔'' زیب النساء نے آتے ہی سوال کیا۔

''بی بی جان کی طبیعت پھر خراب ہوگئی تھی۔انہیں ہاسپٹل لے کر گئے ہیں سبھی......ہم اسی لیے پریشان بیٹھے ہیں۔اللہ خیر رکھے۔'' سبرینہ سنجیدگی سے بولی۔

''آمین......زبدہ بھابی کی تو صحت قابلِ رشک تھی۔یوں اچانک انہیں کیا ہوگیا کہ ہاسپٹل جانے کی نوبت آگئی۔'' زیب النساء کی فکر و ہمدردی مصنوعی سی محسوس ہورہی تھی۔نیلم دلبرداشتہ سی بیٹھی تھی۔

''آنٹی......بی بی جان نے تو کبھی معمولی سے سر درد کی بھی شکایت نہیں کی تھی۔اب اچانک انہیں ہارٹ پرابلم ہوگئی ہیں......پتہ نہیں وہ ہم سے چھپاتی تھیں۔'' وہ اپنا دکھ اپنی کیفیت اپنی سوچ چھپا نہیں سکی۔

''ہوسکتا ہے زبدہ آنٹی تم لوگوں کو پریشان نہ کرنا چاہتی ہوں......ورنہ کوئی ٹینشن وغیرہ ضرور ہوگی انہیں......تبھی اس وقت اُن کی یہ کنڈیشن ہے۔'' شہرینہ نے بھی لب کشائی کرتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

''صحیح کہہ رہی ہو شہری......انعم گھر آکر بیٹھی ہوئی ہے۔انہیں پریشانی تو ہوگی۔آخر ماں ہیں۔بے شک وہ کسی کو اپنی پریشانی نہیں بتاتیں۔'' سبرینہ نے بھی تائید کی۔انعم کا معاملہ اتنا بڑھ چکا تھا۔نیلم کو حیرت بھی ہوئی اور کچھ شرمندگی بھی......

''لیکن......بیٹی والوں کے لیے واقعی یہ معاملہ پریشان کن ہی ہوتا ہے۔دوسری بیٹیوں کے لیے رشتے آنے مشکل ہوجاتے ہیں۔'' زیب النساء نے پہلے سبرینہ اور پھر نیلم کی طرف دیکھ کر بات مکمل کی۔بی بی

جان کی آج ہی کی باتیں اُس کے ذہن میں گونج سی گئیں۔

''کیا؟ انعم کی وجہ سے ہی...... بی بی جان کی یہ کنڈیشن ہے۔'' اُس کے اندر سوال اٹھ رہا تھا۔ زیب النساء اپنی کہے جا رہی تھیں۔ نیلم کا وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ وہ اب اتنی بھی ناسمجھ نہیں تھی کہ اُن کی باتوں کا مطلب نہ سمجھ پاتی۔

وہ خود کو منظر سے نکالنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سبرینہ بھابی...... میں چائے کے لیے شادو سے کہہ دیتی ہوں۔ آپ نے تو آنٹی کو پانی بھی نہیں پوچھا۔'' وہ وہاں سے جانے کا جواز دے کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''سوری مما...... شہری...... پریشانی میں واقعی بھول گئی تھی۔ میں پہلے آپ دونوں کے لیے فریش جوس بنواتی ہوں...... پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' سبرینہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

''اب رہنے دو...... نیلم چائے بنوانے گئی تو ہے۔'' زیب النساء نے بے دلی سے مروت دکھائی۔

''نہیں بس پانچ منٹ لگیں گے...... آپ دونوں ایسا کریں، میرے روم میں جا کر بیٹھیں۔ یہاں کسی نے ہماری کوئی بات سن لی تو غضب ہو جائے گا۔'' سبرینہ سرگوشیانہ ہدایت دے کر جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

سبرینہ کچن میں آئی تو نیلم شادو کے ساتھ مل کر چائے کی تیاری کر رہی تھی۔ نیلم ٹرالی میں بیکری کی چیزیں رکھ رہی تھی۔

''او...... نیلم...... مما اور شہری تو بیکری کی چیزیں بہت کم کھاتے ہیں۔ ویل تھینکس...... میں مینج کر لیتی ہوں...... تمہیں اپنا کوئی کام کرنا ہے تو کر لو۔''

''نہیں...... ایسا کوئی خاص کام تو نہیں ہے۔'' سبرینہ کے آنے پر نیلم ٹرالی کے پاس سے ہٹ کر فریج میں جھانکنے لگی۔

''ٹھیک ہے آپ خود دیکھ لیں...... جو آنٹی اور شہرینہ آپی کو پسند ہے۔'' نیلم کو پہلی بار سبرینہ کا رویہ محسوس ہوا۔ وہ نیلم کی ٹرالی سیٹنگ بھی بدل رہی تھی اور اشیاء بھی......

''شادو...... فریج سے ذرا سیب نکال کر دھو دو مما کے لیے فریش جوس بنانا ہے۔'' وہ مصروف انداز میں ہدایت دیتی کچن کاؤنٹر پر جوسر پروسیسر سیٹ کرنے لگی۔

''نیلم تم ہمارے ساتھ چائے پیو گی؟'' بہت سرسری سا استفسار تھا۔

''نہیں رینا بھابی...... میں اصم بھائی کے پاس جا رہی ہوں...... وہ بی بی جان کی وجہ سے کافی ڈسٹرب ہیں۔''

''چلو...... تمہاری مرضی۔'' کوئی اور وقت ہوتا تو سبرینہ ضرور کوئی گوہر افشانی کرتی۔ اس وقت تو وہ یہی چاہتی تھی کہ کوئی بھی اُس کی ماں بہن کے ساتھ اُس کی معیت میں مخل نہ ہو...... نیلم کچھ سوچتی ہوئی کچن سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

سبرینہ کے کمرے میں آتے ہی زیب النساء نے حسب عادت گھوم پھر کر کمرے کا جائزہ لیا کہ آیا

سبرینہ نے کمرے میں کیا تبدیلی کی ہے۔ کیا بدلا ہے۔ کیا چیز نئی لی ہے۔ جبکہ شہرینہ کا موڈ کچھ خراب سا تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر ماں سے پوچھ رہی تھی۔

''مما...... یہ سبرینہ اس طرح کیوں بی ہیو کر رہی تھی؟'' کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھتے دیکھتے زیب النساء یکدم چونک کر مڑیں۔ پھر بیڈ پر آ بیٹھیں۔

''کہ...... یسے......؟'' اُن کے چہرے پر نا سمجھی صاف لکھی تھی۔

''جیسے کہ ہم وہاں بیٹھ کر اُس کے سسرال والوں کی چغلیاں کرنے والے تھے۔'' وہ وضاحت دینے لگی۔

''ہاں...... تو ہو ہی جاتی ہے کوئی نہ کوئی بات...... احتیاط اچھی چیز ہے...... بھرے پُرے سسرال میں رہنا ہو تو ہر معاملے پر سوچنا پڑتا ہے۔ تم ابھی نہیں سمجھو گی۔ شادی ہو گی تو پتہ چلے گا۔'' زیب نے تسلی بخش جواب دیا۔ شہرینہ کا منہ بن گیا۔

''اسی لیے تو میں بھرے پُرے سسرال کے خلاف ہوں۔ یہ کیا؟ ہر وقت بندہ خود کو نظر بندی میں محسوس کرتا رہے۔''

''صحیح کہہ رہی ہو...... اسی لیے فائق کے لیے کوششیں کر رہے ہیں ہم...... وہاں کون ہے ایک صالحہ...... اُسے تو عادت ہی نہیں ہے کسی کے معاملے میں دخل دینے کی۔'' زیب نے تائید کرتے کرتے بیٹی کی برین واشنگ بھی کی۔

''اب ایسا بھی نہیں ہو سکتا...... سنا ہے انعم اُن کی دخل اندازیوں سے ہی عاجز ہو کر نکلی ہے۔'' اُس نے ماں کی بات رد کی۔

''انعم کی تو چھوڑ ہی دو...... اُس جیسا کوئی بے وقوف نہیں ہو سکتا...... شوہر مٹھی میں ہو تو ساس کیا کسی کی بھی بات کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اچھا چھوڑو...... تم دیکھو سبرینہ کہاں رہ گئی...... ہمیں ابھی ہاسپٹل بھی جانا ہے۔''

''اب ہاسپٹل بھی جائیں گے؟'' شہری کی کوفت و بیزاری چہرے اور لہجے دونوں سے عیاں تھی۔

''ہاں تو...... جس کام کے لیے آئے ہیں...... عیادت کیے بغیر کیسے چلے جائیں۔'' زیب نے بیٹی کی بیزاری کے باوجود اپنا پروگرام سنایا۔ وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

پہلے اروی اور پھر نیلم اصم کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بی بی جان کے پاس اسپتال جانے پر بضد تھا۔

''میں بی بی جان کو جب تک دیکھوں گا نہیں مجھے سکون نہیں آئے گا۔ آخر تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہو۔'' اصم زچ ہو کر چیخ اٹھا۔ تو اروی سہم سی گئی۔ نیلم بھی یکدم چپ ہو گئی۔ آخر اروی کو ہی ہمت کرنا پڑی۔

''اصم ہم سمجھ رہے ہیں آپ کی بات...... لیکن آپ...... میرا مطلب ہے آپ کس کے ساتھ ہاسپٹل جائیں گے۔''

''کیوں...... گھر میں کوئی گاڑی نہیں ہے۔'' وہ اُسی طرز میں بول رہا تھا۔

''نہیں...... کوئی گاری نہیں ہے نا...... اسی لیے بھابی کہہ رہی ہیں اصم بھائی...... سبھی تو ہاسپٹل بی بی

جان کے پاس ہیں۔'' نیلم نے بھی مزید قائل کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں...... سبھی بی بی جان کے پاس ہیں۔ سبھی کو اُن کی فکر ہے۔ میں ہی ایک ناکارہ انسان یہاں پڑا ہوں جو...... اپنی ماں کی تکلیف کے وقت میں اُس کے پاس نہیں ہے۔'' وہ غم و غصے میں پھر سے چیخا...... اُس کی بے بسی اُسے چیخنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اگر وہ صحت مند ہوتا تو شاید اس طرح مجبور نہ ہوتا۔

''اصم...... آپ اس طرح کیوں سوچ رہے ہیں...... اچھا آپ آرام سے بیٹھیں...... مہ...... میں بابا...... جا...... ن کو کال کرتی ہوں۔ وہ حنیف چچا کو بھیج دیں گے...... آپ ٹینس مت ہوں۔'' اروی نے اُس کے پاس سے اپنا موبائل اٹھایا۔

''ہا...... ں فون کرو بابا جان کو...... میری بات کراؤ'' وہ بے صبرے پن سے بولا۔ نیلم نے بھائی کو قدرے افسوس سے دیکھا۔ اروی کے حوصلے کو بھی دل میں داد دی۔ وہ کسی بچے کی طرح مسلسل اُسے بہلانے اور سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

بابا جان ہاسپٹل سے نکل کر گھر ہی آ رہے تھے۔ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ بی بی جان کی طبیعت کی خرابی کے وقت انعم اُن کے پاس تھی۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ دونوں کے درمیان ایسی کیا باتیں ہوئی تھیں کہ وہ اس قدر پریشان ہو کر حوصلہ و ہمت ہار بیٹھیں۔ گزشتہ روز وہ انعم کے حوالے سے اپنی پریشانی انہیں بتا چکی تھی۔ وہ اب انعم کو تنبیہ کرنا چاہتے تھے کہ آئندہ وہ اپنی بی بی جان کو اپنے کسی مطالبے سے پریشان نہ کرے۔ وہ ابھی ان ہی سوچوں میں غلطاں تھے کہ انعم کو کس طرح سمجھائیں گے۔ فون کی بجتی گھنٹی نے انہیں اپنی سوچوں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اروی کی کال آ رہی تھی۔ انہیں پریشانی سی ہوئی۔ انہوں نے فوراً ہی کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم بابا جان......''

''وعلیکم السلام...... بیٹا خیریت ہے......'' اروی کی آواز سے انہوں نے کچھ اندازہ لگایا تھا۔

''بابا جان...... اصم ہاسپٹل آنا چاہتے ہیں۔ آپ کسی کو بھیج کر بلوالیں...... یہ بہت اپ سیٹ ہیں۔'' وہ انہیں مسئلہ بتاتے ہوئے ہچکچائی۔

''اروی بیٹا...... میں گھر ہی آ رہا ہوں۔ میں آ کر سمجھاتا ہوں اصم کو...... تم فکر نہیں کرو...... میں بس آ رہا ہوں۔'' رابطہ منقطع کرتے ہوئے انہوں نے گہری سانس لی۔ بی بی جان کی بیماری سے انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے کتنے مسائل تھے۔ جن کی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی تھی اور وہ مسائل حل بھی ہو جاتے تھے۔

☆......☆......☆

انعم اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی ٹی وی دیکھنے میں محو تھی۔ جب بابا جان دستک دے کر اُس کے کمرے میں چلے آئے۔ انہیں دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور فوراً ریموٹ کنٹرولر سے ٹی وی بند کر دیا۔

''بابا...... جان آ...... پ؟ بی...... بی...... جا...... ن تو......''

''ہاں الحمدللہ وہ اب بہتر ہیں۔ شکر ہے ہم لوگ انہیں وقت پر ہاسپٹل لے گئے...... لیکن......'' شرتیح خان سنجیدگی سے بتاتے ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئے۔

''لی...... کن...... بابا جان؟'' وہ قدرے پریشان ہوکر پوچھنے لگی۔
''ڈاکٹر نے کہا کہ انہیں آئندہ ہر قسم کی پریشانی سے بچانا ہوگا ورنہ......'' انہوں نے ارادتاً بات روک کر انعم کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اُس نے ذرا بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ بی بی جان کو اُس کے حوالے سے کوئی پریشانی ہے۔''
''و...... رنہ...... کیا بابا جان؟ کو...... ئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟'' ماں کے لیے فکر البتہ اُس کے لہجے میں ضرور تھی۔
''فی الحال تو خطرہ ٹل گیا ہے بیٹا! مگر فکر کی بات یہ ہے کہ وہ کیا پریشانی ہے جو انہیں خطرے میں ڈال گئی۔'' انہوں نے افسوس و دکھ بھرے لہجے اور جانچتی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ انہیں اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔
''گھر میں تو سب کچھ نارمل روٹین میں ہے بابا جان...... سوائے اصم بھائی کے ایکسیڈنٹ اور شادی والے واقعہ کی تبدیلی کے...... بی بی جان کو انہی کے حوالے سے پریشانی ہوسکتی ہے......'' انعم کے ذہن و دل میں نقش ہوئی بات اُن سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انہوں نے قدرے حیرت سے دیکھا۔
''اُس واقعہ کو تمہاری بی بی جان پہلے روز ہی قبول کر چکی تھیں۔ رہی اصم کے ایکسیڈنٹ کی بات تو اُس حادثے کو بھی وقت گزر چکا ہے۔ اور وہ وقت ہم سب نے اللہ کی رضا کے ساتھ صبر اور حوصلے سے گزار لیا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہاری ماں کو...... وہ اللہ کے فیصلے پر مزاحمت کرنے والی عورت نہیں ہے۔ بات کسی 'اپنے' کی مزاحمت کی ہے۔ بیٹا آخر آپ اپنے گھر جانا کیوں نہیں چاہتیں۔'' بابا جان نے پہلے تو ذرا تحمل سے دلیل دے کر اُس کی بات کی تردید کی۔ پھر براہِ راست گویا اُس کے سر پر بم پھوڑ دیا۔ گویا وہ سارے معاملے سے آگاہ تھے۔ انعم کتنی دیر تک تو بول نہیں سکی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی بابا جان اتنی سنجیدگی سے اُس سے باز پرس کریں گے۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اُسے یقین تھا کہ بابا جان اُس کے دکھ اُس کا واویلا سن کر اُسی کی حمایت کریں گے۔
''انعم...... میں کچھ پوچھ رہا ہوں...... کیا وجہ...... کیا جواز ہے جو......'' بابا جان نے اُس کی خاموشی طویل ہوتی دیکھی تو پھر سے استفسار کیا۔
''با...... با جان اگر آپ کو میرے ارادے کا معلوم ہوا ہے تو وجہ اور جواز بھی بی بی جان نے ضرور بتایا ہوگا۔'' وہ قدرے ٹھہر ٹھہر کر جواب دے رہی تھی۔
''انہوں نے جو 'وجہ' مجھے بتائی ہے وہ تو بڑی غیر اہم اور بچکانہ سی ہے بیٹا۔'' انہوں نے اُسے مزید حیران کیا۔
''بابا...... جان...... میں پابندیوں میں نہیں رہ سکتی۔'' اس نے اپنے موقف پر زور دیا۔
''آپ کو صالحہ آنٹی کی نیچر نہیں معلوم...... میں اُن کے ساتھ رہتی ہوں...... وہ......''
''بیٹا...... آپ کہاں اُن کے ساتھ رہی ہو...... آپ دونوں تو زیادہ تر گھومتے پھرتے رہے ہو...... شادی کا مطلب ہے کچھ ذمہ داریوں کو بہ خیر و خوبی نبھانا...... گھر کو، شوہر اور اُس کے والدین کو توجہ دینا Respect کرنا ہے۔'' اپنے طور پر انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اور......اور......جواب میں آپ کو کوئی Respect نہ دے بات بات پر طعنے دے......پھر......پھر کیا کروں میں بابا جان......میر......ی......بات ہی نہیں کوئی سمجھ رہا۔ مہ......یں اپنا گھر بچانا چاہتی ہوں۔اسی لیے الگ گھر کی ڈیمانڈ میرا حق ہے۔بی بی جان کو کیوں پریشانی ہے۔میں کیا غلط کررہی ہوں؟''

وہ رونے لگی تھی۔شریح خان نے بحیثیت باپ اُس کے آنسو دیکھنے مشکل ہوگئے' بی بی جان کا موقف اپنی جگہ درست تھا تو غلط انعم بھی نہیں لگ رہی تھی۔ یہ اُس کا حق تھا۔اگر اُسے سسرال کا ماحول قابل قبول نہیں تھا تو اُسے اپنے حق کا استعمال کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

وہ صرف بیٹی کے باپ ہو کر سوچ رہے تھے۔صرف اپنی بیٹی کے آنسو اُن کے لیے تکلیف دہ ہو رہے تھے۔وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا......میں خود اب فائق اور بلال درانی سے اس موضوع پر بات کروں گا......اور......تمہاری بی بی جان کو سمجھاؤں گا کہ مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے بجائے اپنے حواسوں پر سوار نہ کریں......تم فکر نہیں کرو......آرام کرو......میں اصم کے پاس ہوں......وہ ہاسپٹل جانے کی ضد کررہا ہے۔'' وہ اُسے دلاسہ دے کر اُس کے کمرے سے نکل گئے۔اُن کے جانے کے بعد انعم نے گہری سانس لے کر جیسے خود کو کسی مشکل سے نکالا۔

☆......☆......☆

سبرینہ اپنی مما اور بہن کی اچھی خاصی خاطر مدارت کے ساتھ اپنے دلچسپ موضوع پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد انہیں رخصت کرنے پورچ تک آئی تو بابا جان کی گاڑی وہاں کھڑی دیکھ کر حیرت ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''با......با......جان......گھر آئے ہوئے ہیں۔مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔''

''خود ہی تو کہہ رہی ہو......کہ نیچے کوئی ہے ہی نہیں......تمہاری دیورانی کو تو توفیق نہیں ہوئی کہ آ کر مل جاتی۔''

''ہاں......مگر......اُسے تو چھوڑیں......میں اُسے خود زیادہ لفٹ نہیں کراتی۔اچھا ہے نہیں آئی' خواہ مخواہ میں اُس کی موجودگی سے ٹینس ہوتی۔''

اپنی کہتے کہتے اروی کے ذکر پر وہ جھنجلا اٹھی۔

''اچھا......ایسی ہے وہ۔'' شہری نے حیرت ظاہر کی۔

''مجھے تو وہ بالکل برداشت نہیں ہوتی۔بابا جان کی بہت فیورٹ ہے اُس کے ساتھ......انعم تو بہت چڑتی ہے اُس سے......منہ پر ہی کھری کھری سنا دیتی ہے اُسے۔'' سبرینہ نے تصور کر کے مزہ لیا۔

''واقعی......؟ وہ کچھ نہیں کہتی جواب میں۔''

''اتنی جرأت نہیں کرسکتی وہ......خیر آپ لوگ ہاسپٹل سے ہو کر گھر جائیں گے تو مجھے کال کیجیے گا۔''

''تو تمہیں چلنا ہے تو چلو ہمارے ساتھ۔'' شہری نے اُسے پیش کش کی۔تو وہ سر ہلا کر بولی۔

''نہیں......ثمن بھابی آ جائیں گی گھر......پھر میں جاؤں گی۔ابھی تو بابا جان کو دیکھوں......پتہ نہیں اس وقت گھر کیوں آئے ہیں۔'' اُس نے کندھے اُچکا کر مجبوری بتائی۔

''چلو ٹھیک ہے...... ہم چلتے ہیں۔'' زیب النساء نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔
''شہری مجھے رات کو فون ضرور کرنا...... اوکے......'' سبرینہ نے اُسے تاکید کی وہ سر ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔
شریح خان اصم کے کمرے میں پہنچے تو تینوں یکدم اُن کی طرف متوجہ ہوا ٹھے۔ نیلم نے تو بے اختیار کہا بھی۔
''شکر ہے بابا جان...... آپ آ گئے...... اصم بھائی تو بہت پریشان ہو رہے ہیں اور......'' وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔ اصم نے اُس کی بات کاٹ دی۔
''پریشانی کی بات نہیں ہے یہ؟ بی بی جان کا پہلے بی پی شوٹ کر گیا تھا اور اب انہیں ہاسپٹلائز ہونا پڑا...... بابا جان...... کیا ہوا ہے انہیں؟'' اصم نے بہت بے چینی سے اٹھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر دوڑ ہی پڑے...... اروی کے چہرے پر واضح پریشانی لکھی تھی۔ فی الحال وہ اُس کی کوئی بات نہیں مان رہا تھا۔ وہ روم فریج کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اُس نے فریج سے جوس ٹن نکال کر شریح خان کے لیے گلاس بھرا۔
''بیٹا...... اصم...... میرے بچے...... تمہاری بی بی جان اب ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹرز کی آبزرویشن میں ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں...... انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو کر گھر آئیں گی۔'' شریح خان نے اُس کے پاس بیٹھ کر اُسے تسلی دینے کی کوشش کی...... اروی جوس کا گلاس لے کر اُن کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔
''انشاء اللہ...... بابا جان آپ یہ پئیں۔ آپ نے تو چائے بھی نہیں پی ہوگی۔ میں ابھی بنا لاتی ہوں۔''
''ہاں...... چائے تو بنا ہی لاؤ...... طلب بھی ہے اور تھکن بھی......'' انہوں نے قدرے مسکرانے کی کوشش کی۔
''بابا جان...... ہم ہاسپٹل کب جائیں گے۔'' وہ پھر سے پوچھ رہا تھا۔
''اصم...... بابا جان پہلے چائے تو پی لیں۔ ابھی تو آئے ہیں ہاسپٹل سے۔'' اروی نے ڈرتے ڈرتے ٹوکا۔
''ہاں...... ٹھیک ہے...... پھر میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔'' نیلم نے بھی خواہش ظاہر کی۔
''ٹھیک ہے چلے جانا...... لیکن وہاں زیادہ دیر تک رُکنے کی اجازت نہیں ہے...... ابھی ضیغم اور شارم بھی آ جائیں گے۔'' بابا جان کے کہنے سے اصم کی بے چینی بھی کم ہوئی تھی اور اروی کو بھی سکون ملا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے کھانے پر صالحہ، بلال درانی اور فائق کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ بہت دنوں بعد تینوں ایک وقت میں اکٹھے ہوئے تھے۔ صالحہ بھی اپنی بیماری کے بعد پرہیزی کھانوں سے تنگ آ کر آج معمول کے کھانے کی خواہش میں تھیں۔
کھانا شوہر کو سرو کرتے ہوئے اچانک جیسے انہیں یاد آیا۔
''آپ کو معلوم ہے؟ زیدہ بھابی ہاسپٹلائز ہیں۔''
''کہ...... یوں؟ کیا ہوا انہیں۔'' نوالہ منہ کے قریب ہی رہ گیا تھا۔ اُن کی حیرت قابلِ دید تھی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے زیب کی کال آئی تھی۔ بتا رہی تھی کہ انہیں مائنر ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' صالحہ نے بھی ہاتھ روک کر سنجیدگی سے بتایا۔ فائق بظاہر متوجہ تھا مگر اُس کے چہرے پر غیر واضح تاثر تھا۔

''او..... آئی..... سی..... تبھی ہماری میٹنگ کینسل ہوگئی۔ آج بزنس گروپ آف مرچنٹ کی میٹنگ تھی نا' یقیناً شریح خان کی وجہ سے ہی کینسل کی گئی ہے۔'' بلال درانی نے اظہارِ افسوس کیا پھر بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''تمہارا کوئی کانٹیکٹ نہیں ہے اُدھر؟''

''میرا.....؟'' فائق نے حیرت سے پوچھا۔ جیسے اُس سے نہیں کسی اور سے سوال کیا گیا ہو۔

''ہاں تمہارا..... تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟'' بلال نے بے یقینی سے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں میرا فی الحال کسی سے کانٹیکٹ نہیں ہے۔'' اُس نے پانی کا گلاس اُٹھا کر لبوں سے لگالیا۔

''کیوں؟ تمہیں انعم سے تو رابطہ رکھنا چاہیے۔'' بلال درانی نے بیٹے کو یاد دلانے کی کوشش کی تھی مگر وہ قدرے بدک کر بولا۔

''مجھے؟ مجھے کیوں؟ آپ بھول رہے ہیں ابو جان..... وہ یہاں کیا تماشہ کر کے گئی ہے۔ اُس کی وجہ سے امی جان کو ہاسپٹل جانا پڑ گیا تھا۔''

''اُس کا جو بھی فعل تھا..... بہر حال تمہارے کچھ فرائض ہیں..... تمہیں اپنی ساس کی عیادت کو جانا چاہیے بلکہ.....'' صالحہ نے شوہر کا موڈ دیکھتے ہوئے اُن کی کسی بات سے پہلے مصلحت سے کہا۔

''بلکہ ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔''

''سوری..... امی..... مجھے مجبور مت کریں۔ آپ لوگوں کو جانا ہے تو ضرور جائیں۔'' وہ کھانا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''کہا.....ں جا رہے ہو..... کھانا تو کھا لو.....''

''بس اب بھوک نہیں ہے۔ سوری.....'' وہ معذرت کرتا وہاں سے چلا گیا۔

''یہ آخر چاہتا کیا ہے؟'' بلال درانی کو اُس کا موڈ سمجھ نہیں آیا۔

''انعم کی ضد اور ہٹ دھرمی نے اُس کی چاہت ختم کر دی ہے۔'' صالحہ نے قدرے افسوس سے بیٹے کو وہاں سے جاتے دیکھ کر کہا۔ اُس کی بھوک پیاس ہی جیسے ختم ہوگئی تھی۔

''آخر اس مسئلے کو کسی طرح حل تو کرنا ہے۔'' بلال درانی زچ سے ہوئے۔ اکلوتے بیٹے کی پریشانی اُن سے بھی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔

''جب وہ دونوں مسئلہ حل کرنا نہیں چاہتے..... تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' صالحہ نے مزید افسوس و دکھ سے کہا۔

پھر جیسے اپنا ذہن جھٹک کر شوہر کو کھانے کی طرف متوجہ کیا۔

''اچھا.....! اب آپ تو کھانا کھائیں..... میں تھوڑی دیر بعد اُسے کھانا کھلا دوں گی۔'' بلال درانی نے بیوی کی مانتے ہوئے دوبارہ کھانے کی طرف توجہ دی۔

☆.....☆.....☆

بی بی جان کی بیماری کی خبر اروی نے اپنے میکے میں بھی کر دی تھی۔ زہرہ کو ویسے ہی بیٹی اور داماد سے ملنے آنا ہی تھی۔ اب تو اُن کا آنا لازمی بنتا ہی تھا۔ وہ اگلی صبح ہی زہیر کے ساتھ بیت الجنت چلی آئی تھیں۔ انہوں نے اپنے آنے کی اروی کو بھی اطلاع نہیں دی تھی۔

وہ بھی انہیں دیکھ کر حیران تھی۔ اصم ابھی سو کر اٹھا نہیں تھا جبکہ بابا جان اور سبرینہ ناشتہ کر کے ہاسپٹل جا چکے تھے۔ اروی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں لاؤنج میں بیٹھائے رکھے یا پھر اپنے کمرے میں لے جائے۔ ثمن رات دیر تک ہاسپٹل رہی تھی اس لیے اپنے کمرے سے ابھی تک نہیں نکلی تھی۔ اروی نے ڈرتے جھجکتے اُس کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ تو ثمن کسلمندی سے اٹھ کر دروازے تک آئی۔ اروی کو سامنے دیکھ کر اُس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

''اروی...... تم...... خیریت ہے۔'' وہ کچھ پریشان بھی ہو گئی تھی۔ اروی جھجک کر مسئلہ بتانے لگی۔

''وہ ثمن...... بھا...... بی...... امی اور زہیر بھائی آئے ہیں...... اصم سو رہے ہیں ابھی...... ا...... ور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں انہیں...... کہا...... ں بٹھاؤں۔''

''ارے...... اس میں سمجھ نہ آنے والی کیا بات ہے۔ گیسٹ روم ہے نا کچن کے دوسرے دروازے سے آگے...... تم نے دیکھے نہیں؟'' ثمن نے حیرت سے استفسار کیا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''افوہ...... اتنے عرصے سے تم یہاں ہو...... تم نے کبھی گیسٹ روم ہی نہیں دیکھے...... اچھا تم اب لے کر جاؤ...... سفر سے آئے ہیں وہ لوگ...... میں آ کر ناشتے کا انتظام کرواتی ہوں۔'' اروی شرمندہ سی پلٹ آئی۔ واقعی اُس نے ابھی تک سارا گھر نہیں دیکھا تھا تو گیسٹ روم کیسے دیکھتی وہ لاؤنج میں آئی تو زہرہ نے بیٹی کی پریشانی بھانپ لی۔

''اروی...... تم کیوں پریشان ہو رہی ہو...... اصم بیٹا اٹھیں گے تو ہم مل لیں گے...... آؤ نا تم ہمارے پاس بیٹھو۔''

''امی...... میں پریشا...... ن تو نہیں ہوں۔'' وہ خجل سی ہو کر صوفے پر ٹک سی گئی۔

''جھوٹ نہیں بولو...... تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم ہمارے آنے سے پریشان ہو گئی ہو۔'' زہیر نے بہن کو مصنوعی سنجیدگی سے چھیڑا تو وہ مزید سٹپٹا گئی۔

''زہیر بھائی...... ایسی بات نہیں ہے...... دراصل آپ لوگوں نے مجھے بتایا نہیں تو...... بی بی جا...... ن کی وجہ سے بھی پر...... یشانی ہے نا گھر میں......''

وہ سادگی سے وجہ بتانے لگی۔ زہیر بہن کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''بس ہم تمہیں سرپرائز دینا چاہتے تھے...... اور پھر میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ہمیں ریسیو کرنے کے لیے ڈرائیور گاڑی بھیجو...... اچھا نہیں لگتا نا...... کہ ہم تم سے ملنے آئیں تمہیں ہی زحمت دیں۔''

''زحمت کی کیا بات تھی بابا جان نے خاص ہدایت دی تھی۔ اچھا آپ آئیں...... گیسٹ روم میں فریش ہو جائیں۔ میں اصم کو دیکھتی ہوں...... وہ اٹھ جائیں تو مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔'' اروی خود کو پُر اعتماد ظاہر کرتی انہیں گیسٹ روم کی جانب لے آئی۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ اگست میں ملاحظہ فرمائیں)

ماں کی محبت اولاد کے لیے لازوال ہے اب ضروری نہیں ماں انسانی شکل میں ہی ہو...... ایسی تحریر جو آپ کو حیرت زدہ کردے گی

سردی سے اس کے دانت بری طرح بج رہے تھے، یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ اس کی بتیسی بج رہی تھی۔ اس کے دہانے میں پورے بتیس دانت تھے ہی کب، اور ہوتے بھی کیوں؟ بتیسی نوجوانی میں مکمل ہوتی ہے اور اس کی جوانی ابھی کافی مسافت پر تھی۔ آٹھ برس کی عمر میں مسوڑھے جتنے بھی دانت رکھتے ہیں اس وقت وہ سب کے سب کٹکٹا رہے تھے یخ ہواؤں کا مقابلہ کرتے کرتے ناک اور آنکھیں مسلسل پانی بہا رہی تھیں۔ پیٹ میں الگ بھوک کی شدت سے دھن ہو رہی تھی سوکھی آنتوں میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی پھینکی ہوئی اشیا بکثرت مل جاتی ہیں جن سے شکم پری کی جاسکے لیکن یہ اس کی بدنصیبی کہ مسلسل برسنے والی موسلادھار بارش نے کیچڑ اور غلاظت کے علاوہ سڑکوں پر کچھ باقی نہ چھوڑا تھا۔ سردی' بھوک اور اوپر سے بارش' اس کا نحیف و ناتواں بدن اتنی بلاؤں کا مقابلہ کرنے کی سکت کہاں رکھتا تھا مگر مجبوری تھی' کوئی ایسا ٹھکانہ ڈھونڈنے کی سعئ پیہم نے اس کی ٹانگوں کو تقریباً معذور کردیا تھا جو اس کے ننھے سے جسم کا بارش سے بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ سرد ہواؤں کا پہرے دار بن سکے، جو اسے ٹھنڈے کچوکے لگا رہی تھیں۔ وہ نیم جاں ہوتا چلا جارہا تھا۔ پتا نہیں کتنے میل کا سفر اُس نے طے کرلیا تھا، کتنی سڑکوں کی پیمائش کر ڈالی تھی محض ایک سائبان کی تلاش میں۔

اس نے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں دے دیے اور انہیں حرارت پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ناکام ہوکر اس نے ہاتھ کھینچ لیے اور زور زور سے رگڑ کر گرم کرنے چاہے مگر اب ہاتھوں میں زور ہی کہاں رہ گیا تھا۔ پیٹ خالی ہو اور ہاتھوں میں زور ہو' یہ کیسے ممکن ہے؟ بے بسی کا شدت سے حملہ ہوا' ایسے موقع پر آنسو نکل آتے ہیں مگر اس کے آنسو تو پہلے ہی خشک ہوچکے تھے' کہاں سے نکلتے؟ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا' جھک کر فٹ پاتھ کا جائزہ لیا کہ شاید کوئی سوکھا ٹکڑا' سڑا سڑایا پھل

اس کے مقدر کا مل جائے۔ آخر مایوس ہو کر سیدھا کھڑا ہو گیا' بارش سب کچھ ہڑپ کر چکی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں بارش کو گالی دی اور اپنے آپ کو سمیٹ کر اکڑوں بیٹھ گیا کہ شاید سردی سے بچاؤ ہو سکے۔

فٹ پاتھ کے نزدیک ہی ایک کار آ کے رکی۔ کار کا مالک نیچے اترا اور ایک بڑا سا کپڑا تان کر خود کو بارش سے بچاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا۔ اس نے سوچا' کار والے سے یہ کپڑا چھین کر بھاگ جائے اور اس بڑے کپڑے میں خود کو اچھی طرح لپیٹ کر سردی کا منہ چڑائے۔ وہ اٹھا مگر سردی اور کمزوری نے اس کی چستی اور پھرتی چھین لی تھی۔ جب تک دبے قدموں سے وہ کار کے قریب پہنچا' کار والا اندر مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے نامرادی سے گردن جھٹکی اور کار سے ٹیک لگالی' اچانک مسرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ کار کا انجن گرم تھا' وہ بونٹ پر لیٹ گیا۔ سردی سے کسی حد تک نجات مل گئی تھی۔ ایک مشکل آسان ہوئی تو دوسرے مسئلے نے سر اٹھایا۔ بھوک سے پیٹ میں بل پڑے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے پیٹ میں تیز ہری مرچیں بھر دی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کار والا جس گھر میں گیا تھا' اس کی کھڑکیوں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دروازے پر پہنچ کر اطلاعی گھنٹی بجادی۔

''کون ہے بھئی؟'' کسی نے دروازہ کھولے بغیر دور سے پوچھا۔ ایسے ظالم موسم میں باہر نکلنے سے مالک مکان گریزاں تھا۔

''میرا نام سلّو ہے۔'' اس نے باہر کھڑے کھڑے پوری طاقت سے چیخ کر اپنا نام بتایا۔

''کون سلّو؟'' اندر سے آنے والی آواز میں اجنبیت تھی پھر اس نے دریافت کیا۔ ''کیا

کام ہے' کیوں آئے ہو؟''

''کام کوئی بھی نہیں ہے' مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ مجھے سردی بھی بہت لگ رہی ہے۔''

''دفع ہو جاؤ......'' اندر سے ابھرنے والی آواز میں تجسس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔''یہ کوئی وقت ہے بھیک مانگنے کا؟ خبردار جو اب گھنٹی بجائی۔ چلو بھاگو یہاں سے۔'' اس کے بعد اندر سے بڑبڑانے کی آواز آئی جسے سلو سن تو سکا لیکن سمجھنے سے قاصر رہا۔ وہ نامراد واپس آیا اور کار کے بونٹ پر لیٹ گیا مگر اسے فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہونا پڑا۔ اتنی دیر میں کار کا بونٹ برف کی سل بن چکا تھا۔ اُس نے حسرت سے مکان کی روشن کھڑکیوں کو دیکھا اور پھر چل پڑا۔

☆......☆......☆

اس کے لیے یہ ساری کٹھنائیاں نئی ضرور تھیں مگر خلافِ توقع نہیں تھیں۔ جن دگرگوں حالات میں اس نے اپنی زندگی کے آٹھ سال گزارے تھے' وہ ایسے ہی تھے کہ ان سے گزرنے کے بعد موسم اور زمانے کا یہ ظلم و جور اس کے لیے تکلیف دہ تو تھا لیکن حیرت کا باعث نہیں تھا۔ وہ مظلوم کا مظلوم ہی تھا' ظلم کرنے والے بدل گئے تھے۔ اس وقت موسم قہرمان تھا تو اس سے پیشتر تائی اذیت کے نت نئے طریقے آزما چکی تھی۔

کچھ لوگ بدبختی کے کفن میں لپٹ کر مرتے ہیں۔ سلو سیاہ بختی کے پوتڑوں میں پیدا ہوا تھا۔ اسے جنم دینے کے دوران ہی ماں نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور جنم دے کر دنیا سے رخصتی پائی تھی۔ بیٹے کو ایک نظر دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ آج کل کے جدید اور سائنسی دور میں بھی سلو کو دائی کے ہاتھوں دنیا میں آنا پڑا تھا کیونکہ اس کے باپ نے جو کچھ کمایا تھا' چرس کے دھویں میں جلا کر اڑا دیا تھا چنانچہ سلو کی پیدائش کے وقت دائی کو دینے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے' ادھار کرنا پڑا تھا۔ رقم نہ تھی، لہٰذا آخر وقت میں دائی کے جواب دینے کے باوجود شرافت اپنی بیوی کو اسپتال نہ لے جاسکا' کیسے لے کر جاتا' وہ غریب پیدل نہیں چل سکتی تھی اور ٹیکسی کا کرایہ شرافت کی جیب میں نہ تھا۔ مفلسی کی پیداوار تھا چنانچہ سلو نے بھوک سے بلک کر اپنی ماں کو کھالیا اور کیا کرتا؟

یہ سارے طعنے تشنے اس کی تائی اٹھتے بیٹھتے اسے دیتی تھی۔ سلو چپ چاپ سننے پر مجبور تھا۔ پٹائی ہوتی تھی تو خاموشی سے پٹتا رہتا تھا' گالیاں پڑتی تھیں تو برداشت کرتا تھا' روٹی کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور روٹی تائی دیتی تھی۔ اس کا باپ شرافت' سلو کو تائی کے پاس چھوڑ کر بے فکر ہو گیا تھا۔ اب اس پر ایک چرس کی ذمے داری تھی جسے وہ بخیر و خوبی پورا کر رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ گھر آتا تو سلو ''ابا! ابا!'' کر کے اس سے لپٹتا مگر جس دل پر چرس کے دھوئیں کی دبیز تہیں چڑھ چکی ہوں، وہاں سے امنگیں کیا خاک پھوٹتیں۔

تائی شرافت کے سامنے بھی بلا تکلف سلو کو دھن دیتی۔ شروع شروع میں سلو نے بلبلا کر اپنے باپ کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں مدد کی درخواست کی لیکن شرافت اپنی جگہ سے نہیں اٹھا، کس برتے پر اٹھتا، کس گھمنڈ میں تائی کا ہاتھ روکتا۔ بزدلی اور بے بسی سے اٹھ کر گھر سے نکل جاتا۔ اس کے بعد سلو نے شرافت سے لپٹنا چھوڑ دیا تھا، اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں مدد کی درخواست بھی کرنا چھوڑ دیا تھا۔

تایا تائی کے گھر پہلے ہی بچوں کی بہتات تھی، سال پورا نہیں ہوتا تھا کہ گھر کی آبادی میں

ایک فرد کا اضافہ ہو جاتا۔ تائی کو اپنے گیارہ اتنے نہیں کھلتے تھے جتنا ایک اکیلا سلو...... اور ٹھیک بھی تھا، اپنے کیوں بار محسوس ہوں، پرایا کیوں نہ کھلے جو خواہ مخواہ، بلا معاوضہ تائی کے سر منڈھ دیا گیا تھا۔ غربت اور بچوں کی فوج نے پہلے ہی تائی کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ سلو نے اور جلتی پر تیل کا کام کیا مگر تائی کی ذات کا سارا الاؤ سلو ہی کے لیے مختص تھا۔ جوں جوں بچے بڑے ہو رہے تھے ضروریات بڑھ رہی تھیں، تائی کو سلو کا بوجھ زیادہ لگنے لگا تھا۔ شرافت کبھی آتا، کبھی نہیں آتا اور آتا بھی تو کیا، خالی ہاتھ آنا بھی کوئی آنا ہوتا ہے۔

سلو کا جی چاہتا کہ وہ بھی تائی کے بچوں کی طرح ممی کہے۔ اسے یہ لفظ بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک روز اس نے تائی کو ممی کہا تو تائی نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

''خبردار، جو تُو نے مجھے ممی کہا۔ تیری ممی کو تو تیرے باپ کی کاہلی نے کھا لیا' اب تُو مجھے کھا رہا ہے۔'' پھر مختلف اقساط میں ماں کے مرنے کی داستان سیاق و سباق کے ساتھ تائی نے اسے مختلف مواقع پر سنائی۔ یہ مواقع اس کی پٹائی کے ہوتے تھے۔

''تیری ماں بھی بدقسمت تھی، تجھے دودھ پلائے بغیر ہی مر گئی۔'' تائی نے ایک بار اپنے نومولود کو دودھ پلاتے ہوئے کہا۔ ''تُو بھی کیسا ناشدنی ہے۔ چل دور ہٹ یہاں سے، کیا گھور گھور کے میرے بچے کو نظر لگا رہا ہے۔ تیرا تو کنبہ ہی بدنصیبوں کا ہے، باپ دنیا سے نرالا، اولاد رُلتی پھر رہی ہے، اُسے اپنے نشے سے فرصت نہیں، بیوی کو بھی چرس کی بھینٹ چڑھا کر اسے عقل نہ آئی اور تجھے یہاں ڈال دیا۔ ہمارے نصیب پہلے ہی پھوٹے ہوئے ہیں تُو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ سال ہوتا نہیں کہ گود بھر جاتی ہے، آمدنی وہی کی وہی۔'' اس کے بعد تائی سلو کو کوسنے لگی اور سلو وہاں سے ہٹ گیا۔

آج تایا کی پوری تنخواہ کوئی جیب کترا لے اڑا تھا۔ تائی پہلے تو حواس باختہ رہ گئی پھر رفتہ رفتہ حواس قابو میں آئے تو غصہ بھی شباب پر آ گیا اور یہ شباب سلو پر پھٹا، جیب کترا دستیاب نہ تھا، اس کے حصے کے کوسنے سلو کو سننے پڑے اور اس کے بعد تو اسے معمولی بات پر گھر سے نکال دیا گیا اور تائی نے کہہ دیا کہ اب اگر اسے سلو کی شکل نظر آئی تو وہ سلو کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ پٹ پٹ کر سلو گھر سے نکل پڑا اور اب کسی چھپر کی تلاش میں واہی تباہی پھر رہا تھا۔ ستر لاکھ کی آبادی کے شہر میں آٹھ سالہ سلو کے لیے کوئی سائبان نہ تھا۔

ناک کی پھننگ سُن ہو چکی تھی۔ اس نے ہونٹوں کی چونچ بنا کر اُس کا رُخ ناک کی طرف کیا اور زور سے پھونک ماری لیکن سردی اس کے رگ و پے میں اچھی طرح حلول کر گئی تھی اس لیے بھاپ بھی ٹھنڈی نکلی۔ ہاتھ الگ برف کے ٹکڑے معلوم ہو رہے تھے، دونوں ہتھیلیاں اس نے آپس میں اتنی رگڑیں کہ سوزش ہونے لگی۔ سردی پر کوئی پیش نہ گئی تو اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے ان میں زور زور سے پھونکیں مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا مگر لاحاصل، پھونکوں میں ذرا بھی حدت نہیں تھی۔ اس کے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ دوڑنا شروع کر دے۔ وہ بھاگنے لگا' لڑکھڑاتی کمزور ٹانگیں اس کے عزم کا ساتھ دینے سے قاصر تھیں لیکن اُسے بھاگنا تھا' سردی سے بچاؤ کی خاطر، اپنی بقا کے واسطے، وہ دوڑتا رہا۔

اچانک وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک

چھوٹا سا مکان تھا، مکان کیا، کھنڈر تھا، ایسے شکستہ در و دیوار میں کوئی انسان نہیں رہ سکتا تھا' بھوت پریت ہی بسیرا کر سکتے تھے اور سلو کی دشمنی بھوت پریت سے نہیں' انسان سے تھی جو اُس کی ننھی سی جان لینے کے درپے تھا۔

سب سے پہلے اُس نے چھت کو دیکھا' فی الحال سب سے زیادہ اہمیت چھت کی تھی جو بارش کے چھوٹے چھوٹے بموں سے نجات دلا سکے۔ چھت موجود تھی گو کہ اس کا دو تہائی حصہ ٹوٹ پھوٹ کر جھڑ چکا تھا پھر بھی بقایا ایک تہائی اتنا تھا کہ سلو کا سائبان بن سکتا تھا۔ گری پڑی دیواروں، برائے نام چھت اور ملبے کا ڈھیر، یہ ایک کمرے کا مکان سلو کو کسی شاہ کے قصر سے زیادہ پُرشکوہ لگا۔

وہ تیزی سے اندر داخل ہوا، بدبو کے ناگوار بھبکوں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ اُس نے ناک سکیڑی مگر یہ وقت نخرے دکھانے کا نہیں تھا، جان بچانے کا تھا، لہٰذا ماتھے پر ابھر آنے والی سلوٹیں فوراً لاپتا ہوگئیں۔ وہ آگے بڑھا اور چھت کے بچے کھچے حصے کے نیچے آگیا لیکن بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو اور غصے سے پھلجھڑیاں بھی چھوٹنے لگیں۔ یہاں ایک لحیم شحیم گائے براجمان تھی۔ سوراخوں سے پُر کھنڈر نما مکان کی دیوار سے برابر والے مکان کی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ وہ اپنی پناہ گاہ کو اس روشنی میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

''ہش......'' سلو نے گائے کو ہشکارا۔ آج کل کے تو انسان، انسان کی مجبور زبان نہیں سمجھتے، وہ تو جانور تھی۔

''ہش، ہش، ہش......'' سلو نے پوری کوشش کی کہ گائے اس کا مدعا سمجھ جائے مگر وہ ٹھس بیٹھی رہی، ناگفتہ بہ حالات اور بے درد ماحول میں کون کسی کی مجبوری سمجھتا ہے۔ سلو کو غصہ آگیا۔ اس نے پوری قوت سے ایک زوردار لات گائے کے پہلو میں رسید کردی۔ گائے اٹھ کھڑی ہوئی اور سلو کو گھورنے لگی' گائے کی آنکھوں میں بہت سے پیغام تھے۔ سلو نے غور سے اس کی طبیعت جانچنے کی کوشش کی مگر گائے کا انداز جارحانہ نہ تھا۔ وہ ایک ٹک سلو کو دیکھے جا رہی تھی۔ پتا نہیں، اس کی آنکھوں میں کیا تھا، سلو کھڑے کھڑے موم کی طرح پگھلنے لگا۔ گائے آہستہ آہستہ اپنی دم لہرا رہی تھی اور اس کی نگاہوں کا محور مستقل سلو تھا۔ سلو کا دل دُکھنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ گائے سے مخاطب ہوا۔ ''انسانوں کے اس چڑیا گھر میں میرے لیے کوئی پنجرہ خالی نہیں ہے تو تمہیں کون جگہ دے گا؟'' یکایک بھوک سے اس کے پیٹ میں ٹیس اٹھی۔ خالی پیٹ کی چبھن چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ مسکن مل گیا مگر روٹی ناپید تھی اور نصیب ہونے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ اس نے بنظرِ غائر گائے کا جائزہ لیا اور اس کی ساری پریشانی دور ہوگئی، وہ مطمئن ہوگیا۔ گائے نے بھی اس کی طمانیت کا اندازہ لگا لیا تھا، اس کی دُم زور زور سے ہلنے لگی۔ سلو نے محبت سے گائے کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔

''اس وقت تم نے مجھے بڑا سہارا دیا ہے، جگہ کم ہے پھر بھی ہم دونوں گزارہ کر سکتے ہیں۔'' اس نے گائے کے منہ سے منہ ملا کر کہا۔ گائے اپنی لیس دار زبان نکال کر سلو کی گردن چاٹنے لگی جیسے اپنی رضامندی کا اظہار کر رہی ہو۔

''سر چھپانے کی جگہ تم نے مجھے مہیا کی ہے، بھوک کا مسئلہ بھی تمہی کو حل کرنا پڑے گا۔'' سلو

نے گائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو گائے اسے اور شدت سے چاٹنے لگی۔ اب اس کی دُم اور تیزی سے بل کھا رہی تھی۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' سلو نے گائے کی تھوتھنی چوم کر خوشی سے کہا اور گائے کے نیچے کمر کے بل لیٹ کر اپنی بھوک مٹانے لگا۔

پیٹ بھرنے کے بعد جب وہ کھڑا ہوا تو آسودگی نے اس کے انگ انگ میں مسرت کے جال پھیلا دیے تھے۔ وہ بری طرح گائے کو پیار کر رہا تھا، اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''مجھے معاف کر دو مہربان ماں' مجھ سے غلطی ہو گئی ہے ممی۔'' وہ گائے کا وہ پہلو سہلاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے اس نے لات ماری تھی۔ گائے پہلے تو اس کی دیوانگی پر حیرت سے اسے تکتی رہی پھر اس نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا۔ جا بجا پھیلے ہوئے گوبر کے ڈھیر سلو کے آرام میں مزاحم نہیں ہوئے۔ وہ ان بدبوؤں سے بے بہرہ گائے سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ اس کے بازو گائے کے چوڑے چکلے بدن کے گرد حمائل تھے اور اس کا چہرہ گائے کے پیٹ سے مس ہو رہا تھا۔

مائیں اپنی اولاد کے سارے دکھ دور کر دیتی ہیں۔ سلو کی ممی نے بھی اس کی تمام مشکلات دور کر دی تھیں۔ گائے کی آغوش میں جب وہ سویا تو سردی کا احساس فنا ہو چکا تھا۔ آٹھ سال کی ساری کلفتیں دور ہو گئی تھیں۔ نئے سلو نے جنم لیا تھا جس کی ماں ایک گائے تھی۔ ماں وہی تو نہیں ہوتی جس کے پیٹ سے جنم لیا جائے۔ اسے بھی تو ماں کہتے ہیں جو مہربان بادل کی طرح اولاد کی سوکھی کھیتیوں پر برس جائے، سارا غبار، سارے رنج دھو ڈالے' کونپلوں کے پھوٹنے میں معاون و مددگار ہو۔ سلو بھی نئی کونپل بن کر پھوٹ رہا تھا جس کی جڑیں ایک گائے کے وجود میں تھیں۔

دن اگرچہ جوہڑ کے گندے پانی کی طرح ٹھہر گیا تھا مگر رات خوشگوار جھونکا بن کر سبک رفتاری سے گزر گئی۔ سلو کی آنکھ گائے کے کسمسانے اور ڈکرانے کی آواز سن کر کھلی۔ دن نکل آیا تھا، اس نے کسل مندی سے اپنے پپوٹے کھولے۔ وہ گائے سے پیوستہ پڑا تھا اور گائے اٹھنا چاہ رہی تھی۔ وہ جمائیاں لیتا ہوا بیدار ہو گیا۔

سلو کو ہٹتے ہی گائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شاید سلو کے جاگنے کی منتظر تھی۔ سلو بے ساختہ گائے سے لپٹ گیا۔ ''تم نہ ہوتیں تو میں مر جاتا۔ بھوک سے نہ مرتا تو سردی مار دیتی۔'' وہ گائے کو احسان مندی سے دیکھ رہا تھا۔ گائے نے آواز نکالی۔ سلو تڑپ کر رہ گیا۔ کاش، وہ گائے کی زبان سمجھ سکتا، پتا نہیں، وہ کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے گائے کی گردن میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال دیا۔

''تم کیسی ممی ہو؟ مجھے اپنی زبان نہیں سمجھا سکتیں؟ خبر نہیں' تم کیا کہہ رہی ہو؟ میری زبان نہیں بول سکتیں تو مجھے اپنی زبان سکھا دو؟'' جواب میں گائے کچھ نہ بولی بلکہ اس نے چاروں طرف اپنا سر گھما دیا۔ سلو نے الگ ہو کر ایک انگڑائی لی۔ گائے نے دیوار کے نقب زدہ حصے کی طرف پیش قدمی کی، وہ باہر نکل رہی تھی۔

''ارے! کہاں چلیں؟'' سلو نے لپک کر راستہ روک لیا۔ گائے اسے حیران ہو کر دیکھ رہی تھی پھر وہ سب کچھ سمجھ گئی اور ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

''اپنے بیٹے کو بھوکا چھوڑ جاؤ گی ممی؟'' سلو نے شکایتی لہجے میں کہا۔ گائے کو باہر نکلتا دیکھ کر

اس کے پیٹ میں نعرے بلند ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن گائے، سلو کی تنبیہ سے قبل ہی دیوار کے سائے میں جا کھڑی ہوئی تھی جیسے مائیں' بچے کے دودھ پلاتے وقت دنیا سے چھپاتی ہیں اور آڑ لے لیتی ہیں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔

سلو ناشتا کر کے زمین سے اٹھا اور ڈکار لیتا ہوا بولا۔ ''مجھے پتا ہے ممی' اب تم اپنا پیٹ بھرنے جاؤ گی۔ سڑکوں سڑکوں پھرو گی اور کوڑا کرکٹ چرو گی۔ جاؤ' خدا حافظ! اللہ تمہیں کسی قصائی کی نظر بد سے محفوظ رکھے۔'' گائے آہستہ آہستہ باہر نکل گئی جیسے سلو کی دعا پر آمین کہہ رہی ہو۔

ممی کے جانے کے بعد سلو نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ گوبر کے ڈھیر دیکھ کر اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔ رات اسی گندگی پر اسے پُرسکون نیند آئی تھی، اب یہی غلاظت بری لگ رہی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے۔ بے یار و مددگار تھا تو تعفن کا ڈھیر بھی عطریات کا کارخانہ لگ رہا تھا اور اب وہ ایک ممی کا بیٹا ہو گیا تھا۔ خالی پیٹ میں دودھ پڑ گیا تھا اور سر پر چھت میسر آ گئی تھی تو ناگواری کے تاثرات خود بخود اُگ آئے تھے۔ اس نے اپنی رہائش گاہ کی صفائی کرنا شروع کر دی۔ گوبر کے ڈھیر اٹھا اٹھا کر ایک گوشے میں ڈالنے لگا۔ صفائی کرتے کرتے دوپہر ہو گئی مگر وہ کام میں جتا رہا۔ اگرچہ جگہ بہت مختصر تھی اور اس عرصے میں صفائی ہو جانا چاہیے تھی لیکن سلو کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہر شے کو آئینے سے زیادہ روشن کر دے، آخر وہ تھک گیا۔ اب بھوک کا غلبہ شروع ہو گیا تھا۔ صبح کا پیا ہوا دودھ محنت کرنے کی وجہ سے جلد ہی ہضم ہو گیا تھا۔ وہ لیٹ گیا اور ممی کا انتظار کرنے لگا۔ بدن کو سکون ملا اور ہوا لگی تو سردی محسوس ہونے لگی۔ سلو نے اپنا لباس غور سے دیکھا، وہ اسے بے انتہا بوسیدہ اور ناکارہ لگا۔ فطری بات ہے، بنیادی ضروریات پوری ہو چکی تھیں لہٰذا ثانوی الّلے تللّے سر اٹھا رہے تھے۔ رات کو بیک وقت تین مسائل درپیش تھے' پیٹ' چھت اور ٹھنڈ۔

پیٹ اور چھت کا مرحلہ قدرت نے طے کرا دیا تھا، اب صرف تن ڈھانپنے کا سوال باقی تھا۔ سلو گردن نیچی کر کے اپنا تنقیدی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ بوسیدہ لباس اسے بالکل نہیں جچ رہا تھا' چیکٹ کپڑے کسی چوہے کی کھال سے مشابہ تھے اور چوہے کی یہ کھال بھی سلامت نہ تھی، دہائی دے رہی تھی، ٹھنڈی ہوا جابجا بنے ہوئے سوراخوں سے بلاتکلف حملہ آور ہو جاتی تھی۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ سلو کے پیٹ میں گڑگڑ ہو رہی تھی۔ وہ ممی کی راہ تک رہا تھا اور ممی خدا جانے' کہاں آوارہ گردی کر رہی تھی؟ ننگے فرش پر لیٹے لیٹے سلو کی کمر دُکھنے لگی۔ وہ پہلو بدلتا رہا اور آخر کار سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی مگر ممی ہنوز لاپتا تھی۔ اس کا شکم چیخ چیخ کر فریادیں کر رہا تھا۔

سلو کے پاس کوئی علاج نہ تھا وہ مسیحا غائب تھا جو خالی پیٹ سے اٹھنے والی فریادوں کو خاموش کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم ممی؟'' گائے شام ڈھلے گھر میں داخل ہوئی تو سلو بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ ''کیا دوپہر کو تم نہیں آ سکتیں؟'' سلو نے گائے کی کمر رگڑتے ہوئے کہا۔ ''شاید یہ تمہاری عادت ہی ہو اور میری زبان تم نہیں سمجھ سکتیں، مشکل تو خوب سمجھتی ہو نا؟'' سلو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کمر کس چکا تھا۔ گائے اس کا مقصد سمجھ کر دیوار کے ساتھ کھڑی

ہوگئی۔

''تم بہت سمجھ دار ہو ممی، کاش، تم مجھ سے باتیں کر سکتیں۔'' سلو کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز گلوگیر ہوگئی۔ حلق میں نمکین ذائقے نے اس کی اشتہا بڑھا دی، وہ جلدی جلدی دودھ پینے لگا۔

سلو کی زندگی کے اچھے دن آ چکے تھے۔ صبح کے ناشتے کا انتظام ممی کے سپرد تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ مانگ تانگ کر کھا لیتا تھا۔ اس نے باقاعدہ بھیک مانگنے کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ یہ واحد روزگار ہے جس کے لیے نہ کوئی قابلیت درکار ہے نہ خاطر خواہ تجربہ، عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ جتنی چھوٹی ہو، سود مند اور جتنی بڑی ہو، اتنا ہی اچھا، ویسے بھی لباس کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ سلو کو آسان سب سے یہی لگا کہ بھیک مانگنے لگے، اس کے علاوہ پیسا کمانے کی کوئی صورت نہیں تھی اور نہ ہی سلو کی عمر کسی اور کام کی متحمل ہو سکتی تھی۔

''بابو صاحب! اللہ کے نام پر۔'' اس نے ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص کا دامن تھام لیا اور چہرے پر پیشہ ورانہ بے بسی اور لاچاری پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

''چلو چھوڑو۔'' وہ آدمی لاپروائی سے آگے بڑھ گیا۔ ''جہاں جاؤ، یہ منکر نکیر پہنچ جاتے ہیں۔'' بھکاریوں سے بے زار بڑبڑاہٹ ابھری۔

''ہونہہ......'' سلو منہ ٹیڑھا کر کے جاتے ہوئے بابو صاحب کو گھورنے لگا۔ ''سوٹ تو چڑھا لیتے ہیں لنڈے سے خرید کر۔ اللہ کے نام پر دینے کو کچھ نہیں ہوتا؟'' وہ کچھ آگے بھی کہنا چاہتا تھا لیکن ایک نوجوان کو آتا دیکھ کر اٹینشن ہو گیا۔

''صاحب جی، اللہ کے نام پر روپیہ دیتے جاؤ۔'' نوجوان رک گیا۔

''سنو، ادھر آؤ۔'' اس نے سلو کو پاس بلایا۔ سلو سمجھ گیا کہ وار کارگر ثابت ہوا ہے مگر نتیجہ اس کے برعکس نکلا، وہ قریب پہنچا، نوجوان نے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے پیار سے پوچھا۔

''سلو......!'' سلو نے پورے جبڑے پھیلا کر مسمسی شکل بنالی۔

''اصلی نام پوچھ رہا ہوں، پورا نام؟''

''میرا نام تو سلو ہی ہے جی۔''

''چلو جانے دو، یہ بتاؤ، تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟'' نوجوان دردمند دل کا مالک تھا۔

''پتا نہیں صاحب۔'' سلو نے تیزی سے کہا پھر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے نوجوان کو ممی کی بابت تو بتایا ہی نہیں تھا۔

''اوہ......'' نوجوان نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''کب سے یہ دھندا کر رہے ہو؟ میرا مطلب ہے، کب سے بھیک مانگ رہے ہو؟''

سلو کو اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ ''تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں صاحب، کچھ دینا ہو تو دو ورنہ اپنے رستے جاؤ۔'' اس نے تنگ آ کر کہا لیکن نوجوان پر کوئی اثر نہ ہوا، اس کے سوالات جاری رہے۔

''تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟''

''اس لیے کہ مجھے کوئی اور کام نہیں آتا۔'' سلو نے جل کر جواب دیا۔

''اگر تم چاہو تو بغیر بھیک مانگے تمہاری ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔'' نوجوان نے اسے سمجھایا۔

''وہ کیسے؟'' سلو بجھ گیا۔

''میں تمہیں یتیم خانے میں داخل کروا سکتا ہوں، وہاں تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔''

''یتیم خانہ، وہ کیا ہوتا ہے؟''

''وہاں بہت سارے بچے ہوتے ہیں تمہارے برابر، تم سے بڑے، تم سے چھوٹے۔'' نوجوان لالچ دینے لگا۔

''اچھا'' سلو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ''چلو پھر۔'' وہاں کپڑے تو ملتے ہیں نا؟''

''ہاں، ہاں، سب کچھ ملتا ہے، روٹی، کپڑے، بستر۔'' نوجوان اس کی انگلی پکڑ کر چل پڑا۔

☆......☆......☆

یتیم خانے کا بستر ننگے فرش سے کہیں زیادہ آرام دہ تھا، اس کے باوجود سلو کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ عادت کے مطابق اس نے برابر سوئے ہوئے لڑکے سے لپٹنا چاہا، وہ بدک کر علیحدہ ہو گیا اور سلو کو مغلظات بھی سنائیں۔ سلو کی بے چینی سوا ہو گئی تھی۔ وہ مانوس لمس نہیں مل رہا تھا جس کا وہ گزشتہ چند راتوں سے عادی ہو گیا تھا۔ ممی بری طرح یاد آ رہی تھی۔ وہ گرمی سلو کو رہ رہ کر تڑپا رہی تھی جو ممی کے کھردرے جسم میں پوشیدہ تھی۔ سلو بے کلی سے پہلو بدلتا رہا۔

رات کا نہ معلوم کون سا پہر تھا جب سلو کی برداشت نے شدت سے احتجاج کر ڈالا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ سارا عالم سو رہا تھا، بس سلو جاگ رہا تھا۔

اپنی پناہ گاہ میں سلو واپس پہنچا تو ممی بھی جاگ رہی تھی۔ سلو دیوانہ وار ممی سے چمٹ گیا۔ ممی نے آوازیں نکالیں، وہ بھی شاید سلو کی غیر حاضری کے بارے میں باز پرس کر رہی تھی۔ سلو اس سے لپٹا تو ممی نے اپنے کھر زور زور سے زمین پر مارنے شروع کر دیے۔ یہ اس کا گلہ کرنے کا انداز تھا۔

''مجھے معاف کر دو ممی!'' سلو رونے لگا۔ ''مجھے کیا پتا تھا کہ وہ آدمی مجھے کہاں لے جا کر بند کر دے گا۔ اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی۔ تم بھی مجھے چھوڑ کر کبھی مت جانا۔'' جواب میں گائے زور سے ڈکرائی جیسے سلو کی تائید کر رہی ہو۔ سلو پرسکون ہو گیا۔ گائے نے بھی سلو کے معافی مانگنے کے بعد اپنے کھر مارنا بند کر دیے تھے۔

☆......☆......☆

شام کو ممی گھر آئی تو اس کے ساتھ ایک مٹیالے رنگ کا بیل بھی تھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ اور شاید اس کی ناتوانی ہی اس کی جان کا صدقہ بن گئی تھی اور وہ قصاب کے بے رحم ہاتھوں کے چنگل میں نہیں پھنسا تھا۔

''یہ کسے اپنے ساتھ لے آئی ہو ممی؟'' سلو نے بیل کو ناگواری سے دیکھا۔ ممی نے کوئی جواب نہیں دیا اور گردن جھکا لی۔

''ہوں تو اب تم اکیلی نہیں رہیں۔'' سلو مٹیالے سے بیل کے نزدیک آ گیا اور اسے خوں خوار نظروں سے گھورنے لگا۔ بیل کی پچھلی ٹانگ پر گہرا زخم تھا اور اس میں پیپ بہہ رہی تھی، لاتعداد چپکی مکھیاں بھی زخم کے مندمل نہ ہونے کی وجہ تھیں۔ سلو نے بیل کو مارنے کے لیے اپنا پاؤں اٹھایا۔ اپنی ممی میں کسی قسم کی شرکت اسے قبول نہ تھی۔ اس سے پیشتر کہ سلو کی لات بیل کے پڑتی، اس کی نگاہ ممی پر پڑی۔ ممی سلو کو اپنی موٹی موٹی آنکھیں گاڑے گھور رہی تھی' ان آنکھوں میں پتا نہیں کیا کچھ تھا، بہت کچھ تھا جس نے سلو کو اپنا پاؤں دوبارہ زمین پر جمانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے یکبارگی آگے بڑھ کر بیل کی پشت پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ممی نے خوشی کے

اظہار کے طور پر آواز نکالی۔ ''شکریہ ممی۔'' سلو کی آواز میں ایک نیا عزم تھا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ مجھے ایک ابا بھی لا دیا۔'' سلو نے کپڑے کا ٹکڑا اٹھا کر ابا کا زخم صاف کرنے کی کوشش کی۔ بیل نے زوردار جھرجھری لی تو سلو کا ہاتھ رک گیا۔

''شاید تمہیں تکلیف ہو رہی ہے؟'' اس نے چیتھڑا دور اچھالتے ہوئے کہا۔ ''افسوس کہ میں تمہارا علاج نہیں کر سکتا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ تمہاری مدد کیسے کروں؟''

ممی، سلو اور اس کے ابا کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ممنونیت کی جھلک تھی۔ خاندان مکمل ہونے پر سلو کو تازگی اور فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ اب اس کی زندگی میں کوئی سقم نہ رہا تھا، ساری خالی جگہیں پر ہو گئی تھیں۔

تھوڑی دیر تک تینوں ساتھ رہے۔ سلو، اپنے ابا سے باتیں کرتا رہا، ایسی باتیں جن کا جواب اسے موصول نہ ہو سکتا تھا پھر بھی وہ ممی اور ابا کی حرکات و سکنات سے جواب کا اندازہ لگا کر گفتگو کو طول دیتا رہا۔ ممی بہت مسرور تھی، بار بار زمین پر کھر مار رہی تھی اور دم لہرا رہی تھی فتح مند پرچم کی طرح۔

اس کے بعد بیل وہاں سے چلا گیا، سلو نے روکا بھی نہیں کیونکہ ان کی قیام گاہ مختصر ہونے کی بناء پر مکمل خاندان کو جگہ فراہم نہیں کر سکتی تھی۔

یہ ایک معمول بن گیا تھا، شام کو ممی آتی تو بیل اسے چھوڑنے آتا۔ تینوں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے پھر ابا واپس چلے جاتے جیسے اکثر بچوں کے ابا آتے ہیں، ملتے ہیں، وقت گزارتے ہیں اور دبئی یا مسقط واپس چلے جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

کچھ دن سے سلو کو اپنے ناشتے کے لیے ڈبل روٹی اور چائے پر گزارہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ممی نے اچانک دودھ دینا بند کر دیا تھا۔ سلو کی محدود عقل اس تبدیلی کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔

''آج میں تمہارے لیے بستر لایا ہوں۔'' سلو نے موٹا سا روئی کا گدا ممی کی جگہ پر بچھاتے ہوئے کہا۔ اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے تھے کہ اپنی ممی کو بساط کے مطابق آسائش پہنچا سکے۔ ''اب تم اس پر بیٹھا کرو گی۔''

ممی نے پہلے گدے کو پھر سلو کو دیکھا۔ ''بیٹھ جاؤ نا۔'' سلو نے اصرار کیا اور ممی کو بٹھانے لگا اور ممی گدے پر بیٹھ گئی۔ صبح کو سلو نے دیکھا کہ گدا ممی کے گوبر سے آلودہ ہو چکا ہے۔ وہ مسکرایا۔ ''کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ میں اسے دھولوں گا۔'' گدا دھوتے وقت اس کی پیشانی پر کوئی لکیر نہیں تھی، وہ گنگنا رہا تھا۔ ایسی اولاد تو انسانوں کے نصیب میں نہیں ہوتی جیسی ایک گائے کے مقدر میں قدرت نے لکھ دی تھی۔

ایک روز وہ تین سے چار ہو گئے۔ سلو کی آنکھ کھلی تو اس نے ممی کے پہلو میں ایک ننھے منے نرم اور ملائم بچھڑے کو پایا۔

''ارے، یہ کیا!'' وہ خوشی اور حیرت سے چلایا۔ ممی تفاخر سے اپنی تخلیق کو چاٹ رہی تھی۔ سلو لپک کر آگے بڑھا اور اس نے ننھے بچھڑے کو گود میں بھر لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بچھڑے کو بانہوں میں اٹھا کر ناچے، کوشش بھی کی مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی چنانچہ وہیں بیٹھ کر اپنے بھائی کو سہلانے لگا۔

ممی نے دودھ دینا شروع کر دیا تھا لیکن سلو دانستہ شیر خواری سے گریز کرتا تھا۔ وہ اپنے ننھے بھائی کا حق نہیں مارنا چاہتا تھا۔ چھوٹے بھائی کو گرم رکھنے کے لیے اس نے ایک کمبل بھی خرید لیا

تھا اور روز شام کو بچھڑے پر ڈال کر اسے کس کر رسی سے باندھ دیتا تھا۔ وہ سوتیلا تھا لیکن سلو کے دل میں بال برابر رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے نہ سگا تھا نہ سوتیلا کہ دونوں میں تمیز ہو سکتی، وہ بس بھائی تھا۔ دوسری نسل سے تھا مگر بھائی تھا، مختلف مخلوق تھا مگر بھائی تھا۔

''تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو مگر پھر بھی بڑے لگتے ہو۔'' سلو نے بچھڑے کے قد آور جسم کو محبت سے مسلتے ہوئے شکوہ کیا۔ ''تمہیں چھوٹا ہونا چاہیے تھا تاکہ میں تمہیں گود میں اٹھا سکوں اور سیر کرا سکوں۔'' بچھڑا سلو کو چاٹنے لگا۔ سلو فرطِ مسرت سے بے قابو ہو گیا۔ بچھڑے کے پے در پے بوسے سلو کے رگ و پے میں لرزہ طاری کیے دے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں مند گئیں۔

☆......☆......☆

سلو اپنی قسمت پر بے حد نازاں تھا اور اس کا ثبوت وہ خود تھا۔ چہرے پر رونق آ گئی تھی، دبلی پتلی پھچی ٹانگیں صحت مند ہو گئی تھیں، رنگت میں اب وہ لاوارثی یکسر نہیں تھی جو سلو کی خاص پہچان ہوا کرتی تھی۔

شام کو جب وہ چاروں مل بیٹھتے تو فضا بھی ان پر رشک کرتی۔ سلو قدرت کا شکر گزار تھا، کہاں وہ پرانا تنہا سلو اور کہاں یہ سلو، مکمل خاندان کا ایک اہم فرد، ایک مضبوط ستون' ہر ستون مضبوط ہوتا ہے لیکن اس کی بنیادوں سے سیمنٹ نکال لیا جائے یا خلا باقی رہنے دیا جائے تو پھر وہ ستون، ستون نہیں رہتا، سیمنٹ اور بجری کا گرا ہوا تو دہ بن جاتا ہے۔ سلو بھی تو پہلے ایک گرا ہوا تو دہ تھا' بھر بھری مٹی کا ڈھیر، بے بنیاد اور اب ممی نے سیمنٹ، ابا نے بجری اور بھائی نے ریت بن کر اس کے اعتماد کی بلند و بالا عمارت کھڑی کر دی تھی۔

انہیں آتے رات ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر پہنچے تو گنتی میں کم ہو چکے تھے، تین میں سے دو رہ گئے تھے۔ سلو بچھڑے کو ان کے درمیان نہ پا کر پریشان ہو گیا۔

''بھائی کہاں ہے میرا؟'' اس نے دونوں کی طرف منہ کر کے سوال کیا۔ ''بولو نا۔'' وہ باری باری دونوں کے نزدیک جا کر چیخا۔ ممی چپ چاپ کھڑی کھر سے زمین پر کھر مار رہی تھی۔ بیل گردن جھکائے کھڑا تھا۔ سلو نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا، بچھڑے کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ واپس اندر آیا تو اس نے دیکھا، ممی، بچھڑے کا کمبل سونگھ رہی تھی، وہ وہیں بیٹھ گئی اور کمبل چاٹنے لگی۔ سلو نے دیکھا، ممی کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ بے قراری سے بچھڑے کے کمبل کو چاٹ رہی تھی اور اس سے اپنا منہ رگڑ رہی تھی۔ بیل شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔

ممی کی تڑپ سلو سے دیکھی نہ جاتی تھی، وہ اپنا آپ بے دردی سے رگڑ رہی تھی اور اس کمبل کو جو سلو، بچھڑے کو اڑھا دیتا تھا، مسلسل چاٹے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پرنالے سست رفتاری سے بہ رہے تھے۔

رات دیر تک بچھڑے کے انتظار میں ناکام رہنے کے بعد سلو کو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دیر نہ لگی کہ اس کا اکلوتا بھائی کسی قصائی کے بے رحم ہاتھوں میں جا چکا ہے۔ چھریاں کب یہ دیکھتی ہیں کہ کون اکلوتا ہے اور کون دکلوتا، ان کا کام تو کاٹنا ہوتا ہے۔

یتیم خانے میں گزاری ہوئی نامکمل رات کے بعد یہ دوسری رات تھی کہ سلو کو دکھ نے سونے نہیں دیا۔ وہ ممی سے لپٹا آنسو بہا رہا تھا۔ بھائی

بری طرح یاد آ رہا تھا۔ ممی نے کمبل چھوڑ کر اپنی بھاری گردن سلو کی کمر پر رکھ دی اور زور لگا کر اسے خود سے پیوست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ممی اپنی بچی کھچی پونجی کی حفاظت کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے اپنے دل میں محفوظ کر رہی تھی۔ ممی کی زبان سلو کی گدی چاٹ رہی تھی، سرور انگیز لمس بھی سلو کی نیند واپس لانے میں ناکام رہا، وہ روتا رہا، سلو ڈبل روٹی لانے کے لیے بستر سے اٹھا۔ ممی کی آواز نے اس کے باہر نکلتے ہوئے قدم پکڑ لیے۔ اس نے مڑ کر دیکھا، ممی اسی کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بہت سے سوالیہ نشان تیر رہے تھے۔ سلو واپس آیا۔ ممی پھر ڈکرائی۔

''کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہو؟ میں ناشتے کے لیے ڈبل روٹی اور چائے لینے جا رہا ہوں۔'' سلو ممی کی زبان کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ ممی نے زور سے گردن ہلا دی۔ سلو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ گائے نے اسے چاٹنا شروع کر دیا۔

''تو تم نے مجھے اس لیے بلایا تھا۔'' سلو کھلکھلا کر ہنس پڑا مگر دوسرے ہی لمحے استعجاب کا سمندر اس کے چہرے پر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ممی اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی اور اس نے ٹانگوں سے سلو کو اپنے زیر سایہ سرکانا شروع کر دیا تھا جیسے اس پر چھا جانا چاہتی ہو۔ سلو سب کچھ سمجھ گیا۔

''ٹھیک ہے ممی۔'' اس نے نیچے سے پکار کر کہا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں، ناشتے کی ذمے داری پھر سے تم نے سنبھال لی ہے، بے فکر رہو، اب میں ڈبل روٹی چائے لینے نہیں جاؤں گا۔'' جواب میں گائے کی پیار بھری ڈکراہٹ ابھری اور سلو جلدی جلدی ناشتا کرنے لگا۔

بچھڑے کے لاپتا ہونے کے بعد سے سلو نے نوٹ کیا کہ اب ممی میں وہ شگفتگی باقی نہیں رہی تھی۔ اولاد کا صدمہ اسے مرجھا گیا تھا' اس پر اداسی طاری رہتی تھی' بے نام سی ایک افسردگی ہمہ وقت اس پر مسلط رہتی تھی۔

''ابا، تم ممی کو ہنساتے کیوں نہیں؟ تمہیں نظر نہیں آتا کہ اب ممی پہلے جیسی نہیں رہی؟'' سلو نے بیل کی پیٹھ پر نیم دراز ہوکر تادیبی لہجے میں کہا۔ بیل گردن گھما کر اپنی زبان سلو کے گال پر پھیرنے لگا۔

''اگر مجھے تمہاری زبان آتی تو میں تمہیں ہر وقت لطیفے سناتا رہتا اور ممی کو بھی غمگین نہ ہونے دیتا۔''

ممی اپنی اگلی ٹانگیں زمین پر پھیلا کر ان پر منہ رکھے خلا میں گھور رہی تھی۔

''مجھے بھی اپنے بھائی کے گم ہو جانے کا غم ہے۔'' سلو ملول ہو گیا۔ ''لیکن کیا کریں، مجھے دیکھو، میں بھی صبر کر رہا ہوں۔ تم اتنی بڑی ہوکر، ممی ہو کر برداشت نہیں کرسکتیں؟'' ممی کا جمود نہیں ٹوٹا۔

''تم بھی تو ساتھ گئے تھے اس دن۔ تمہارے سامنے وہ کھو گیا اور تم کھڑے دیکھتے رہے؟ کچھ نہ ہو سکا تم سے؟'' سلو پلٹ کر بیل کی کمر پر سوار ہو گیا۔

''تمہارا اتنا بڑا بدن کس کام کا ابا؟ اپنے بیٹے کی حفاظت بھی نہ ہوئی؟'' وہ بیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ بیل نے سر جھکا لیا۔

''ناراض مت ہونا ابا' تم لوگ بھی خفا ہوگئے مجھ سے تو میں کہاں جاؤں گا؟'' سلو بیل سے لپٹ کر معافی کا خواستگار تھا۔ اس کے ابا نے دوبارہ خوش ہوکر اپنی ریگ مال زبان سے سلو کو گھسنا شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

وقت کی تہ در تہ چڑھتی ہوئی پٹیاں زخموں کو مندمل نہیں کرتیں تو ڈھانپ ضرور لیتی ہیں مگر ممی کے زخم پر انگور نہیں آ رہا تھا، بیٹے کی تا ابدی جدائی نے غم واندوہ کے جو جالے اس پر تان دیے تھے، انہیں وقت کے کانٹے بھی کھسوٹنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ ہاں، یہ ضرور ہوا تھا کہ اب ممی کی تمام تر مادرانہ شفقتیں سلو کی ذات پر مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں۔ محبت کا تو ایک گنا چنا کوٹا ہوتا ہے، جتنے امیدوار ہوتے ہیں، اسی حساب سے یہ راشن بٹ جاتا ہے۔ اب ماں تا کی ساری مقدار کا وارث سلو رہ گیا تھا۔ سلو خود بھی جانتا تھا کہ بچھڑے کے غائب ہونے کے بعد سے اس کے لیے ممی کی محبت میں بے اندازہ وارفتگی آ گئی تھی۔ وہ خود بھی اپنے لاڈ پیار کے ذریعے ممی کو خوش رکھنے کی کاوش میں ہمہ تن مصروف ہو گیا تھا۔ سلو کا ابا بھی ممی کا دل لبھانے کے لیے اپنا زیادہ وقت ان کے سنگ گزارتا تھا اور رات گئے اپنے گھر واپس ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ممی کی افسردگی میں کمی نہیں آئی تھی۔ اولاد کے زخم اتنے کاری ہوتے ہیں کہ اس کے عوض ساری کائنات کی محبتیں بھی ہیچ ہوتی ہیں اور یہ کمی کبھی پوری نہیں ہوتی۔

☆......☆......☆

سلو کو آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ خلافِ معمول اب تک نہ ممی لوٹی تھی نہ ابا کا کوئی پتا تھا۔ پہلے تو سلو خوش ہوا کہ ممی کا دل پھر سے زندہ ہو گیا ہے اور وہ زندگی کی دلچسپیوں میں گھر گئی ہے۔ ابھی تک واپس نہ آنے کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ ممی ابھی تک سیر سپاٹے میں مشغول ہے۔

شام ڈھل گئی اور رات بھی دھیرے دھیرے سیاہ ہونے لگی تو سلو کے ذہن میں وسوسے جاگنے لگے۔ اتنا وقت تو ممی کو کبھی نہیں لگا تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا۔

رات کی مسافت آدھی طے ہونے والی تھی لیکن ممی کا کوئی پتا نہ تھا۔ سلو کے دل میں اٹھنے والے خدشے اپنا رنگ گہرا کرتے جا رہے تھے۔ وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ ممی ہر بلا، ہر خطرے سے محفوظ رہے۔ نیند کا تو سوال ہی کیا، سلو کی بھوک بھی اڑ رہی تھی۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا پھر اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور وہ ممی کے لیے دعائیں مانگنے لگتا۔

اس کا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ سلو خود پر بھی قابو پانے کی تمام حدود پھلانگ گیا اور آخر ممی کی تلاش میں باہر نکل آیا۔

سڑکیں سلو کے قدموں تلے سرکی جا رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح ہر سمت دوڑ رہا تھا۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، چھوٹی سڑک شاہراہ، تنگ گلیاں، حبس زدہ کوچے، کوئی گوشہ اس کے قدموں کی دسترس سے دور نہ رہا اور بالآخر اس نے اپنی ممی کو ڈھونڈ لیا۔

ممی ایک بہت چوڑی سڑک پر پڑی کسی سنگ دل اور شقی القلب ٹرک ڈرائیور کی لاپروائی کا ماتم کر رہی تھی، اس کے نوحے میں کوئی صدا نہیں تھی۔

سلّو دیوانہ وار ممی کے بکھرے ہوئے وجود کے پاس پہنچا۔ دو قدم کے فاصلے پر سلو کا ابا پژمردہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں، کشادہ چہرہ قبرستان کی سی ویرانی سے مزین تھا۔

سلّو کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں، وہ دوزانو ممی کے مردہ تن کے آگے جھک گیا۔ ممی کے چاروں طرف سڑک خون میں نہائی ہوئی تھی اور لہو

کی سیاہ پپڑیاں جابجا جمی ہوئی تھیں۔ سلو سکتے کے عالم میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ ممی کی کھلی آنکھیں آسمان کو گھور رہی تھیں۔ سکوت کے لمحے زیادہ طویل نہیں تھے۔ سلو دھاڑیں مار مار کر رو پڑا، وہ آسمان دیکھ دیکھ کر فریادیں کر رہا تھا۔ ممی کے بے روح جسم سے لپٹا پلٹیاں کھا رہا تھا۔

''تم بھی مجھے چھوڑ گئیں ممی؟'' وہ چلایا۔ خاصی دیر تک ہچکیاں بندھی رہیں اور وہ کچھ نہ بول سکا۔ ''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی لیکن تم ممی ہو، میری ممی ہو اسی لیے مجھ سے دور چلی گئیں۔''

وہ دیوانہ وار ممی سے شکایتیں کر رہا تھا۔ اسے پرسہ دینے والا اتنے بڑے شہر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی کل متاع کسی ظالم کی شقاوت کی نذر ہوگئی تھی لیکن اس کی ڈھارس باندھنے کے لیے کسی منہ میں زبان نہ تھی، کندھے پر رکھنے کے لیے کوئی ہاتھ نہ تھا۔

روتے روتے اس کے آنسو خشک ہوگئے۔ سب کے آنسو آخرکار سوکھ جاتے ہیں۔ وہ جانے کے لیے اٹھا' اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی نظر ابا پر پڑی۔ بیل کی آنکھوں میں چیپڑ آگئے تھے۔ پتا نہیں ممی کب مری تھی اور وہ کب سے اشک باری کر رہا تھا۔ سلو نے منہ پھیر لیا اور گھر کی طرف مرے مرے قدم بڑھا دیے۔

دروازے میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ اسے اپنی گردن پر وہی مانوس سانسیں محسوس ہوئیں۔ وہ رکا اور اس نے پلٹ کر دیکھا، بیل اس سے بھڑا ہوا کھڑا تھا۔ سلو کو متوجہ دیکھ کر اس نے دھیمی سی آواز نکالی جیسے کہہ رہا ہو۔ ''کیا ہم دونوں مل جل کر یہ دکھ نہیں بانٹ سکتے؟ ہمارا یہ غم تو مشترکہ ہے۔''

سلو اسے گھورتا رہا پھر اس کے چہرے پر وحشت نے بسیرا کرلیا اور وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

''چلے جاؤ یہاں سے' تم بالکل ویسے ہی ہو جیسا میرا پہلے والا ابا تھا، کمزور، کاہل۔ ابا ایسے نہیں ہوتے' دفع ہو جاؤ۔''

بیل کی آنکھوں میں حیرانی آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر سلو کے ہاتھ چاٹنے چاہے تو سلو نے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ ''جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔ تم میرے ابا نہیں ہو۔ مجھ سے سب کچھ چھن گیا اور تم بت بنے رہے؟ ممی تمہارے سامنے مرگئی اور تم تماشا دیکھتے رہے؟ تم اسے بچا نہیں سکتے تھے؟ بولو' جواب دو۔ میں نے ایسے ابا کسی کے نہیں دیکھے جو اپنی اولاد کے دکھ دور نہ کرسکیں۔ تمہارے ہوتے ہوئے میں لٹ گیا۔ بتاؤ، تمہارا چوڑا چکلا جسم کس کام کا؟ کیا ابا ایسے ہوتے ہیں؟ بولو' بتاؤ؟'' سلو دیوانہ وار بیل پر لاتیں برسا رہا تھا، گھونسے مار رہا تھا۔ اس کے آنسو ممی کی لاش پر اتنی روانی سے نہیں بہے تھے جیسے اب بہہ رہے تھے۔

بیل ہکا بکا کھڑا بدلے ہوئے سلو کو دیکھ رہا تھا۔ ''میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ سب ختم ہوگئے۔ تم ابا تھے مگر ویسے ہی نکلے جیسا پہلا ابا تھا۔ مجھے ایسا بزدل نہیں چاہیے۔ میں لاوارث ہوں، یتیم ہوں، کوئی نہیں ہے میرا۔''

اس نے نفرت سے بیل کو دیکھا اور حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ اب وہ اپنی بے ترتیب سانسیں درست کر رہا تھا، اس کے بعد وہ تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ اس کے پاؤں یتیم خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆☆......☆☆

ترتیب: ارم حمید

نیکی کا راستہ

اللہ اس کو ملتا ہے جو خود کو اُس کی راہ پر چلاتا ہے۔

............*

جنتی لوگ

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میرے سامنے وہ تین اشخاص پیش کیے گئے جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے ایک شہید دوسرا حرام سے بچنے اور شبہات سے پرہیز کرنے والا تیسرا وہ بندہ جو اچھی طرح عبادت کرے اور اپنے مالک کی بھی اچھی طرح خدمت کرے۔

............*

کامیاب شخص

دین اسلام کے مطابق کامیاب شخص وہ ہے جسے اسلام کی دولت ملی اور ضرورت کے حساب سے رزق اور اللہ تعالیٰ کی عنایت پر وہ صابر و شاکر رہا۔

انیلا حمید۔ فرانس

چند حقیقتیں

☆انسان جب اندر سے ٹوٹ جاتا ہے تب باہر سے خاموش ہو جاتا ہے۔

☆ادب کی بات ہوتی ہے ورنہ جو سن سکتا ہے وہ بول بھی سکتا ہے۔

☆انسان تلوار سے تو پھر بھی بچ جاتا ہے مگر طعنے سے مر جاتا ہے۔

☆مشکل وقت اچھا ہوتا ہے اسی میں تو اپنوں اور غیروں کی پہچان ہوتی ہے۔

............*

بچپن

بچپن میں جہاں چاہے ہنس لیتے تھے۔ جہاں چاہے رو لیتے تھے اب ہنسنے کے لیے تمیز اور رونے کے لیے تنہائی چاہیے۔

............*

حاضر جوابی

ایک لڑکا ٹھوکر لگنے سے پاس کھڑے گدھے کے پیروں میں گر گیا۔

پاس سے گزرتی ہوئی چنچل دوشیزہ بولی۔

''بڑے بھائی کے پیر چھو رہے ہو؟''

لڑکا فوراً بولا: ''جی بھابی جی......''

سیما رضا ردا۔ کراچی

چمچے

ایک لیڈر کے اعزاز میں جلسہ ہو رہا تھا۔ چمچے نما مقرر اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

''وہ دائیں بائیں دیکھنے کے قائل نہیں، وہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے بس آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے کیا آپ لوگ جانتے ہیں وہ کون ہے؟''
حاضرین میں بیٹھے ایک شرارتی لڑکے نے بلند آواز کہا۔
''بس ڈرائیور۔''

............*

ذہانت

ایک ساٹھ سالہ ارب پتی پیرس کے مہنگے ترین ریستوران میں اپنی 18 سالہ حسین ترین بیوی کے ساتھ داخل ہوا تو اس کے قریبی دوست نے پوچھا۔
''میں بہت حیران ہوں کہ یہ تم سے شادی پر کیسے رضامند ہوگئی؟''
''میں نے اپنی عمر کے بارے میں اس سے جھوٹ بولا۔'' ارب پتی نے مسکرا کر کہا۔
''کیا تم نے اپنی عمر 40 سال بتائی تھی؟'' دوست نے پوچھا۔
''نہیں میں نے اپنی عمر 90 سال بتائی تھی۔'' ارب پتی نے ہنس کر جواب دیا۔
رضوانہ پرنس۔U.K

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆بات کو پہلے دیر تک سوچو پھر بولو اور پھر اس پر عمل کرو۔
☆ہر نئی چیز بھلی معلوم ہوتی ہے مگر دوستی جتنی پرانی ہو اتنی ہی اچھی اور مضبوط ہوتی ہے۔
☆لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں قابلیت پر نہیں۔
☆علم سے آدمی کی وقعت اور دیوانگی دور ہو جاتی ہے۔
☆تحریر ایک خاموش آواز ہے۔

............*

زہر

جنہیں ہم زہر لگتے ہیں وہ کون سا ہمیں
پیسٹری، کیک، پیزا یا چکن کڑھائی لگتے ہیں

............*

احساس

فاصلے کبھی تعلقات کو ختم نہیں کرتے، نزدیکیاں کبھی تعلقات کو مضبوط نہیں کرتیں۔
صرف ایک دوسرے کا احساس ہی رشتوں اور تعلقات کو مضبوطی اور خوبصورتی عطا کرتا ہے۔
غزالہ رشید۔ کراچی

خولہ عرفان کی ڈائری سے

یہ اطلاع ہے مشورہ بھی
کہ تیری یادوں کی
آہٹیں اور
نشان قدموں کے
دل کی دہلیز پر
ملے ہیں
کہ تو اب بھی
آنکھ کے ساحلوں پر
اداس بیٹھے نظر ہیں آئے
بارشوں میں باہر نکلنا
کسی کو جا کے
یوں تنگ کرنا
نہیں مناسب
پتا نہیں کوئی کیسی
الجھنوں میں
مبتلا ہو
مکان کچا ہو

یا چھت ٹپکتی ہو
یا بجلیاں سی
کوئی سر پر
ہوں گرجتی
پناہ سے
وہ دے سکے گا
نہ
سرگوشیوں کو
تیری یادوں کی
سن سکے گا
تم بھیگے موسموں میں
اپنی یادوں کو اپنے دل میں
دبا کے رکھو
نہ بھیگ جائیں
تم اپنے خوابوں کو روک لو
کہ بارشوں میں
باہر نہ جائیں
کوئی بیچارہ نہیں بیچارہ
تمہارے خوابوں کے ڈوب جانے
تمہاری یادوں کی آہٹوں کے روٹھ جانے
کا خوف کھائے
بھری سی بارش میں
میں اپنی
آنکھوں کو
اپنے دل کو
بھیگنے سے بچا رہا ہوں

............*

اگر کوئی یاد نہیں کرتا

اگر کوئی یاد نہیں کرتا تو......
تھوڑے سے پیسے ادھار لے لو پھر دیکھو

............*

جارج برنارڈ شا کہتے ہیں

دنیا میں صرف دو فیصد لوگ سوچتے ہیں، تین فیصد یہ سوچتے ہیں کہ وہ سوچتے ہیں اور پچانوے فیصد سوچنے سے بہتر مرنے کو سمجھتے ہیں

............*

دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ

دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بے وقوف اور جنونی ہمیشہ اپنے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے ہیں اور عقلمند ہمیشہ مخمصے کا شکار رہتے ہیں۔

مہرین رشید۔ کراچی

فیض احمد فیض کہتے ہیں

چلتے ہیں دبے پاؤں کوئی جاگ نہ جائے
غلامی کے اسیروں کی یہی خاص ادا ہے
ہوتی نہیں جو قوم حق بات پہ یک جا
اس قوم کا حاکم ہی بس اُن کی سزا ہے

............*

بس ایک عیب

ایک شخص نے اپنے بڑے سے پوچھا۔
"حضرت مجھے اپنے عیب کا مکمل علم کس طرح ہو سکتا ہے؟"
بزرگ نے فرمایا:
"اپنی بیوی کو اس کا ایک عیب بتا دو وہ تمہیں تمہارے عیب بمع تمہارے خاندان کے تمام افراد کے عیب بتا دے گی۔

............*

ہماری پولیس

پولیس والا: پارک میں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟"
آدمی: "جناب ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔"
پولیس والا: "تو گھر میں بیٹھو۔"

آدمی: ''اس کا شوہر اور میری بیوی برا مناتے ہیں جناب......''

راحیلہ۔ لاہور

بیوی

انسان کے جسم میں ہزاروں نسیں ہوتی ہیں اور صرف بیوی ہی جانتی ہے کہ کب کون سی دبانی ہے۔

سلمٰی۔ بحرین

محبت

خدا سے ہو تو بندگی بن جاتی ہے
ماں باپ سے ہو تو عبادت بن جاتی ہے
استاد سے ہو تو روشنی بن جاتی ہے
دوست سے ہو تو راحت بن جاتی ہے
بے وفا سے ہو تو عذاب بن جاتی ہے
دولت سے ہو تو مرض بن جاتی ہے

............*

خوش قسمت

''تم خوش قسمت ہو کہ میں تم سے مل رہا ہوں۔ صبح سے 4 بیمہ ایجنٹ آ چکے ہیں مگر میں کسی سے نہیں ملا۔'' بڑے بزنس مین نے نوجوان بیمہ ایجنٹ سے کہا۔

''سر آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' نوجوان بیمہ ایجنٹ نے جواب دیا۔

''چاروں مرتبہ میں ہی حلیہ بدل بدل کر آپ سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

............*

نقاب

شادی سے پہلے ہر لڑکی ہی شہزادی ہے
ہر کسی کے سامنے ساس صدقے واری ہے
گھونگھٹ بیٹے نے ابھی اٹھایا ہی نہیں
ماں جی نے بہانے سے چائے پہلے بنوائی ہے
دو پل بھی چین سے بیٹھنے نہ دے
لگ جا کام پر ماں جی نے کھیر پہلے پکوائی ہے
عزیزوں کے سامنے محبت کا ناٹک کرے
نکلتے ہی ان کے جھاڑو پہلے لگوائی ہے
تنکا تنکا جو لائی ہے بہو ساتھ اپنے
مکاری سے نندوں نے لوٹ پہلے مچائی ہے
نظروں سے گرانے کو ڈھنڈے ٹسوے بہائے
ہر جھوٹی بات پر تہمت پہلے لگائی ہے
پرانی ریت ہے یہ تو زمانے کی انیلا
ہر داستان میں بہو ہی زندہ پہلے جلائی ہے

انیلا احمید۔ پیرس

طلسماتی آنکھیں

اس اماوس کی رات
جب اس کی چمکتی، دمکتی آنکھیں
میرے چہرے پر مرکوز ہوئیں
تو اس پل میں نے
عالم جذب میں
چراغوں کی لو گل کر دی
کہ ان شرار جگنوؤں کی
تیز طلسماتی روشنی میں
کسی اور
چراغ کی
ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

فصیحہ آصف خان۔ ملتان

غزل

آج پھر دن بھر تیرا انتظار ہوگا
پانی کے موتیوں میں غم شمار ہوگا
دھنک رنگ ٹوٹ جائیں گے
محبت سے جب نفرتوں کا اظہار ہوگا
ٹوٹ کر محبت برسے گی قسم سے
جب کبھی اک سجدہ اختیار ہوگا

ہر سو بکھرے ظالم منظر پر سنو
چپ رہو جو بولا سنگسار ہوگا
میرا محور ذات بڑا کامل ہے نگین
سن لے گا گر غزلیات میں بھی اظہار ہوگا۔
نگین افضل وڑائچ۔شادیوال۔گجرات

احسان کردو

مجھے مجھ میں رہنے دو
بھلے کچھ نہ سنو
مگر خدارا مجھے چپ تو رہنے دو
میری ذات کچھ تو میری کردو
مجھ پر آخری یہ احسان کردو
ان دیکھی کڑیوں سے رہائی دے دو
یا پھر تم جرأت دہائی دے دو
سنو!
مجھ پر سے پہرے ہٹادو
یا پھر میری سوچ کر تم کڑیاں پہنا دو
مجھے اپنا لو یا زندگی سے نکال دو
اتنے احسان جو کیے ہیں
تو اک آخری احسان کردو
میری ذات کچھ تو میری کردو
دیکھو!
تم بااختیار ہو
کچھ تو کہو
کچھ تو میرے حق میں کرو
مجھے جینے جو نہیں دیتے ہو تو
کم سے کم مٹی کے حوالے ہی کردو
عائشہ نور عاشا۔شادیوال۔گجرات

اینگری کلچر

ہمارے ہاں وہ کلچر، جس پر سب ایگری کرتے ہیں۔ ایگری کلچر ہی ہے اس کے علاوہ سب اینگری کلچر ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کالج اس لیے بنائے گئے ہیں کہ طلبہ کو جہالت کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑے، ایسے ہی اینگری کلچر کی نمائش کے لیے فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

ہمارے ہاں فلموں میں ہیرو سے لے کر اس کا گھوڑا تک غصے میں ہوتا ہے۔ ہر کردار کو غصہ ہی آتا ہے۔ یہاں تک کہ فلم دیکھنے کے بعد بندے کو بھی یہی آتا ہے۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی تصنیف ''قلاہ بازیاں'' سے اقتباس
مرسلہ: محمد افضل خان۔کراچی

عورت

عورت کی وفا اس کے خلوص میں، حیا اس کی نگاہوں میں، ادا اس کے بھول پن میں، حسن اس کی سادگی میں اور عظمت اس کے کردار میں ہے۔
عورت کا غصہ اس کی زبان میں، قابلیت اس کی سیرت میں، چاہت اس کے انداز میں، صبر اس کی خاموشی میں اور معراج اس کی ممتا میں ہے۔
مرسلہ: ریما شیر افضل۔کراچی

دعویٰ

ایک کنیز آدھی رات کو کھڑی دعا کررہی تھی۔
''اے اللہ! اس محبت کے صدقے جو تجھ کو مجھ سے ہے۔ میری دعا قبول کرلے اور میرے گناہ معاف کردے۔''
مالک کی آنکھ کھل گئی۔ کہنے لگا۔ ''تو کیسے یہ دعویٰ کررہا ہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔''
اس نے کہا۔ ''اگر اللہ مجھ سے محبت نہ کرتا تو مجھے رات کو نماز پڑھنے کی توفیق نہ دیتا اور میں بھی تیری طرح سو رہی ہوتی۔''

مرسلہ: صائمہ۔کراچی

☆☆......☆☆

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

جیل کی ہوا

سنا ہے ماڈل ایان علی کو بھارتی فلموں میں

کام کرنے کی پیش کش ہوئی ہے۔ ذرائع کا دعویٰ ہے کہ ماڈل اس حوالے سے فلم کی دیگر کاسٹ کے حوالے سے معلومات حاصل کررہی ہیں۔ اگر انہیں رول پسند آیا تو وہ ضرور فلم میں کام کریں گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ شوبز ہی اُن کی زندگی ہے۔ مگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جیل کے بارے میں کیا خیال ہے۔

یار ماضی

زوہیب حسن بہت جلد ایک نئے گانے' سلسلے'

کے ساتھ کم بیک کرنے جارہے ہیں۔ زوہیب حسن بہت جلد اپنا نیا البم ریلیز کرنے والے ہیں اور اسی لیے انہوں نے اپنے مداحوں کے لیے اُس کی ایک جھلک بھی پیش کردی ہے جو بہت متاثر کن ہے۔ نازیہ اور زوہیب نے 80ء کی دہائی میں جو شہرت حاصل کی تھی وہ یقیناً لازوال ہے۔

پوت کے پاؤں

علی ظفر کے چھوٹے بھائی دانیال ظفر نے ماڈلنگ کے بعد سرو تال کی دنیا میں جلوہ گر ہونے کا

فیصلہ کرلیا ہے۔ کوک اسٹوڈیو سیزن 10 کے لیے دانیال کو سائن بھی کرلیا گیا ہے اور وہ بطور سنگر اپنی پہلی سولو البم کی تیاری میں بہت مصروف ہیں۔ ہماری نیک خواہشات دانیال کے ساتھ ہیں کیونکہ پوت کے پاؤں تو پالنے میں ہی نظر آرہے ہیں۔

کامیابیاں

میڈرڈ فلم فیسٹیول میں پاکستانی فلم 'ساون' نے بہترین غیر ملکی فلم کا ایوارڈ جیت لیا ہے۔ فلم معذور بلوچ بچے کے گرد گھومتی ہے جو بالآخر اپنی مشکلات پر قابو پالیتا ہے۔ ساون کو امریکی نژاد

پاکستانی فلم میکر فرحان عالم نے ڈائریکٹ کیا ہے۔ اس سے پہلے فرحان نے پاکستانی ہٹ فلم 'بن روئے' ڈائریکٹ کی تھی۔ ساون پولیو سے متاثر بچے کی سچی کہانی ہے اور اس فلم کو اسکردو میں شوٹ کیا گیا ہے۔

مس گائیڈڈ میراجی

اداکارہ میرا شاعری کی کتاب کو انگریزی گرامر کی کتاب سمجھ بیٹھیں اور سوشل میڈیا پر اپنی تصویر جس میں انہوں نے کتاب تھام رکھی ہے۔ ٹوئٹ کیا کہ میرے دوست اس کتاب کو پڑھ کر اپنی گرامر درست کریں۔ کتاب 'ڈیموکریسی از دا بیسٹ ریونج' کے مصنف اے کے رشید نے میرا سے درخواست کی ہے کہ میری کتاب شاعری کی

ہے۔ س کا انگریزی گرامر سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا

کتاب پڑھنے والوں کو مس گائیڈ نہ کریں۔

عمران فوبیا

اس ماہ کی سب سے بڑی اور چٹ پٹی خبر یہ ہے کہ طاقت ور بھی قانون کی گرفت میں آئے...... کس قدر غرور اور رعونت تھی لہجوں میں جب یہ کہا جاتا تھا کہ ہم حکمران خاندان......
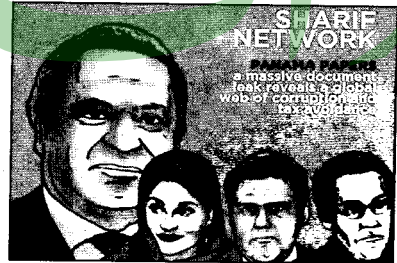
غریب ملک کے ایسے شاہانہ حکمران اللہ اللہ...... جو شخص بھی پاکستان کی عزت اور حرمت کا سودا کرنے کا سوچے اس کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ جو مجبور عوام کا پیسہ چرا کر سوئس اور اماراتی بینکوں میں رکھے وہ کوئی بھی ہو اُس کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے۔ ابتدا ہوگئی ہے امید ہے اب سب اچھا ہی ہوگا۔ کرپشن زدہ حکمرانوں کا اصل چہرہ دکھا کر تو عمران خان نے وہ کام کیا جو شاید ہی کوئی کرسکتا۔ شاید اس لیے چوروں کو عمران فوبیا ہوگیا ہے اور وہ صرف ان کے خلاف بولتے نظر آتے ہیں۔ اللہ نے عمران خان کو ہمیشہ لوگوں میں ممتاز رکھا وہ ہمیشہ خبروں میں رہے اب چاہے وجہ کرکٹ ہو یا اُن کی غیر ملکی بیگم یا علیحدگیاں یا پھر سیاست کچھ بھی ہو پاکستانی انہیں بہت پسند کرتے ہیں۔

حرامانی

مانی کی بیگم حرا نے شادی ہوتے ہی مانی کو پیچھے دھکیل دیا اور خود آگے نکل گئیں۔ ان کے ڈرامے اور فین لسٹ روز بروز طویل ہو رہے

ہیں۔ تقریباً سب ہی پروڈیوسر انہیں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ وجہ شاید اچھی ایکٹنگ یا اچھی پی آر شپ ہے اب اِس کا فیصلہ تو ڈرامہ دیکھنے والے ہی کرسکتے ہیں۔

☆☆......☆☆

کچن کارنر

افشاں چوہدری

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

قیمہ بھرا پراٹھا

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
ثابت گرم مسالہ	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	دس عدد
لہسن	آٹھ یا دس عدد
ادرک	تھوڑی سی ثابت
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب: قیمہ، ثابت گرم مسالہ، نمک، ثابت لال مرچ، لہسن اور ادرک ڈال کر اُبال لیں اور پیس کر ایک طرف رکھ دیں۔

پراٹھے کے لیے:

سفید آٹا	آدھا کلو
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل یا گھی	حسبِ ضرورت
نیم گرم پانی	حسبِ ضرورت

ترکیب: آٹے میں نمک اور تیل ڈال کر مکس کریں اور اسے گوندھ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ مناسب سائز کے پیڑے بنالیں۔ اس کے بعد پراٹھا بیلیں اور توے پر گھی لگا کر پراٹھا فرائی کرلیں اور اچھی طرح سینک لیں۔ دہی کے ساتھ گرم گرم سرو کریں اور سحری کا لطف دوبالا کریں۔

آپ چاہیں تو دو روٹیاں بیل کر درمیان میں فلنگ رُکھ کر بھی یہ پراٹھا بنا سکتی ہیں۔

چکن پکوڑے

اجزاء

چکن (بغیر ہڈی کا)	آدھا کلو
بریڈ کرمز	حسبِ ضرورت
پیاز	ایک عدد (لچھوں میں کاٹ لیں)
انڈے	دو عدد
کُٹی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
دہی	آدھا کپ
گھی یا تیل	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب: گوشت میں نمک، کالی مرچ اور کُٹی لال مرچ کو دہی میں ڈال کر مکس کریں۔ آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ انڈے پھینٹ لیں۔ کڑاہی میں تیل یا گھی گرم کریں۔ گوشت کے ٹکڑوں میں سے ایک ایک کو پہلے انڈے میں پھر بریڈ کرمز میں لپیٹ کر تل لیں۔ گولڈن ہوجائیں تو ایک ڈش میں نکال لیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

کھجور رولز

اجزاء

کھجوریں	دو سو گرام (باریک کاٹ لیں)
سادہ کیک	ڈیڑھ سو گرام (خوب مسلا ہوا)
کشمش	پچاس گرام
تل	سو گرام
دار چینی	آدھا چائے کا چمچ (پسی ہوئی)
کوکو پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گھی	حسب ضرورت
بٹر پیپر	ایک عدد
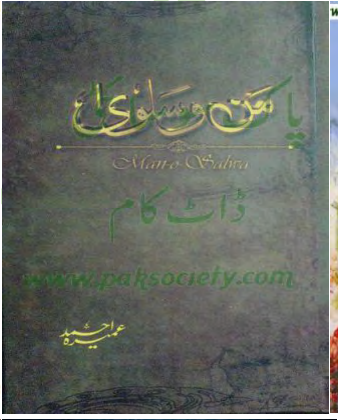
ترکیب: کھجوریں، سادہ کیک، کشمش، سادہ بسکٹ، دار چینی، کوکو پاؤڈر، گھی کو ملا کر آٹے جیسا گوندھ لیں۔ اس کو پھر ایک رول جیسا بنا لیں۔ ایک ٹرے میں تل پھیلا کر رول کو ان پر گھمائیں تاکہ تل اس کے ہر طرف لگ جائیں۔ اس کے بعد کھجور رول کو بٹر پیپر میں لپیٹ کر فریزر میں رکھ دیں۔ جب یہ رول ٹھنڈا ہو کر سخت ہو جائے تو بٹر پیپر سے نکال کر اس کے آدھا آدھا انچ کے ٹکڑے کر لیں اور افطار کے وقت پیش کریں۔

مینگو میٹ اسٹکس

اجزاء

انڈر کٹ بیف یا چکن	تین سو یا چار سو گرام (پتلے لمبے پسندے)
آم کی چٹنی	1/3 کپ (کیری کو نمک ملا کر پیس لیں)
سویا ساس	ایک چائے کا چمچ
لہسن	دو جوے (چوپڈ)
پیاز	ایک بڑی (چوکور بڑے ٹکڑے)
چلی ساس	ایک کھانے کا چمچ
تازہ لال یا ہری مرچ	دو عدد (باریک کاٹ لیں)
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چھوٹا چمچ
ادرک	آدھا انچ کا ٹکڑا (چوپڈ)
زردے کا رنگ	چٹکی بھر
گاجر	گارنش کے لیے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: گوشت اور پیاز کے پارچے لکڑی کی اسٹک پر پروئیں۔ ایک گوشت کا ٹکڑا ایک پیاز کا ٹکڑا لگائیں۔ آم کی چٹنی میں لہسن، ادرک، سویا ساس، زردے کا رنگ، لال مرچ اور تھوڑا نمک ملائیں اور باربی کیو ڈش میں اسٹکس رکھیں یا پھر نان اسٹک فرائی پین میں تھوڑا تیل ڈال کر رکھیں۔ سائیڈ پلٹتے رہیں۔ برش سے آم کی چٹنی لگاتے جائیں۔ پک جائیں تو ایک ڈش میں نکال کر کوئلے کا دھواں دے دیں۔ گاجر سے گارنش کریں اور اُبلے چاول کے ساتھ پیش کریں۔

انجیر کا میٹھا

اجزاء

خشک انجیر	ایک پاؤ
کھجور	ایک پاؤ
خشک دودھ	آدھا کپ
بادام، پستے	حسبِ ضرورت (باریک کاٹ لیں)
چینی	ایک کھانے کا چمچ
زیتون کا تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب: انجیر کو دھو کر صاف پانی میں تین سے چار گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ اس کے بعد اسی پانی میں دس منٹ تک اُبال کر ٹھنڈا کر لیں۔ اب تھوڑے سے پانی سے انجیر کی پیوری بنا لیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ اس کے بعد کھجور کے بیج نکال کر باریک کاٹ لیں۔ اب پیوری میں خشک دودھ اور چوپڈ کھجور ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ چینی بھی ملا لیں۔ اب تھوڑا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سا زیتون کا تیل گرم کریں۔ پھر اس میں انجیر والا آمیزہ ڈال کر بھونیں۔ جب تیل الگ ہو جائے تو اس میں پستے بادام شامل کر دیں۔ اب ایک تھال میں نکال کر چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔

کھیر کھجور

اجزاء

کھجور	ایک کلو
کھویا	آدھا کلو
بادام، پستہ	پون کپ (ہر ایک)
دودھ	ایک لیٹر
کیوڑہ	چند قطرے

ترکیب: کھجوروں کی گٹھلیاں نکال کر انہیں دھو کر خشک کر لیں۔ ایک پین میں دودھ اُبال لیں پھر اس میں کھجوریں ڈال کر پکنے کو رکھ دیں۔ آنچ دھیمی رکھیں۔ جب کھجوریں گل جائیں تو اس میں کھویا ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ کھیر گاڑھی ہو جائے تو چمچ چلا کر اُسے آنچ پر سے ہٹا لیں۔ سرونگ ڈش میں ڈال کر پستہ، بادام، کیوڑے سے گارنش کریں۔ (میوہ جات باریک کتر کر ڈالیں تو زیادہ لذت دیتے ہیں۔)

شیر خرما

اجزاء

دودھ	دو لیٹر
کھویا	3/4 کپ (چورا کر لیں)
گھی	ایک پاؤ
شکر	آدھا کلو
بادام	ایک پاؤ
پستہ	آدھا کپ
سبز الائچی	پانچ یا چھ عدد
کھوپرا (باریک کترا ہوا)	آدھا کپ

ترکیب: ایک پین میں دودھ ڈال کر اُس میں کھویا مکس کر کے چولہے پر رکھ دیں اور ڈھکن ڈھانپ کر پکنے دیں۔ جب دودھ اور کھویا مکس ہو کر اُبلنے لگیں تو اس میں سوئیاں اور چینی ڈال کر کچھ دیر مزید اُبالیں پھر اس میں تمام میوے ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر چند منٹ پکائیں تاکہ آمیزہ کچھ گاڑھا ہو جائے۔ ایک دوسرے پین میں گھی گرم کر کے الائچی کے بیج کڑکڑائیں پھر اس گھی کو مع الائچی کے شیر خرما میں ڈال دیں۔ اگر چاہیں تو خوشبو کے لیے چند قطرے عرق گلاب یا کیوڑہ ڈال کر ڈش میں نکال لیں۔

خوشبودار قورمہ

اجزاء

گوشت	آدھا کلو
زعفران	ایک چھوٹا چمچ
گرم مسالہ	ایک بڑا چمچ
لہسن	چھ جوے
پیاز	آدھا کلو
ہلدی	پون چمچ
بادام کی گریاں	سات عدد
دہی	دو کلو
ادرک	دس گرام
نمک	حسبِ ضرورت
سرخ مرچ	حسبِ ضرورت

ترکیب: لہسن، پیاز اور ادرک چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ گوشت کی حسب منشا بوٹیاں بنا کر دھو لیں اور ایک برتن میں ڈال کر ساتھ ہی لہسن، ادرک، پیاز، ہلدی، خشک دھنیا، نمک، سرخ مرچ اور دو کپ پانی ڈال دیں۔ اس برتن کو چولہے پر رکھ دیں اور ہلکی آنچ پر دس منٹ تک پکانے کے بعد زعفران تھوڑے سے پانی میں گھول کر اور بادام کی گریاں چھلکا اُتار کر ڈال دیں۔ دس منٹ تک مزید چولہے پر رکھیں پھر پسا ہوا گرم مسالہ چھڑکیں اور دم لگا کر چولہے سے نیچے اتار لیں۔ خوشبودار قورمہ تیار ہے۔